سلسلۂ مطبوعات ندوۃ المصنفین

(۵۱)

قرآن اور تعمیر سیرت

تالیف

جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب

ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی (لندن) بیرسٹر ایٹ لا

صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

رفیق اعزازی

ندوۃ المصنفین دہلی

ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

قیمت غیر مجلد پندرہ روپے

قیمت مجلد اٹھارہ روپے

طبع چہارم

شوال ۱۳۹۸ھ (مطابق) ستمبر ۱۹۷۸ء

مطبوعہ یونین پرنٹنگ پریس دہلی

انتساب

مرشدی حضرت محمد حسین صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کے نام جن کے فیضانِ توجہ اور برکاتِ تربیت سے اس خدمت کے لائق ہوا۔

عمرِ حریص در طلبِ کیمیا گزشت
مارا قبولِ اہلِ نظر کیمیا بس است

میر ولی الدین

مصنّف کی دُوسری کتابیں

۱۔ قرآن اور تصوّف

۲۔ فلسفہ کیا ہے؟

۳۔ رموزِ اقبال

۴۔ مراقبات

۵۔ قنوطیت یا فلسفۂ یاس

۶۔ ابطالِ مادیت

۷۔ رسالۂ اخلاقیات

تراجم

۸۔ رہنمائے قرآن

۹۔ تاریخ فلاسفۂ اسلام

۱۰۔ تاریخ مسائلِ فلسفہ

۱۱۔ مقدمہ فلسفۂ حاضرہ

۱۲۔ فلسفہ کی پہلی کتاب

۱۳۔ مقدمہ مابعد الطبیعات

فہرست مضامین

تمہید	صفحہ ۹
عبادت و استعانت	″ ۱۳
توحیدِ الوہیت	″ ۴۲
صالحیت	″ ۱۰۹
نیکی علم ہے	″ ۱۲۲
تعلیم کا مقصد	″ ۱۳۰
انسانِ کامل	″ ۱۴۰
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب	″ ۱۴۵
تصحیحِ فکر	″ ۱۵۳
احساس	″ ۱۵۹
قانونِ تجاذب اور تعمیرِ سیرت	″ ۱۶۷
قرآن اور سیرت سازی	″ ۱۷۴
قوتِ ایمانی اور ظہورِ غیب	″ ۱۹۷
ماحول پر قابو کس طرح حاصل کیا جائے	″ ۲۱۲
کامیاب زندگی کا قرآنی تصور	″ ۲۲۸
قرآن اور علاجِ خوف	″ ۲۵۳
بے خوف زندگی	″ ۲۶۵
داروے جان	″ ۲۷۵
قرآن اور علاجِ حزن	″ ۲۸۳
زندگی میں غم کیوں ہے	″ ۲۹۴
قرآن اور علاجِ غضب	″ ۳۰۳
دعا کا فلسفہ	″ ۳۱۴
دعاء اور دفعِ بلا	″ ۳۲۳
اسرارِ حج	″ ۳۳۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس کتاب کے بعض مقالات ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء میں "ادارۂ اشاعتِ اسلامیات" حیدرآباد دکن کے زیرِ اہتمام "قرآن اور سیرت سازی" کے عنوان سے شائع ہوئے تھے، پھر رفتہ رفتہ ان میں اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ اب ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء میں یہ ایک مکمل اور ضخیم کتاب کی صورت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ گویا یوں کہنا چاہیے کہ "قرآن اور تعمیرِ سیرت" ۱۳۶۲ھ کی "قرآن اور سیرت سازی" سے اب ایک علیحدہ جدید تالیف کی صورت میں سامنے آرہی ہے۔

۱۳۶۷ھ کے انقلاب سے ملک میں جو حالات رونما ہیں اُن کی موجودگی میں اردو کی کسی ضخیم علمی اور مذہبی کتاب کا شائع کرنا آسان نہیں رہا ہے، پوری فضا مایوسیوں اور تاریکیوں میں گھری ہوئی ہے، اُردو کو خود اس کے بولنے والے اور اس کی آغوشِ شفقت میں تربیت پانے والے دیس نکالا دینے پر تلے ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد دکن جس کے چپے چپے سے کبھی دل آویز اُردو تالیفات کے چشمے اُبلا کرتے تھے آج ایک ویرانے میں تبدیل ہو کر رہ گیا ہے اور اس کے ادبی اور علمی مرکز یا تو انقلاب کی موجوں میں لپٹ کر فنا ہو گئے ہیں اور یا ان میں خاک اُڑ رہی ہے۔

لیکن سخت جان "ندوۃ المصنفین" جس کا وجود کسی حکومت یا ریاست کے اقتدار و سطوت سے وابستہ نہیں تھا تباہی و بربادی کی تمام منزلوں سے گزرنے پر بھی اس لائق ہے کہ اس کی نگرانی میں یہ روحانیت میں ڈوبی ہوئی پُرافادہ کتاب شائع کی جا رہی ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

"قرآن اور سیرت سازی" کے تعارف کے سلسلہ میں مولوی محمد اسحاق صاحب بی ایس سی ڈپ ایڈ (عثمانیہ) نے "ادارۂ اشاعت اسلامیات" کے معتمد کی حیثیت سے جو دیباچہ لکھا تھا، ماضی کے مٹے ہوئے نقوش کی یاد تازہ رکھنے کے لیے اس جگہ اسی دیباچہ کا ضروری حصہ نقل کیا جاتا ہے:۔

"ڈاکٹر صاحب علماء ہند میں کسی تعارف کے محتاج نہیں، صاحب موصوف مذہب اور دینداری

کے زندہ پیکر ہیں اور ان کے فیضِ صحبت سے بیسیوں طالب علم صبغۃ اللہ میں رنگے جا رہے ہیں، رات دن کے اس مشغلہ سے ان کو انسانی کردار کی تعمیر کا ایسا ملکہ حاصل ہو گیا ہے کہ وہ اس کی نفسیاتی کمزوریوں اور امراض کی تشخیص کر کے قرآن کے ذریعہ ان کے بہترین علاج تجویز فرماتے ہیں، مزید برآں اپنے مقالات میں جابجا احادیث اور صوفیائے محققین کے اقوالِ نظم و نثر سے بکثرت استشہاد فرماتے ہیں۔ اور باوجودیکہ ڈاکٹر صاحب ایم اے۔ پی ایچ ڈی (لندن)، بار ایٹ لا اور جامعۂ عثمانیہ میں مغربی فلسفہ کے صدرِ شعبہ وغیرہ سب کچھ ہیں لیکن مقالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تصوفِ قرآنی کے کسی رمز شناس عارف کے قلم سے یہ سطور نکلی ہیں۔

بہر حال یہ کتاب فلسفہ، تصوف اور ادب کا ایک خوشگوار امتزاج ہے۔"

میں اس تعارف میں اتنا ہی اضافہ کر سکتا ہوں کہ فاضل دیباچہ نگار نے محترم ڈاکٹر صاحب سے جن خصوصیتوں کو منسوب کیا ہے، میرے ذاتی مشاہدے میں بھی یہ تمام خصوصیات میر ولی الدین کے پیکر میں اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہیں، موصوف اس دور کے اول درجے کے روحانی فلسفی اور متکلم ہیں، اور ملتِ گم گشتہ کی نبض پر ایک ماہرِ فن طبیب کی حیثیت سے ہاتھ رکھنا جانتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب کہ مسلمان عام طور پر احساسِ کمتری، بے یقینی اور تذبذب کی ظلمتوں میں پھنسے ہوئے ہیں، یہ گراں قدر تالیف ان کے روحانی رشتے کو مضبوط و مستحکم کرنے میں "چراغِ راہ" کا کام دیگی۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

ناظم ندوۃ المصنفین دہلی

یکم ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ

تمہید

پیشِ نظر کتاب بظاہر ایک کثرت ہے اور یہ کثرت مختلف موضوعوں کے اظہار خیالات پر مشتمل ہے مختلف اوقات میں مختلف تصورات کو واحد نصب العین کے زیر اثر پیش کیا گیا تھا اور اب انہیں یکجا حاضر کر دیا گیا ہے۔ لیکن نصب العین کی عینیت ہی وہ وحدت ہے جو اس کثرت میں متجلی ہے اور انہیں ایک شیرازہ میں باندھ رکھا ہے۔ اس نصب العین کو یہاں مختصراً پیش کرنا مقصود ہے، عہد حاضر کے نوجوانوں کا خیال ہے کہ دین معاملہ ہے ان چند ناکامیاب، افسردہ دل، آشفتہ دماغ ضعیفوں کا جن کے ہاتھ سے دنیا نکل چکی ہے، جن میں متاعِ دنیوی سے محظوظ ہونے کی نہ قابلیت باقی رہی ہے اور نہ خواہش، یہ مسرت و شادمانی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ چکے ہیں اور حزن و غم کے آغوش میں ان کے دن گزر رہے ہیں۔ دنیا میں کامیابی، کامرانی، مسرت و راحت کا حاصل کرنا دنیوی اصول کے عاقلانہ استعمال ہی سے ممکن ہے۔ دینی اصول کو ان میں کیا دخل ہے۔ شاید قبر کے اس طرف ان کا کام پڑتا ہو تو ہو!

پیشِ نظر اوراق میں اس مغالطہ کو اس کی تمام تفصیلات میں رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اصولاً بتلایا گیا ہے کہ کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے سیرت کی تعمیر ضروری ہے اور جب تک سیرت کی تعمیر قرآنی اصول پر نہ ہو دنیا میں کامیابی و کامرانی کے ساتھ چین اور طمانیت کا جمع ہونا ممکن نہیں! کامیابی محض مال یابی کا نام نہیں، بلکہ مراد ہے طمانیتِ روح اور بردِ قلبی کا جو محض مالیاب کو کسی طرح حاصل نہیں ہوتی۔ واضح کیا گیا ہے کہ دنیوی عقلِ معاش (عقل

میں روشنی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ حرص و ہویٰ سے آزاد ہو کر علمِ وحی کے تابع ہو جاتی ہے۔ اور حقیقت میں عاقل و بالغ وہی ہے جو ہویٰ و ہوس سے آزاد ہے۔

خلق اطفال اند جز مستِ خدا نیست بالغ جز رہیدہ از ہویٰ (رومی)

کامیابی و کامرانی، مسرت و طمانیت اس مردِ حُر کا انعام ہے جس نے اپنی عقل کو محمدؐ مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل پر قربان کر کے اپنی ذات میں تقویٰ کے اوصاف پیدا کر لیے ہیں۔ اور حق تعالیٰ کو جمہاتِ دینی و دنیوی میں کافی تصور کر لیا ہے۔ الیس اللہ بکافٍ عبدہٗ۔

عقل قرباں کن بہ پیشِ مصطفٰے حسبی اللہ گو کہ اللہ ام کفٰے

زیں خرد جاہل ہمی باید شدن دست در دیوانگی باید زدن

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد ایں عسس را دید و در خانہ نہ شد (رومی)

صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین نے اسی طریقہ سے تسخیرِ جہات میں کامیابی حاصل کی تھی، ان کے شکوہ و جلال سے سلاطین کانپ اُٹھے تھے، انہوں نے حریت و آزادی کا تسلط دنیا میں قائم کر دیا اور جبر و استبداد کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اسی اسوہ پر ایک بار پھر زندگی کو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ اور ان اوراق کا مقصد عہدِ حاضر کے نوجوانوں کو اس کی طرف دعوت دینا، اور اس کی تفصیلات کو ان پر واضح کرنا ہے۔

خود مؤلف کو اس اسوہ کی طرف کچھ سال قبل ایک عارفِ تام المعرفت[1] نے بلایا اور اپنی زبان فیض ترجمان سے اس کی تفصیلات کو سمجھایا اور سات سال کے دوران میں مختلف اوقات میں ہر جزی کی کلّی وضاحت فرماتے رہے۔ مغربی و مشرقی فلسفہ کے گہرے مطالعہ سے جس دماغ نے تربیت پائی تھی، اور جس کی عقل کو بقول اقبالؔ "تنقید سے فرصت

---

[1] میرا اشارہ ہے مولائی و آقائی حضرت محمد حسین صاحب قبلہ کی طرف جو ۲۲۔ ربیع الاول ۱۳۶۳ھ اپنے فراق میں محزوں چھوڑ کر رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے فروح و ریحان و جنت نعیم۔

بھی" اور جو بالآخر عقل کی گتھیوں کو سلجھانے سے عاجز آگیا تھا اس "صاحب جنون" نے اپنے ایک نکتہ سے کہ عقل تابع وحی ہو کر ہی اپنے بتوں سے نجات پا سکتی ہے، لات و منات کی بندگی سے آزاد ہو سکتی ہے۔ اس کو "دل نیاز مند و نگاہِ پاک باز" کا شیدا کر دیا جو حصولِ معرفت کا واحد طریقہ ہے۔ اس نکتہ کے قلب میں اترنے کے بعد وہی ہوا جس کی اقبال نے خبر دی تھی۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اس روحانی انقلاب کے بعد جہان جیسا نظر آنے لگا اس کو ان صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔ اولاً اصول موضوعہ کو پیش کیا گیا ہے، ان کو اپنی ہمت اور اختیار کے استعمال سے عمل میں لانے کی تاکید کی گئی ہے، پھر انہی اصول کو مختلف مسائل کے حل کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ سیرت سازی کے لیے خوف و حزن و غضب کے دفعیہ کے لیے، کامیاب زندگی کے لیے، طمانیت و بردِ قلبی کے حصول کے لیے ان نسخوں میں سے اکثر کو "معارف" کے صفحات میں پیش کیا گیا، اور اہلِ ملک نے ان کو پسند بھی فرمایا ہے۔ یہاں یہ سب یکجا حاضر ہیں، یہ اس دل کی سوغات ہیں جو عقل کا غلام نہیں!

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہے وہ دل نہ کر قبول! (اقبال)

مگر زبان عقل کی ہے، تصورات و تعقلات سب عقلی ہی ہوتے ہیں اور انہی میں مفہوماتِ روحانی کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا مقصود مفہوم ہے نہ کہ زبان جو محض ذریعہ ہے۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ!

۲۷ مارچ ۱۹۴۵ء

میر ولی الدین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عبادت واِستعانت

اے دردِ دلِ من اصل تمنا ہمہ تو   وے درسرِ من مایۂ سودا ہمہ تو
ہرچند بہ روزگار درمی نگرم   امروز ہمہ توی و فردا ہمہ تو   (ابو سعید ؒ)

انسان بلکہ تمام حیوانات کی زندگی کا پہلا قانون جلبِ منفعت و دفعِ مضرت ہے، تحفظِ ذات اور تولیدِ نسل دونوں کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ ان چیزوں کو طلب کرے جو اس کی زندگی کے حفظ و بقا میں ممد و معاون ہیں، اور ان چیزوں سے گریز کرے جو اس کو عدم کی طرف لیجاتی ہیں، یا قوتِ حیات کی تحدید کا باعث ہوتی ہیں۔ اشیاء کی ابتدائی تقسیم اسی نقطۂ نظر سے کیجاتی ہے، اشیاء یا تو نافع ہیں یا ضار، مفید ہیں یا نقصان رساں، اچھی ہیں یا بُری! عضویت پر جب ان کے اثرات کا ترتب ہوتا ہے تو لذت، محبت، فریفتگی یا اطاعت پیدا ہوتی ہے، یا الم، نفرت، خوف اور توحش۔ ان میں سے ایک بالطبع محبوب ہے، مرغوب ہے، تو دوسری فطرۃً غیر محبوب و نامرغوب، ایک کے حصول کا وہ کوشاں ہوتا ہے تو دوسرے سے گریزاں انسان کی زندگی کا تار و پود یہی جذبات ہیں، ان کا زور مردافگن ہوتا ہے۔ ان کے شر و شور سے اس کو فرصت ملتی ہے اور نہ نجات، یہاں تک کہ زندگی کے مقررہ دن ختم ہوجاتے ہیں، اور وہ یہ کہتا ہوا رخصت ہوتا ہے:

من بلغِ جہاں راقفسے دیدم و بس   مرغش زہوا و ہوسے دیدم و بس
از صبحِ وجود تا شباں گاہِ عدم   چوں چشم کشودم نفسے دیدم و بس   (سحابی استرآبادی)

اپنی زندگی کے مختصر قیام میں ہر شخص اشیاء کی تغیر و حدوث کا اچھا مشاہدہ کرتا ہے، کائنات میں ایک دائمی تغیر جاری ہے، کوئی شے ساکن نظر نہیں آتی، سکون و ثبات فریبِ نظر معلوم ہوتے ہیں۔ ہر ذرہ کائنات میں ایک تڑپ سی نظر آتی ہے، کاروانِ وجود کو کہیں قیام نہیں، شانِ وجود ہر لحظہ تازہ ہوتی ہے، قہری تجلی ہر شے کو ہر لحظہ فنا کر رہی ہے اور جمالی تجلی ہر لحظہ وجود بخش رہی ہے۔

ہستی کہ عیاں نیست دواں در حالی در شان دگر جلوہ کند ہر آنے
این نکتہ بجو زکُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡن گر بایدت از کلام حق برہانے جامی

اشیاء کے اس تغیر و تبدل، تکوّن و حدوث، فنا پذیری و زوال کی جہت جب چشم بصیرت رکھنے والے انسان پر نمایاں ہو جاتی ہے تو اپنے اپنے فقر و احتیاج کی وجہ سے ذل و افتقار یا بندگی کی نسبت جو ان سے قائم کر رکھی تھی، وہ یکدم کٹ جاتی ہے، ذواتِ خلق[1] کا فقر اس کی نظروں میں واضح ہو جاتا ہے، اور اس کو اس ذات کی تلاش ہوتی ہے، جو حدوث و تغیر سے منزہ ہے، جو قائم بالذات ہے ...... ، جو واجب و قدیم ہے، صفاتِ کمالیہ سے موصوف ہے، فعّال ہے، سارے جہان کی مالک و حاکم و مولیٰ و رب ہے۔

اب مذہب یا دین کا ماحصل بھی اتنا ہی ہے، کہ ذل و افتقار کی نسبت (جس کو دین کی زبان میں عبادت و استعانت سے تعبیر کیا جاتا ہے) ذواتِ خلق سے قائم نہ کی جائے اور احتیاجات اور مرادات میں استعانت ذواتِ خلق سے نہ کی جائے، بلکہ عبادت و استعانت کا مرکز ذات اللہ رہے، یہی مفہوم ہے اس دعوتی کلمہ طیبہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ" کا کہ اللہ کے سوا کوئی ذات قابلِ عبادت و مستحقِ استعانت (الٰہ) نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اس پیام کو ساری دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔

فقر و احتیاج انسان کی فطرت میں شامل ہے، اسی فقر یا احتیاج کو رفع کرنے کے لیے وہ ہر نفع و ضرر پہنچانے والی چیز کو اپنا "الٰہ" قرار دیتا ہے، خواہ یہ چیز عناصر سے ہو یا جمادات سے

[1] یعنی مخلوق

نباتات سے ہو یا حیوانات سے، فوق الفطرت ہو یا فوق البشر، ان سے رفعِ احتیاج کے لیے اعانت طلب کرتا ہے، اور استعانت کے لیے ان سے ذل و افتقار کی نسبت قائم کرتا ہے، اپنے جہل اور نادانی کی وجہ سے ان کو مستقل طور پر نافع اور ضار خیال کرتا ہے، اور یہی خیال اس کو اپنے سے کمتر مخلوق کے آگے سجدہ ریز ہونے پر مجبور کرتا ہے۔

حواس کے اس التباس اور عقل کے اس دھوکے کو دور کرنے کے لیے دینِ حق کا پیام محمد عربی (فداہ ابی و امی) نے عالم کو سنایا کہ انسان اشرف المخلوقات ہو کر، فطرت کا شہکار ہو کر اپنے سے ادنیٰ اور کمتر مخلوق کے آگے ذلیل نہیں ہو سکتا۔ اس کی گردن اگر جھک سکتی ہے تو اسی ایک ہمہ خبیر، ہمہ داں وہمہ بیں و ہمہ تواں ہستی کے آگے جس کے دست قدرت میں ساری کائنات کی باگ ہے، جو جملہ صفاتِ کمالیہ سے متصف ہے، اور تمام عیوب سے منزہ اور مبرا ہے! یہی ہستی ہماری الٰہ ہے، یہی قابلِ عبادت ہے، یہی مستحق استعانت ہے، یہی ہماری خالق ہے، مالک ہے، ہماری رب ہے، مولیٰ ہے، حاکم ہے، اسی کے ہم مخلوق ہیں، مملوک ہیں، مربوب ہیں، عبد ہیں، محکوم ہیں، اسی کی ہم عبادت کرتے ہیں، اور اسی سے تمام حاجات و مرادات میں بھیک مانگتے ہیں، یہی ذات غنی ہے اور ہم سب اسی کے فقیر ہیں، اس کے فقیر ہو کر ہم سارے عالم سے غنی ہیں:

یہ پیام صدقِ محض ہے، ہماری عزتِ نفس کے عین مطابق ہے، حق و خلق کے رابطہ کا سچا اظہار ہے! اس کو مان کر انسان حقیقی معنی میں انسان بنتا ہے، بے خوف، بے جگر مجاہد جس کی امید و بیم کا مرکز وہی ایک اللہ ہوتا ہے، جو سارے عالم کا مالک اور حاکم ہے اب مجاہد کی زندگی کی ہر جنبش اسی مالک و حاکم کے حکم کے تحت ہو جاتی ہے، اور اس کے احکام کی تعمیل میں، امر کے امتثال میں وہ ایک جان دیتا ہے، تو ہزار جان پاتا ہے۔ اس کا ضعف قوت سے، اس کی ذلت عزت سے، اس کا فقر غنا سے بدل جاتا ہے۔ موجوداتِ عالم میں سے وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ[1] کا حکم اس کو سارے عالم سے

[1] اگر تم مومن ہو تو ان سے خوف نہ کرو مجھ سے خوف کرو۔

بے خوف کر دیتا ہے، نہ وہ کسی سے اُمید و رجا رکھتا ہے، اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ[1] اس کو ساری کائنات سے غنی کر دیتا ہے، ذواتِ خلق سے اُمید و بیم کی نسبت کٹتے ہی وہ نفسِ مطمئنہ حاصل کر لیتا ہے، اور اپنے رب سے راضی ہو جاتا ہے، اللہ کو راضی رکھ کر وہ غیراللہ سے مستغنی ہو جاتا ہے، اب وہ غنی عن الشئی ہے، کونسی چیز اللہ سے برتر ہو سکتی ہے، جس کے حصول کی وہ خواہش کرے، اب سب کچھ اسے حاصل ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ[2] علوئے تمکین اسی کو حاصل ہے، وہی مخاطب ہے اس قول کا: اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰہُ مَعَکُمْ[3]!

دیکھو "الٰہ" کے فہم نے اس کو کیا سے کیا کر دیا، یا تو وہ ایک حقیر اور ذلیل جانور کی طرح ہر ایک سے ڈرتا اور لرزتا تھا، ہر ایک کو نافع و ضار قرار دیتا تھا، سرِ عبودیت خم کرتا تھا، مدد و اعانت کا خواہاں تھا، ان ہی کی عبادت و عبودیت میں زندگی گزار رہا تھا، مشوش، پریشان، حیران، خود ضعیف اور مطلوب بھی ضعیف "ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ" یا اب علمِ رسالت کے جاننے اور ماننے کے ساتھ ہی لا کی شمشیر ہاتھ میں لے کر وہ آگے بڑھتا ہے اور اپنے جاہل ساتھیوں سے قرآن کے الفاظ میں پوچھتا ہے:

اَفَغَیْرَ اللّٰہِ تَاْمُرُوْٓنِّیْٓ اَعْبُدُ اَیُّھَا الْجٰھِلُوْنَ[4]؟

تا چند گہ از چوب گہ از سنگ تراشی بگزر ز خدائے کہ بصد رنگ تراشی

غیراللہ کی عبادت و عبودیت کا جُوا وہ گردن سے نکال کر پھینک دیتا ہے، عمر میں پہلی مرتبہ حُریت محسوس کرتا ہے، خوف کا بھاری پتھر اس کے سینے سے اُٹھ جاتا ہے، اپنے حقیقی مولیٰ کے آگے جھک جاتا ہے، اور ان کو رحیم پاتا ہے، کَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا کی بشارت

---

[1] کیا اللہ بندے کے لیے کافی نہیں۔

[2] تاکہ تم غم نہ کھاؤ اس پر جو ہاتھ نہ آیا، اور نہ شیخی کرو اس پر جو تم کو اس نے دیا ہے۔

[3] تم ہی بلند ہو، اللہ تمہارے ساتھ ہے

[4] اے جاہلو کیا تم مجھے غیراللہ کی عبادت کرنے کا امر کرتے ہو۔

اس کو ہر طرح مطمئن کردیتی ہے، اب اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ اس کے ساتھ ایمان کے بعد شانِ رحمت ہی سے پیش آئینگے، ان کے علاوہ رحیم ہونے کے حاکم و حکیم ہونا، اس کے دل کو اور قوی کردیتا ہے، وہ انہیں اپنے ہر امر میں متصرف سمجھتا ہے اور ان کے ہر فعل کو سراسر حکمت سے مملو دیکھتا ہے، ان ہی کے حکم کے مطابق ان کو اپنے کاموں میں وکیل بناتا ہے فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ان کا فرمان ہے كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيلًا کہ کروہ آزادی و اطمینان کے ساتھ مصروفِ عمل ہو جاتا ہے، اب کہاں یہ اور کہاں وہ جاہل جو غیر اللہ سے ذل و افتقار کی نسبت جوڑ رہا ہے۔ سچ ہے:

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّورُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ
وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ[1] (الفاطر ۱۵)

دین کا اجمال، عبادت و استعانت، اس کا ماحصل، تحفظ توحید۔ اب اس اجمال کی کسی قدر تفصیل ضروری ہے۔

عبادت غایتِ تذلل کا نام ہے جس کا اظہار معبودِ حقیقی کے آگے کیا جاتا ہے۔ اس کے معروف طریقے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ہیں، نماز کے تمام اعمال و ارکان پر غور کرو۔ عبادت یا اظہارِ ذلت کا مفہوم بخوبی تمہارے دل نشین ہوگا، عابد نماز کا قصد کر رہا ہے، مصلے کی طرف بڑھ رہا ہے، زبان پر ہے۔ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّیْ سَيَهْدِيْنِ[2]۔ دل غیر حق سے پاک ہے، حق تعالیٰ کے سوا کسی کو بزرگی کا مستحق نہیں سمجھتا، اور اسی فہم کے ساتھ تکبیر تحریمہ "اللہ اکبر" کہتا ہے اور جب حق تعالیٰ کے روبرو ہو کر کہتا ہے اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ دل پوری طرح متوجہ بحق ہے، ورنہ جانتا ہے کہ جھوٹ کی سزا کیا ہے يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ[3]۔ اب نیت میں بھی خلوص ہے، حق تعالیٰ

---

[1] برابر نہیں اندھا اور دیکھتا اور نہ اندھیرا اور اُجالا اور نہ سایہ اور لو، اور برابر نہیں جیتے اور نہ مردے
[2] میں اپنے رب کی طرف چلا ہوں وہ میری ہدایت کریگا۔
[3] دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور وہی ان کو دغا دیگا۔

ہی کے لیے نماز پڑھ رہا ہے، عاشقانہ ایمان کے پیدا ہونے کے لیے پڑھ رہا ہے، عادت کے تحت نہیں، انہی کے حول وقوت سے پڑھ رہا ہے، ثنا میں حق تعالیٰ کی عظمت وجلالت وجبروت کا اظہار کر رہا ہے، اور توحید کا اقرار لَآ اِلٰہَ غَیْرُکَ سے ہو رہا ہے، اب حضوری میں دست بستہ نظر نیچی کیے ذلت ومسکنت کی تصویر بنا کھڑا ہے، زبان پر جاری ہے الحمد للہ اور دل میں سمجھ رہا ہے کہ عالم میں کوئی ذات مستحق حمد نہیں، سارے محامد ومحاسن کی وہی ایک ذات لاشریک لہ سزاوار ہے، جب رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہتا ہے تو جانتا ہے کہ ذات ما سواہ، ربوبیت اسی کو زیبا ہے، عالم تمام اُس کا مربوب ہے۔ الرحمٰن الرحیم کہتے وقت عالم رجا میں داخل ہوتا ہے، رحمت وکرم کی اُمید دل میں پیدا ہوتی ہے، جانتا ہے کہ رحمانیت کا تعلق تو ساری کائنات سے ہے، رحیمیت خصوصی شے ہے، اور مومنین سے مختص گان بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا، مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کہتے وقت عالم خوف کا مشاہدہ کرتا ہے، روز قیامت حق ہے، اور یہ وہ دن ہے کہ اس کی شان میں فرمایا گیا یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا[1] اس اُمید وبیم کی حالت میں عرض کرتا ہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ حق تعالیٰ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں، ذل وافتقار کا رشتہ آپ ہی سے جوڑتے ہیں، وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ آپ ہی سے استعانت کرتے ہیں، جانتے ہیں کہ لَا فَاعِلَ فِی الوجود الا اللہ ما سوی اللہ سے بالکلیہ اعراض کر کے آپ ہی کی طرف بالکلیہ رجوع ہوتے ہیں، ہم آپ کے سوا استعانت کی جہت سے غیر کو کیوں پکاریں جب کہ ہمیں یہ سُنا دیا گیا ہے اور ہم نے بھی تجربہ سے اس کی توثیق کر لی ہے کہ آپ کے سوا کسی میں حول وقوت نہیں لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ اس لیے کہ وہ نہ ہمیں نفع پہنچا سکتے ہیں، نہ ضرر، اس مدح وثنا واقرار عبودیت کے بعد التماس ودعا اھدنا الصراط المستقیم حق تعالیٰ راہ مستقیم کی ہدایت فرمائیے، نفس وہویٰ سے چھوٹیں، آپ کا قرب نصیب ہو، صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔ اہل ایمان کی راہ پر چلنا نصیب ہو جو انبیاء و

[1] جس دن نہ کر سکے کوئی نفس کسی نفس کا کچھ۔

اولیاء کی راہ ہے، یہی اہلِ انعام ہیں والذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشھداء
والصالحین۔ مغضوبین وضالین کی راہ نہیں جنہوں نے غیر اللہ سے عبادت و استعانت کا
رشتہ قائم کرکے ہمیشہ کے خسارہ میں اپنے کو مبتلا کرلیا۔ اولئک ھم الخاسرون الذین خسروا
انفسھم!

اس حمد و ثنا، التماس و دعاء کے ساتھ وہ کلامِ ربانی کی چند اور آیتیں احکامِ خداوندی
کے معلوم کرنے، تکرار سے ان کو اپنے ذہن میں جمانے، ہر حرف کی تلاوت پر دس نیکیاں کمانے
اور حق تعالیٰ سے سرگوشی کرنے کے لیے پڑھتا ہے، اور پھر فوراً پیشی میں جھک جاتا ہے، گویا اپنے
رحمان و رحیم آقا کے پیٹ میں مونڈی دے دیتا ہے، اس طرح اپنی ذلت کا مزید اظہار کرتا
ہے، اسی حالت میں اس کی زبان سے اس کے مولیٰ کی تقدیس و تنزیہ و تحمید جاری ہوتی ہے
اپنی بے مائگی، فقر و ذلت کا احساس قلب میں واضح طور پر موجود ہوتا ہے، جب سر اٹھاتا
ہے تو حق تعالیٰ اسی کی زبان سے فرماتے ہیں سمع اللہ لمن حمدہٗ اس طرح اس کا مرتبہ
بلند کرتے ہیں۔ جو سر معبودِ حقیقی کے آگے جھکتا ہے، وہ مخلوق کے آگے جھک نہیں سکتا، وہ
سب سے بلند ہوتا ہے، ممتاز ہوتا ہے، بے نیاز ہوتا ہے، وہ ایک لاقیمت جوہر ہوتا ہے،
سچ ہے۔ من رکن الی المولیٰ ومال الیہ احرقہ اللہ بنورہ حتی یصیرہ جوھرا لاقیمۃ لہ[1] (حدیث)
اس سرفرازی کے شکریہ میں وہ حق تعالیٰ کی حمد کرتا ہے، اور پیروں پر گر جاتا ہے، پیر پکڑ لیتا ہے
اور اس طرح غایت تذلل کا اظہار کرتا ہے، زبان پر آقا کی عظمت و رفعت و علو کا اقرار جاری
ہوتا ہے! اس اظہارِ تذلل میں وہ اپنی آنکھ کی ٹھنڈک پاتا ہے وجعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ[2]
یہ آنکھ کی ٹھنڈک اس کو اپنے محبوب مولیٰ کے مشاہدہ سے ہو رہی ہے، یہی اس کا کمال ہے،
یہی اس کی معراج ہے۔ الصلوٰۃ معراج المومنین۔

---

[1] جو اپنے مولیٰ کی طرف جھکتا ہے، اور اس کی طرف مائل ہوتا ہے تو وہ اس کو اپنے نور سے جلا دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ لاقیمت جوہر ہو جاتا ہے۔

[2] میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔ (نسائی باب عشرۃ النساء)

معبود کا نہ صرف خیر محض ہونا ضروری ہے، بلکہ اس کا ہمہ تواں یا قادرِ مطلق ہونا بھی لازمی ہے، یہ اپنی لامحدود قوت اور لامتناہی طاقت کی وجہ سے ہماری حفاظت کرتا ہے، ہماری حاجتوں کو پورا کرتا ہے، مرادوں کو برلاتا ہے، اس کے اعتصام کے بعد ہی اس کی نصرت و اعانت کا قطعی یقین ہو جاتا ہے، شر کے مسئلہ کی توجیہ سے عاجز ہو کر نتائجیہ[1] (Pragmatists) نے خدا کے ہمہ تواں ہونے کا انکار کر دیا، لیکن جو خدا قادرِ مطلق نہ ہو، وہ معبودِ حقیقی کب قرار دیا جا سکتا ہے، جو خود شر پر غالب نہ ہو ہماری مدد کیسے کر سکتا ہے، ہمارا مولیٰ اور نصیر کیسے ہو سکتا ہے۔ شر کی توجیہ کا یہ موقع نہیں، لیکن ہم اپنے معبود کو فعالِ مطلق، ہمہ تواں مانتے ہیں، افعال و آثار کا مرجع اسی کو قرار دیتے ہیں، حول و قوت کا اسی کو مبدء سمجھتے ہیں، اسی لیے اس سے استعانت چاہتے ہیں، اور اس کے "نعم المولی و نعم النصیر" ہونے کا یقین رکھتے ہیں۔ اعتصموا باللہ ھو مولٰکم نعم المولیٰ و نعم النصیر[2]!

جب قوت صرف اسی کو حاصل ہے لا قوۃ الا باللہ حرکت کا بھی وہی مبدء ہے لا حول ولا قوۃ الا باللہ تو فعل جو حرکت و قوت ہی کا نتیجہ ہے، صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے ثابت ہوتا ہے اور ذاتِ خلق سے اس کی بالکلیہ نفی ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کے سمجھتے ہی اس کی بصر و بصیرت سے غفلت کا پردہ اٹھ جاتا ہے، اور وہ لا تتحرک ذرۃ الا باذن اللہ[3] کے معنی سمجھ جاتا ہے، غیر اللہ سے استعانت کی نسبت کاٹ کر اسلم عبدی واستسلم کا مصداق بن جاتا ہے!

اپنے رب سے استعانت کے طریقے کیا ہیں؟ بصیرتِ محمدیہ نے جن طریقوں کی تعلیم فرمائی ہے، ان میں سے بعض یہ ہیں۔

اپنی حاجتوں اور مرادوں میں حق تعالیٰ سے دعا کرو۔ دعا کا حکم ہے، اور اجابت کا وعدہ

---

[1] زمانہ جدید کے فلسفیوں کا ایک گروہ جن میں ولیم جیمس، ایچ جی ولس، برنارڈ شا وغیرہ داخل ہیں۔
[2] تمہیں اپنے مولیٰ کا اعتصام چاہیے؛ وہی تمہارا اچھا مولیٰ ہے، اور اچھا مددگار۔
[3] کوئی ذرہ بغیر اللہ کے حکم کے حرکت نہیں کرتا۔

ادعونی استجب لکم حق تعالیٰ جود محض ہیں، عطا محض ہیں، ان میں بخل کا شائبہ نہیں، مایوسی و محرومی ان کی درگاہ سے نہیں، تسلّی کے لیے فرما رہے ہیں۔ لا تایئسوا من روح اللہ[1]۔ وہ حکیم بھی ہیں، ان کا ہر فعل حکمت رکھتا ہے، وہ ہمارے خیر کو ہم سے بہتر جانتے ہیں، اگر وہ ہماری کسی دعا کو قبول نہیں فرما رہے ہیں تو اسے نہ قبول فرمانے ہی میں ہمارا فائدہ ہے، اسی لیے کہا گیا ہے منعہٗ عَطَائُہٗ، مرد کا کمال اس میں ہے کہ ان کے منع کو عطا جانے، کسی عاشق نے اسی جذبہ کے تحت کہا ہے:

اگر مرادِ تو اے دوست نامرادیِ ماست　　　مرادِ خویش دگر بار من نخواہم خواست

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ فرمایا کرتے تھے لا ابالی علی ای حال اصبح علی ما اکرہ او علی ما احب لانی لا ادری الخیر فیھما[2]۔ حق تعالیٰ خود ہمیں تعلیم فرما رہے ہیں، اور ایک نہایت دقیق نکتہ کی تعلیم فرما رہے ہیں:۔

عَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّھُوَ شَرٌّ لَّکُمْ وَاللہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ[3] (البقرہ - ۱۰)

اسی نکتہ کو سمجھ کر عارف کہنے لگتا ہے "ہمہ آں باد کہ او خواہد آں مباد کہ ما خواہیم" اور خواجہ شبلی نے عارف کی تعریف ہی اس طرح کر دی کہ "عارف اوست کہ منع نزد او دوست تر از عطا باشد" یہیں سے رضا کا مقام شروع ہو جاتا ہے، جو استعانت کا بلند ترین طریقہ ہے۔

بہر حال اگر حق سبحانہ تعالیٰ کسی حکمت و مصلحت سے بندۂ مومن کی دعا قبول نہیں فرماتے تو اس کے قلب کی حفاظت فرما دیتے ہیں، مطلوب کی جانب سے خیال پلٹ دیتے ہیں

---

[1] اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔　[2] مجھے اس امر کی پروا نہیں کہ میں کس حال میں صبح کرونگا، ایسی حالت میں جس کو میں پسند نہیں کرتا، یا ایسی حالت میں جس کو میں پسند کرتا ہوں، کیونکہ میں نہیں جانتا کہ میرے لیے بھلائی کس حالت میں ہے۔

[3] شاید کہ بری لگے تم کو ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمہارے حق میں، اور شاید تم کو بھلی لگے ایک چیز اور وہ بری ہو تمہارے حق میں، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

حکایت شکایت، جزع فزع کی طرف مائل نہیں کرتے، رضا کے مقام میں پہنچا دیتے ہیں، اور وہ کلّ اجلٍ کتاب کہہ کر حق تعالیٰ سے راضی ہو جاتا ہے، اجابتِ دعا کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ مطلوب تو حاصل نہیں ہوتا لیکن حق تعالیٰ اس کی دعا کو رد نہیں فرماتے بلکہ اس کی کسی بلا کو دور کر دیتے ہیں، گو اس کو بدل کا علم نہیں ہوتا، ایک آخری صورت یہ بھی ہے کہ دعا اگر وہ دنیا میں نہیں پاتا تو آخرت کے لیے یہ ذخیرہ کیا جاتا ہے

اِنّ العبدَ یریٰ فی صحائفہ یومَ	قیامت کے دن بندہ اپنے اعمال نامہ پر وہ نیکیاں
القیامۃ حسنات لا یعرفہا فیقال	دیکھیگا، جن کو وہ نہیں پہچانیگا۔ اس سے کہا جائیگا کہ یہ
انہا بدل سوالك فی الدنیا	اس سوال کا بدل ہیں جو تونے دنیا میں کیا تھا۔
لم یقدر قضائہ فیہا (حدیث)	لیکن تیرے مقدر میں دنیا میں ان کا ملنا نہ تھا۔

بہر صورت اجابتِ دعا کا وعدہ سچا ہے، لیکن یہ وعدہ مطلق ہے، مقید نہیں کہ اسی وقت اور اسی صورت میں پورا کر دیا جائے، جس وقت اور جس صورت میں کہ بندے نے دعا مانگی ہے، فافہم۔ اگر آپ اس نکتہ کو سمجھ جائیں تو پھر آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ کیوں رسولِ عربیؐ نے اس کی تعلیم فرمائی تھی۔

اللّٰہم اکفنی کل مہم من حیث شئتَ وکیف شئت وانّی شئت ومن این شئت

استعانت کا دوسرا طریقہ اپنے کاموں میں حق تعالیٰ پر توکل کرنا ہے، اگر ہمیں اس بات کا یقین ہو، محض علم نہیں، یعنی تحقیق ہو، محض تعقل نہیں، یا جدید نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ اگر یہ بات ہمارے تحت شعوری نفس میں اتر گئی ہو، کہ فاعلِ حقیقی حق تعالیٰ ہیں، کرنے والے خود بدولت ہیں، افعال و آثار کا مرجع خود ہیں، حول و قوۃ کا مبدا خود ہیں، اور پھر اس کا بھی تیقن ہو کہ ایمان کے بعد وہ رحیم بھی ہیں۔ کان بالمومنین رحیما۔ ولی ہیں، واللّٰہ ولی المومنین۔ تو ہم اپنے تمام امور ان کو تفویض کرنے میں خوشی سے آمادہ ہو جائیں گے، اور اس تفویض کے ساتھ ہی فکر سے آزاد ہو جائینگے، طمانیت و مسرت سے ہمارے

قلوب بھر جائینگے، اور کسی مستِ محبت کے الفاظ میں کہہ اُٹھینگے۔

وکلتُ الی المحبوب امری کُلّہ ‏ ‏ ‏ ‏ فان شاء احیانی وان شاء اتلفا[۱]

توکل اپنی حول وقوۃ سے بری ہونا ہے، اعتصام باللہ ہے۔ ذوالنون نے توکل کی تعریف اسی طرح کی ہے: التوکل ترک تدبیر النفس والانخلاع من الحول والقوۃ[۲]، اور سری سقطیؒ نے بھی ان کے ساتھ اتفاق کیا ہے التوکل الانخلاع عن الحول والقوۃ، ان تعریفوں کا ماخذ حدیثِ نبوی: لاحول ولا قوۃ الا باللہ اور قول عزوجل لاقوۃ الا باللہ توکل قلبی عمل ہے، یعنی قلب میں یقین جاگزیں ہو کہ مجھ میں اور کسی شے میں نہ اثر ہے نہ قوت ہے، نہ حرکت ہے، مجھ میں اور ہر شے میں اثر و قوت و حرکت حق تعالیٰ ہی پیدا کرتے ہیں، وہ جس طرح میرے خالق ہیں میرے افعال کے بھی خالق ہیں، خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ۔ میرے اقتضاءِ فطرت کے عین مطابق افعال کی تخلیق فرمارہے ہیں، میرا اقتضاء میرا اختیار ہے، لیکن فعل کی تخلیق حق تعالیٰ کی جانب سے ہو رہی ہے۔ اس لیے اسبابِ قطعیہ کے استعمال واختیار کا مجھے حکم ہے، حکم کے تحت میں ان کو استعمال کر رہا ہوں جانتا ہوں کہ اگر مجھے اولاد کی خواہش ہو تو جماع کو ترک نہیں کرسکتا، بھوک کی تشفی کے لیے نوالہ کا اُٹھانا اور اس کا چبانا اور حلق سے نیچے اُتارنا قطعی ضروری ہے، توکل یہاں ترکِ عمل و تعطل کا نام نہیں، علم وحالت کا نام ہے، قلبی کیفیت کا نام ہے، اس یقین کا نام ہے کہ ہاتھ میں قدرت، حرکت، فعل سب حق تعالیٰ ہی کے حکم سے پیدا ہوئے ہیں، ان کی مشیت اور ارادے سے پیدا ہوئے ہیں، وہ چاہیں تو نوالہ مُنہ تک نہ پہنچے، ہاتھ شل ہو جائے، کھانا بھی چھن جائے، نظر ان کے فعل پر ہے، فضل پر ہے۔ اپنے زور بازو پر نہیں، کسب پر نہیں، دست بکار دل بیار! توکل ترکِ اسباب نہیں ترک رویت اسباب ہے[۳]

---

[۱] میں نے اپنا کام اپنے محبوب کے حوالہ کیا، خواہ اب وہ مجھے زندہ رکھے یا مار ڈالے۔
[۲] توکل اپنے نفس کی تدبیر کو چھوڑنا اور اپنی حول وقوت سے نکل آنا ہے۔ [۳] حضرت شاہ میر قبلہؒ

مبادیات کو سمجھ جانے کے بعد رزق کے مسئلہ پر ذرا غور کرو۔ رزق کا ذمہ حق تعالیٰ نے لیا ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا[1] صرف ذمہ داری پر اکتفا نہیں کیا، قسم بھی کھائی ہے، صرف قسم پر اکتفا نہیں کیا، مثال بھی بیان کی ہے۔ وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ، فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ[2] (پارہ ۲۶ رکوع ۱۷) حق تعالیٰ ان لوگوں کو بھی رزق دیتے ہیں، جو غفلت و معصیت میں مبتلا ہیں، فسق و فجور میں چور ہیں، پھر جو ان کی اطاعت و رعایت کرتے ہوں، وہ کیسے محروم ہو سکتے ہیں۔ دیکھو جو درخت بوتا ہے وہی سینچتا بھی ہے! خلقت کو وہی مدد دیتا ہے، جو ان کا خالق ہے، مخلوق کے لیے یہ بات کافی ہے کہ ان کا خالق ان کو کافی ہے اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ۔ ایجاد ان سے ہے، دوامِ امداد بھی ان ہی سے ہے، تخلیق ان سے ہوئی، رزق کا دینا بھی ان کے ذمہ ہے، اس کی مثال انسان اپنے نفس میں پاتا ہے، یہ جب کسی کو گھر پر دعوت دیتا ہے تو ان کے لیے غذا کا بھی انتظام کرتا ہے، حق تعالیٰ نے جب ہمیں اپنی مشیت ارادے سے پیدا کیا ہے تو رزق کی ذمہ داری بھی انہی پر ہے، ان ہی کے خوانِ کرم سے ہمیں برگ و نوا حاصل ہے۔ حق تعالیٰ ہمارے مولیٰ ہیں، آقا ہیں، ہم ان کے عبد ہیں، غلام ہیں، اب آقا پر غلام کا تعقد ضروری ہے جس طرح کہ غلام پر آقا کی اطاعت واجب ہے، اگر ہم ان کے ہو رہیں، ان کے سوا کسی کی عبادت کریں نہ کسی سے حاجت و مراد بر آری چاہیں تو کیا یہ ممکن ہے وہ اپنا حق ادا نہ کریں[3]؟ اس کی بشارت اس آیۂ کریمہ میں دے رہے ہیں:۔

مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّ	جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ اس کے لیے راستہ
يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ	نکالتے ہیں اور ایسی جگہ سے رزق فراہم کرتے ہیں جہاں

[1] اور زمین پر کوئی ایسا چوپایہ نہیں جس کے رزق کا ذمہ اللہ پر نہیں۔ [2] اور آسمان میں ہے روزی تمہاری اور جو تم سے وعدہ کیا گیا، سو قسم ہے آسمان و زمین کے رب کی کہ یہ بات تحقیقی ہے جیسے کہ تم بولتے ہو۔
[3] یہ بتالیس ابو العطا اسکندری کی ہیں۔

وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ۔ کسی کا شان وگمان بھی نہیں ہوتا، جو اللہ پر توکل کرتا ہے اللہ اس کے لیے کافی ہے۔

رزق کا وعدہ قطعی، صرف ہمیں اپنا حقِ عبادت وعبودیت ادا کرنا ہے، پھر ناممکن ہے کہ وہ ہمیں اپنے گھر بلائیں اور پھر ہمیں اپنے احسانات سے محروم رکھیں، وجود بخشی کریں اور پھر مدد نہ کریں، ہست کریں اور اپنے کرم سے محروم رکھیں، اپنا حق (عبادت) ہم سے طلب کریں اور ہمارا (حق) رزق ہمیں نہ دیں! وہ کریم ہیں ان سے معاملہ کر کے ان کی خدمت ادا کر کے کون خسارہ میں رہتا ہے

من ذا الذی سألک فحرمتہ ولجأ الیک فاھملتہ او تقرب الیک فابعدتہ اوھرب الیک فطردتہ؟[1] (از اسبوع حضرت غوث اعظمؒ)

اسی خیال کے تحت کسی عاشق نے کہا ہے۔ "گمان توانیست کہ از رزق چارہ نیست امارزق راز تو چارہ نیست" ؎

بہ خیالِ روزی چہ باید دوید   تو بنشیں کہ روزی خود آید پدید

ایک دوسرے عاشق نے اسی خیال کو یوں ادا کیا ہے:

ہیں توکل کن ملرزاں پا و دست   رزقِ تو بر تو ز تو عاشق ترست

بہرحال اتباعِ نبوت اسی میں ہے کہ رزق کی طلب میں کوشش کریں لیکن اجملوا فی الطلب[2] کو پیش نظر رکھ کر اور یاد رکھیں کہ ہماری طلب رزق کے حصول کا مستقل سبب یا قطعی علت نہیں، شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ شارح فتوح الغیب نے مسئلہ کو اجمالاً خوب ادا کیا ہے "بعد از طلب می یابی آنانہ بطلب می یابی" یہی مفہوم اس شعر میں ادا ہوا ہے:-

بجستجوئے نیابد کسے مراد دلی   کسے مراد بیابد کہ جستجو دارد

---

[1] وہ کون ہے جس نے تجھ سے سوال کیا، اور تو نے اس کو محروم رکھا، یا تجھ سے ملتجی ہوا اور تو نے اس کو بیکار چھوڑا، یا تجھ سے ملاپ چاہا اور تو نے اس کو دور کر دیا، تیری طرف دوڑ کر آیا، اور تو نے اس کو دھتکار دیا۔

[2] یعنی دنیا کمانے میں دل توڑ کر کوشش نہ کرو۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ جستجو کو مراد یابی کی مستقل علت قرار نہ دینا چاہیے کیونکہ معاملہ فضل پر منحصر ہے، ہاں جستجو ضروری کی جائے، عادت الٰہی یہی ہے کہ حرکت میں برکت دیتے ہیں۔

استعانت کا تیسرا طریقہ مصیبتوں میں صبر کرنا ہے۔ دنیا دار الحزن ہے، دار المحن ہے، "سجن" یا قید خانہ ہے غم کی وادی ہے، شیطان کی دکان ہے۔ جس میں سوا شر و فساد کے کچھ نہیں،

اُفٍ للدنیا وایامها　　فانها للحزن مخلوقه

همومها لا تنقضی ساعة　　عن ملكٍ فیها او سوقه[1][2]

درویش ہو کہ شاہ، امیر ہو کہ گدا سب غم و ہم میں مبتلا ہیں ہدفِ بلا ہیں، لقد خلقنا الانسان فی کبد[3]۔ چونکہ حق تعالیٰ ہی ہماری غم سے آزمائش کرتے ہیں مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں، رلاتے ہیں اور ہنساتے ہیں وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰی۔ مارتے اور جلاتے ہیں وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْیٰی۔ اور غنی کرتے اور فقیر کرتے ہیں وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰی وَاَقْنٰی۔ اس لیے حق تعالیٰ ہی ہمیں مصائب سے بچنے کا طریقہ بھی بتلاتے ہیں، اور وہ طریقہ صبر ہے، کیا حکیمانہ ارشاد ہے۔

یٰایها الذین اٰمنوا اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون

ایمان والو موجودہ مصائب پر صبر کرو، دوسروں کے ساتھ صبر و استقلال سے کام لو (صابروا) اور ایسے کاموں میں ثابت قدم رہو جس کا وقت ابھی نہیں آیا (رابطوا) اور اللہ سے ڈرو اسی میں تمہاری فلاح و بہبودی ہے، یہی نجاح کا راستہ ہے، صرف صبر اور حق تعالیٰ ہی کے حکم پر اصبر لحکم ربك اور حق تعالیٰ ہی کے لیے وما صبرك الا باللہ ہاں صرف صبر کرنے سے مصائب کی برداشت سہل ہو جاتی ہے، غم کے بادل چھٹ جاتے ہیں، فکر کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے، اسباب کی راہ سے اگر انسان مصائب کو دور کرنا چاہے، غم سے گلوخلاصی حاصل کرنا چاہے اور راحت کی امید باندھے تو سوائے حسرت و یاس کے کچھ نہیں ملتا ہو لانا

---

[1] قول یحییٰ بن معاذ۔ [2] دنیا اور ایام دنیا پر افسوس ہے کہ وہ حزن و غم کے لیے بنائی گئی ہے، اس کے غم ایک گھڑی کے لیے ختم نہیں ہوتے، خواہ بادشاہ کے لیے ہوں یا بازاری آدمی کے لیے۔
[3] ہم نے انسان کو سختی میں پیدا کیا۔ (الآیہ)

رومی نے اسی چیز کو کس خوبی سے ادا فرمایا ہے۔

گر گریزی با امید راحتے — ہم ازآنجا پیشت آید آفتے

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست — جز بخلوت گاہِ حق آرام نیست

حق تعالیٰ سے اگر محبت ہو، اور مصیبت کو ان ہی کی طرف سے دیکھے، تو مصائب کا آسان ہونا ضروری ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ تم ایک تاریک کمرے میں ہو، کوئی چیز تمہیں آلگی، اور تم تڑپ اٹھے، تمہیں معلوم نہیں کہ مارنے والا کون ہے، جب تم نے چراغ منگوایا اور دیکھا کہ یہ تو تمہارا شیخ ہے، یا باپ ہے، یا کوئی عزیز، محبوب ہستی ہے جس سے تم کسی صورت میں آزار کی توقع نہیں کر سکتے تو تمہارا یہ جاننا بیشک تمہاری تسلی اور صبر کا باعث ہوگا، کیونکہ تم اس تکلیف میں بھی دقائقِ لطف کا معائنہ کروگے[۱] اسی طرح وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ میں حق تعالےٰ اپنے بندۂ خاص سے بطریقِ منت فرمارہے ہیں کہ اپنے پروردگار کی رضا و خوشنودی کے لیے اس کے حکم و بلا پر صبر کر، کیونکہ ایمان کی حلاوت اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ تیر بلا کا ہدف نہ بنے ؎

من ساختہ جاں را ہدفِ تیر بلایت!

اگر تم کو حق تعالیٰ کے بیحد مہربان، رحیم، اور ودود ہونے کا یقین ہو جائے اِنَّ اللّٰہَ بِکُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ پر ایمان ہو کَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا پر اذعان ہو، اور وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ پر ایقان قائم ہو جائے، تو پھر تم اپنے دُکھ درد کو پوشیدہ رحمت سمجھو گے۔ مثالوں سے اس نکتہ کو سمجھو، مشفق باپ اپنے بچے کو پچھنے لگاتا ہے لیکن دکھ پہنچانا مقصود نہیں ہوتا، فاسد خون جو اس کے بدن میں زہر ہے آسان طریقہ سے نکال رہا ہے، ماں اپنے چھوٹے بچے کو غلیظ دیکھنا نہیں چاہتی، صابون اور گرم پانی سے اس کو نہلاتی اس کے جسم کو رگڑتی اور مالش کرتی ہے، بچہ چیختا چلاتا ہے، دکھ محسوس کرتا ہے، لیکن ماں کا مقصد آزار پہنچانا نہیں ہوتا، تمہارا

[۱] یہ مثال ابوالعطا اسکندری نے دی ہے۔ بہ تغیر یسیر یہاں استعمال کی گئی۔

خیر خواہ طبیب تمہیں ایارج دیتا ہے، اور تم اُسے ناپسند کرتے ہو، لیکن اگر وہ تمہارے اختیار کا اتباع کرے تو شفا تم سے کوسوں بھاگے، اگر تم کو کوئی ایسی چیز نہ دی جائے جس پر تمہارا دم نکل رہا ہو اور تمہیں یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ یہ نہ دینا عین شفقت و مہربانی کے باعث ہے تو تم کہو گے کہ یہ نہ دینا ہی میرے حق میں دینا ہے۔ شیخ ابوالحسن شاذلی نے کیا خوب فرمایا ہے:

جان لو کہ اگر حق تعالیٰ تم کو کوئی چیز نہیں عطا فرماتے تو ان کا نہ دینا ہی دینا ہے لیکن نہ دینے میں دینا وہی سمجھتا ہے جو صدیق ہے عَسٰۤی اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـئًا وَّيَجۡعَلَ اللّٰهُ فِيۡهِ خَيۡرًا كَثِيۡرًا[1] میں اسی راز کی طرف اشارہ ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدائد پر بھی اسی طرح شکر فرماتے، جس طرح کہ نعمتوں پر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی مَا يَسَاءُ وَيَسُرُّ[2]

صرف ایمان کی ضرورت ہے اور شدتِ حب کی، ہر مصیبت کے وقت حق تعالیٰ کی جو تجلی ہوتی ہے مومن کو اس تجلی میں ایسی حلاوت نصیب ہوتی ہے کہ وہ سختیِ غم کو آسانی سے جھیل لیتا ہے اور اکثر اوقات غلبہ تجلی سے اس کو دُکھ بھی نہیں محسوس ہوتا یہ بات اگر تمہاری سمجھ میں نہ آرہی ہو تو زلیخا پر طعنہ کرنے والی حسین بیبیوں کے حال پر غور کرو۔ یوسف کے ہوش رُبا جمال سے وارفتہ ہو کر انہوں نے اپنا ہاتھ کاٹ لیا، اور خبر بھی نہ ہوئی کہ درد کیا چیز ہے۔ فَلَمَّا رَاَيۡنَهٗۤ اَكۡبَرۡنَهٗ وَقَطَّعۡنَ اَيۡدِيَهُنَّ[3]۔ زبانِ حال سے وہ کہہ رہی تھیں ؎

این است کہ خوں خوردہ دل بردہ بسے را
بسم اللہ اگر تابِ نظر است کسے را

شاید یہی معنی ہیں عرفا کے اس قول کے کہ "انسِ قربت سے ادراکِ الم مفقود ہو جاتا ہے۔"

ایمان اور محبت میں پختہ ہونے کے بعد تم کو بیماریوں، بلاؤں، فاقوں میں وہ اسرارِ لطف و رحمت نظر آنے لگیں گے کہ تم کہہ اُٹھو گے کہ رسول اللہ نے سچ فرمایا حُفَّتِ الْجَنَّةُ

---

[1] شاید تم کسی چیز کو بُرا جانو اور اللہ تعالیٰ نے اس میں خیرِ کثیر رکھی ہو۔
[2] شکر ہے اللہ تعالیٰ کا اس چیز پر جو بُری معلوم ہو، اور جو خوش نظر آئے۔
[3] پھر جب دیکھا اس کو ششدر رہ گئیں اور کاٹ ڈالے اپنے ہاتھ۔

بالمکارہ وحفت النار بالشہوات[1]۔ بلاؤں اور مصیبتوں سے نفس دب جاتا ہے، ذلیل و خوار ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، ان سے ربط قائم کر لیتا ہے، اور سبھوں سے ٹوٹ جاتا ہے، خلق سے فانی ہو جاتا ہے، غم سے زیادہ مؤثر سیرت سازی کے لیے کوئی اور شے نہیں، غم ہی کے ذریعہ نفس کی خامیاں دور ہوتی ہیں، قلب کا تزکیہ ہو جاتا ہے، روح کا تجلیہ ہو جاتا ہے۔ بلا و غم کی وجہ سے اگر تم نے اپنے امراض قلبی کا معالجہ کر لیا، استقامت پیدا کر لی، تو یاد رکھو کہ غم نے تمہیں فوز عظیم کے حاصل کرنے میں مدد دی، اور ایسے غم پر ہزاروں خوشیاں قربان ہیں، وہ خوشیاں جن کی وجہ سے تم شہوتوں میں گرفتار تھے، ہوا و ہوس کے شکار تھے ظلمتوں میں گھرے ہوئے تھے اور نور سے دور تھے! حق تعالیٰ سے تمہارا کوئی ربط نہ تھا، شیطان تمہارا قرین تھا، تم پر مسلط تھا، اور اس وعید کے تم مصداق تھے:-

ومن یعش عن ذکر الرحمٰن نقیض لہ شیطانا فھو لہ قرین[2]

بلا کے اسی فلسفہ سے واقف ہو کر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ افضل عیش (بہترین زندگی) ہم نے صبر میں پائی، حضرت ابوبکر صدیقؓ بیمار ہوئے، لوگوں نے عیادت کی اور کہا کیا ہم طبیب کو بلائیں؟ فرمایا، طبیب نے مجھے دیکھ لیا۔ کہا کہ پھر کیا کہا؟ فرمایا کہ یہ کہا ہے کہ انی فعال لما ارید[3]، معروف کرخی فرمایا کرتے تھے لیس بصادق فی دعواہ من لم یتلذذ بضرب مولاہ جو اپنے مولا کی ضرب سے متلذذ نہیں ہوتا وہ سچا غلام نہیں، اپنے دعوائے عبودیت میں صادق نہیں، بعض عارفین کی جیب میں یہ لکھا رہتا تھا واصبر لحکم ربک فانک باعیننا[4] مصیبت کے وقت اس پر نظر ڈالتے اور محض اس خیال سے کہ حق تعالیٰ ہماری اس مصیبت کو جانتے ہیں، دیکھ رہے ہیں، جھومتے رقص کرتے۔ رسول اللہؐ نے اس آیت پر

---

[1] جنت تو ان باتوں سے گھری ہوئی ہے جو نفس کو ناگوار ہیں، اور دوزخ شہوتوں، خواہشوں سے گھری ہوئی ہے۔ [2] اور جو کوئی آنکھ چرائے رحمٰن کی یاد سے، ہم اس پر مقرر کر دیں ایک شیطان پھر وہی ہے اس کا ساتھی۔ [3] وہی کرتا ہوں جو میں چاہوں۔ [4] اور اپنے رب کے حکم پر صبر کر، کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

وجد فرمایا تھا اور ام المومنین عائشہ صدیقہؓ آپ کے پاؤں پر گر گئی تھیں، اس لیے سلف کے بعض بزرگ تعزیتِ مصائب یوں کیا کرتے تھے اصبر لحکم ربک اس کے ساتھ اس قول نبی صلعم کا سُنا دینا بھی مومن کی خاص تسلی کا باعث ہوگا:

اذا احبّ اللہ عبدًا ابتلاہ	جب اللہ بندہ سے محبت کرتا ہے تو اس کو مصیبت
فان صبر اجتباہ وان رضی	میں مبتلا کرتا ہے۔ اگر وہ صبر کرے تو اپنا پسندیدہ اور
اصطفاہ۔	راضی رہے تو برگزیدہ بنا لیتا ہے۔

اب ایک کلی نفسیاتی قانون پر غور کرو، انسان کے لیے مصیبتوں اور آفتوں کا برداشت کرنا اس وقت کسی قدر آسان اور سہل ہوتا ہے جب اس کو کسی اچھے بدل کی توقع ہوتی ہے۔ مثلاً اگر میں اپنے وطن سے دور، اہل وعیال سے مجبور کسی جگہ تمام دن محنت ومشقت میں گزار رہا ہوں، تو واقعی میرے لیے یہ ایک مصیبت ہے، لیکن میں اس کو مصیبت نہیں سمجھتا، کیونکہ مہینے کے ختم پر مجھے اس کا معاوضہ معقول تنخواہ کی صورت میں مل جاتا ہے، یہ میرے غموں کو بھلا دیتا ہے، میرے زخموں کے لیے مرہم کا کام دیتا ہے۔ اسی اصول کو پیشِ نظر رکھ کر ان وعدوں اور بشارتوں پر غور کرو جو قرآنِ کریم میں اس شخص سے کی جا رہی ہیں جو مبتلائے مصیبت ہے اور صبر کر رہا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا و آخرت کی ساری بھلائیاں صبر ہی میں رکھی ہیں!

امام احمد رضی اللہ عنہ کی تحقیق ہے کہ قرآن میں صبر کا ذکر نوّے جگہ آیا ہے، ہم یہاں چند بشارتوں کا ذکر کرتے ہیں جو صابر کے حق میں آئی ہیں۔ اگر وہ ان کو پیشِ نظر رکھے ان پر یقین واذعان کے ساتھ تفکر کرے تو چیخ اُٹھے کہ "بلا از دوست عطا است واز عطا نالیدن خطا است!"

صبر سے ہم حق تعالیٰ کے محبوب بنتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ[1]۔ اور جو

---

[1] اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

حق تعالیٰ کا محبوب ہوا اس کو کس چیز سے حزن ہو سکتا ہے اور کس چیز سے خوف؟ صابر کو حق تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے إِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِينَ[1] اور یہ معیت سو کچھ معیت نہیں جس کے ساتھ حق تعالیٰ ہوں وہ کیسے ذلیل ہو سکتا ہے، کیسے مقہور ہو سکتا ہے، خلق اس کا کیا بگاڑ سکتی ہے؟ لا طاقۃ للمخلوق مع قدرۃ الخالق! صبر ہی سے امامت و پیشوائی نصیب ہوتی ہے وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا[2]! خلق کی ہدایت کا منصب سپرد ہوتا ہے، صابر کے لیے اس کا صبر اعداء کے مکر و فریب کے مقابلہ میں ایک زبردست سپر ہے۔ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا[3]۔ بالآخر ان پر غالب ہونا اس کے لیے یقینی ہے فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ[4]۔ اس کا اپنے مطلب پر فائز ہونا ضروری ہے۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا! یعنی تیرے پروردگار نے جو وعدہ بنی اسرائیل کے ساتھ کیا تھا یعنی دشمنوں سے نجات اور ملک و حکومت کے عطا کرنے کا وعدہ صبر ہی کی وجہ سے ایفا ہوا، صابرین کے لیے غیر محدود اجر کا وعدہ ہے إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ سلیمان بن قاسم نے کہا ہے کہ ہر عمل کا ثواب معلوم ہے، مگر صبر کا اجر "بغیر حساب" ہونے کی وجہ سے نامعلوم و ناقابلِ علم! حق تعالیٰ نے صابروں کے لیے اپنی رحمت، ہدایت اور صلوٰۃ یکجا جمع کیے ہیں۔ اور یہ اکٹھے ان کے سوا کسی اور کو نہیں دیے وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ[5]۔

اگر درد گریز پا، سریع الزوال، فانی درد صبر کے ساتھ برداشت کر لیا جائے (اور

[1] اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ [2] اور ہم نے ان میں سے پیشوا بنائے جو بتاتے تھے ہمارے حکم سے جب وہ صبر کرتے رہے [3] اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کے مکر سے تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچیگا

[4] پس صبر کرو کیونکہ متقین کا انجام نیک ہوتا ہے۔

[5] اور بشارت دو صابرین کو جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کے صلوات ہیں اور رحمت اور یہی ہدایت یافتہ ہیں۔

اس کی برداشت ناممکن بھی نہیں کیونکہ ناقابلِ برداشت تکلیف کسی کو دی بھی نہیں جاتی، تو دیکھو اس کے معاوضہ میں کیا مل رہا ہے؟ کن چیزوں کا وعدہ ہو رہا ہے؟ اور کون وعدہ کر رہا ہے؟ کس کی زبانی وعدہ کیا جا رہا ہے؟ اگر تمہارے قلب میں ایمان کی شمع روشن ہے، اگر وہ "غلاف" میں نہیں باندھ دیا گیا ہے، اوندھا نہیں ہو گیا ہے، اگر وہ ادراک کی قوت رکھتا ہے، اور ان حقائق کا ادراک کر رہا ہے تو کیا درد اس کے لیے ایک نعمتِ بے بہا نہیں، وہ اس سے متلذذ نہیں ہوگا، اس کا مشتاق نہ ہوگا، اور فرطِ اشتیاق میں یہ چیخ اس کی زبان سے نہیں نکلیگی۔

زہرِ غمِ دوست جز شکر نیست	این تیر نصیبِ ہر جگر نیست
بدرکے دہد آں حبیب جانی	شیریں بود انچہ تلخ می دانی!

اب غور کرو اس حدیث کے مفہوم پر:-

یتعاھد اللہ عبدہ بالبلاء	حق تعالیٰ اپنے بندے کی بلا کے ذریعہ خبر گیری کرتے
کما یتعاھد الوالد الشفیق	ہیں اسی طرح جس طرح کہ مہربان باپ اپنے بچہ کی
ولدہٗ ۔	خبر گیری کرتا ہے

صحابۂ کرام کے یہی ادراکات تھے، اور ان ہی کی قوت سے انہوں نے اپنا سارا تن من دھن اسلام کی راہ میں قربان کر دیا تھا۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ،

صبر کا ادب یہ ہے کہ زبان کو شکوہ شکایت سے روکا جائے، سوائے حق تعالیٰ کے اپنی مصیبت کا کسی سے گلہ نہ کیا جائے اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ۔[2]

دردم نہاں بہ زطبیبانِ مدعی	باشد کہ از خزانہ غیبم دوا کنند

---

[1] ابو سعید سے مرفوعاً روایت ہے، دل چار طرح کے ہوتے ہیں (۱) اجرد (برہنہ) اس میں چراغ ساجلتا ہے، یہ مومن کا دل ہے، (۲) غلف جس کو غلاف میں باندھ دیا گیا ہو، یہ کافر کا دل ہے (۳) منکوس (اوندھا) یہ خالص منافق کا دل ہے (۴) مصفح وہ دل جس میں ایمان و نفاق دونوں موجود ہیں، یعنی زبانی ایمان کا دعویٰ اور دل میں اس کا یقین نہیں۔

[2] میں تو کھوتا ہوں اپنا اضطراب و غم اللہ کے سامنے۔

غور تو کرو کہ مخلوق سے شکوہ کرنے کے کیا معنی ہیں، یہی نہ کہ ایک رحیم و کریم ذات کا ایک غیر رحیم و کریم ہستی سے شکوہ کیا جارہا ہے، ایسا شخص کبھی حق تعالیٰ کی اطاعت کی حلاوت اپنے دل میں نہ پائیگا، راسِ صبر یہ ہے کہ مصیبت کو چھپایا جائے، من کنوز البر کتمان المصائب وما صبر من بث۔[1] (حدیث انس رض مرفوعاً) لیکن مصیبت میں یا درد کی حالت میں زبان سے ہائے وائے نکل جائے تو یہ منافیٔ صبر نہیں بشرطیکہ ان سے شکوہ شکایت مقصود نہ ہو اور محض استراحت منظور ہو، کیونکہ کراہنے سے توجہ درد کی طرف سے ہٹ کر اس میں ایک قسم کی کمی محسوس ہوتی ہے، اسی لیے "انین" (نالہ) کی دوسری قسم کے متعلق حکم ہے کہ لا یکرہ و لا یقدح فی الصبر یعنی صبر کے منافی نہیں، اور پہلی قسم کو بروایتِ امام احمد رض قادحِ صبر قرار دیا گیا ہے۔

بلا اور مصیبت کے وقت صبر کے معنی یہی ہیں کہ توافق بالقضا کیا جائے، گو فطری طور پر درد و حزن ہو رہا ہو اور رو رہا ہو گلہ نہیں یہ تو اقتضائے بشریت ہے۔ انسانِ کامل، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابراہیم کے انتقال پر فرما رہے تھے انا بفراقك یا ابراهیم لمحزونون (تیرے فراق نے اے ابراہیم ہمیں محزون کر رکھا ہے) لیکن عقلی صدمہ نہ ہونا چاہیے یعنی اس مصیبت کے واقعہ کو بے محل اور قبل از وقت خیال نہ کیا جائے، اس کے ساتھ توافق کیا جائے، زبان پر ہو ؎

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود!

اور دل میں یہ خیال ہو ؎

جہاں دار داند جہاں داشتن

اب حکم کے تحت اسبابِ قطعیہ کا استعمال جائز ہے بلکہ ضروری ہے، اور انسان کی فطرت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ بغیر چارہ کار اختیار کرنے کے خاموش نہیں رہتی لیکن

[1] نیکی کا خزانہ مصائب کے چھپانے میں ہے جس نے اپنے مصائب کو ظاہر کر دیا اس نے صبر نہیں کیا۔

اسباب کے استعمال میں نظر اسباب پر نہ ہو مسبّب پر ہو تو اسباب میں اثر پیدا ہوتا ہے۔ علاج کا یہ طریقہ استعمال کیا جائے اس کے تمام اجزاء کو سمجھ کر ان کی پابندی کی جائے تو رفتہ رفتہ رضا کا مقام حاصل ہو جاتا ہے، جو راحتِ کبریٰ ہے، دنیا میں جنتِ عالیہ ہے۔

استعانت کا چوتھا طریقہ حق تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا ہے۔

انسان کی زندگی میں غم بھی ہے اور خوشی بھی، رنج بھی ہے اور راحت بھی، ظلمت بھی ہے اور نور بھی۔ قنوطیہ نے اپنی کوری عقل سے دنیا کے مبدء ہی کو شر قرار دیا، اور بالآخر ہمہ شیطنت (Pandiabolism) کے نظریہ کے حامی بن گئے۔ ان کے تجربہ میں یہ دنیا بدترین دنیا ثابت ہوئی۔ سوائے غم و حزن کے کوئی شے انہیں حقیقی نظر نہ آئی، اس کے برخلاف رجائیہ نے اس دنیا کو بہترین دنیا قرار دیا، غم و الم ان کی رائے میں محض منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہیں۔ تضاد سے لذت کی کیفیت میں اشتداد پیدا کرتے ہیں حقیقی نہیں اعتباری ہیں، لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس دنیا میں غم بھی حقیقی ہے، اور خوشی بھی حقیقی، ان میں سے کسی ایک کو التباس قرار دینا خود کو دھوکے میں مبتلا کرنا ہے۔ حقیقت سے چشم پوشی کرنا ہے، اس کی تصدیق ہر شخص اپنے تجربہ سے ہر روز کر رہا ہے، وہ نہ بلا کو قائم پاتا ہے نہ نعمت کو ہر دو دور سے گزر رہا ہے، خوشی کے احساس کا انکار کر سکتا ہے، نہ غم کے ادراک کا، بلا و نعمت کا پایا جانا ان کا محسوس ہونا ہے اور یہیں بارکلے[1] کی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ موجود ہونا دراصل محسوس ہونا ہی ہے (ESSBIST PERCOPI) بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے اسماء جلالی بھی ہیں اور جمالی بھی اور یہ ہر وقت مصروفِ عمل ہیں، ایک لحظہ کے لیے معطل اور بیکار نہیں۔ خیر و شر، رنج و راحت، لذت و الم، نعمت و بلا انہی کی تجلیات کا نتیجہ ہیں اور حقیقی ہیں۔

---

[1] تصوریت کا بانی اٹھارویں صدی عیسوی کا ایک نہایت فریس اور تیز فہم فلسفی ۱۶۸۵ء تا ۱۷۵۳ء مادہ کے وجود ہی سے انکار کیا۔ کائنات غیر مادی روحانی شے ہے اور محض نفوس یا ارواح کی جماعت پر مشتمل ہے

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ بلا سے نجات چاہتا ہے، اور نعمت میں اضافہ، بصیرتِ محمدیہؐ نے دونوں کے لیے قلبی طریقے بتلائے ہیں، بلاؤں میں صبر اور نعمتوں میں شکر قلب انسانی میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیتے ہیں، اس کو ایک طرف تو نالہ، فریاد، ماتم، سینہ کوبی، یاس وقنوط سے نجات دیتے ہیں، اور دوسری طرف کبر، عجب، فخر، غرور، تبختر سے چھڑاتے ہیں، ان سلبی ومضر جذبات سے نجات پاکر وہ قوت، ہمت اور عمل کا مخزن بن جاتا ہے اور اس کے لیے کائنات کی تسخیر آسان ہو جاتی ہے، اس کی توانائیاں رائیگاں نہیں جاتیں صحیح جانب لگ جاتی ہیں، اور وہ ایک نقطہ پر مرکوز ہو کر حیرت انگیز نتائج پیدا کرتی ہیں مصیبت میں صرف اتنی احتیاط ضروری ہے کہ ارادہ بالکل شکستہ نہ ہو جائے ہمت بالکل ٹوٹ نہ جائے، بلا کا بہادری سے مقابلہ کیا جائے، جو اس بجا ہوں یہی چیز صبر سے حاصل ہوتی ہے، اور نعمت میں خطرہ اس بات کا لگا رہتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کو بھول نہ جائے، جو تمام حسنات ومحامد کا منبع ہیں اور اس طرح اس منبع سے دور نہ ہو جائے اور ظلمتوں میں گرفتار نہ ہو جائے، شکر سے یہ خطرہ رفع ہو جاتا ہے، کیونکہ شکر کی حقیقت یہ ہے کہ نعمت کو حق تعالیٰ کی جانب سے دیکھا جائے، اپنی ذات یا خلق کی طرف اس کی نسبت نہ کی جائے، کیونکہ در اصل حق تعالیٰ ہی ضار ہیں اور نافع، نفع و ضرر انہی کے دستِ قدرت میں ہیں، گو حواس کی نگاہ کو یہی نظر آتا ہے، کہ نعمت خلق ہی کے ہاتھ سے پہنچ رہی ہے، لیکن چشم بصیرت جانتی ہے کہ یہ محض بمنزلہ اسباب وآلاتِ نعمت ہیں، قاسم، مجری و فاعل ومسبب حق تعالیٰ ہی ہیں، وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ۔ جب انسان اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھ کر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے تو وہ اس کی نعمتوں میں اضافہ کرتے ہیں، یہ ان کا قطعی وعدہ ہے، کسی استثنا کی گنجائش نہیں۔ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ[1] اجابتِ دعا، رزق وغنا، توبہ ومغفرت کا اختصاص

[1] اگر تم شکر کرو تو یقیناً ہم (نعمتوں میں) اضافہ کرتے ہیں۔

اپنی مرضی پر رکھا ہے، لیکن شکر کے عوض زیادتی نعمت کا حصول بلا تخلف ہے، اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَن نزلت الیہ نعمۃٌ فلیشکرھا۔ جس کسی پر نعمت کا نزول ہو اس کو چاہیے کہ شکر ادا کرے۔

سیدِ مرسلاں و مرسلِ راز — داد فرماں بشکر نعمت و ناز
گُلِ نعمت برائے ہر کہ شگفت — شکرِ آں روز و شب بباید گفت

اس عظیم الشان صداقت کو جس پر نعمتوں کا بقا منحصر ہے افصح العرب والعجم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور نفسیاتی طریقے سے ادا فرمایا ہے۔

النعمۃُ وحشیۃٌ قیّدوھا بالشکر۔ — نعمت ایک وحشی جانور ہے، شکر کی زنجیروں سے اس کو باندھ رکھو

خاتمِ ملکِ وحی و خاتمِ دیں — شکر فرمود بر نخیف و سمیں
باز نعمت چو ہست وحشی را — صید از قیدِ شکر کن او را
چوں گذاری تو شکر نستیزد — ور شوی ناسپاس بگریزد

نفسیات کا یہ ایک مسلمہ قانون ہے کہ انسان کو جب نعمت حاصل ہوتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے، لیکن چند روز بعد یہ نعمت اپنی مانوسیت کی وجہ سے اپنی قدر و قیمت کھو دیتی ہے، اب اس میں کوئی ندرت باقی نہیں رہتی، اس کے وجود سے اس کو کوئی خاص فرق اپنی زندگی میں محسوس نہیں ہوتا، اور باوجود ناز و نعم میں گھرے ہونے کے وہ ضیق محسوس کرتا ہے، لیکن اگر یہ مفقود ہو جائے، یا ہاتھ سے چھین لی جائے تو اب اس کو اس کی قدر ہوتی ہے، قدرِ نعمت بعد زوال اسی صداقت کا اظہار ہے، علاوہ ازیں احساسِ نعمت کا مفقود ہونا گویا نعمت ہی کا مفقود ہونا ہے، اگر نعمت سے مجھے خوشی نہ ہو، کوفت ہو، تعب ہو تو یہ میرے لیے نعمت نہیں زحمت ہے، ان حقائق کو سمجھ لینے کے بعد تمہیں معلوم ہوگا کہ ازدیادِ نعمت میں شکر کا کتنا دخل ہے۔ نعمت کے شعور سے نعمت کا بقا ہے، شعور کا فقدان

نعمت کا فقدان ہے، اسی لیے احساسِ نعمت کو زندہ رکھنا چاہیے، اور یہی چیز شکر سے حاصل ہوتی ہے۔ حضرت حسن بصری شکر کو "جالب" "حافظ" کہتے تھے، کیونکہ وہ موجودہ نعمتوں کی "حافظ" اور مفقود نعمتوں کی "جالب" ہے۔ شکر سے نعمت سلب ونقصان سے محفوظ ہو جاتی ہے، اور چونکہ شعور میں نعمتوں کے ادراک کی قوت پیدا ہو جاتی ہے، وہ ان چھوٹی چھوٹی عنایتوں کا بھی مشاہدہ کرنے لگتا ہے جو اس کے قبل نظر سے پوشیدہ تھیں اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شکر سے نعمتوں میں قطعی اضافہ ہوتا ہے۔ الشاکر یستحق المزید (شاکر زیادتی کا مستحق ہے) ایک نفسیاتی صداقت ہے، اسی لیے ہمارے اسوۂ حسنہ کو جب بھی کوئی امر خوشی کا پیش آتا تو شکر الٰہی کی ادائی کے لیے سجدہ میں گر جاتے۔ (رواہ احمد)

انسان کی کچھ عجیب فطرت ہے، نعمتوں کو بہت جلد بھول جاتا ہے اور مصیبتوں کا ہمیشہ شکوہ کرتا رہتا ہے، کسی عرب شاعر نے اس پر خوب تہدید کی ہے۔

یا ایها الظالم فی فعله   والظلم مردود علی من ظلم

الی متیٰ وحتیٰ متیٰ   تشکو المصیبات وتنسی النعم

ذرا ہمیں اپنی ان نعمتوں کو دہرانا چاہیے جن کی طرف ہماری نظر نہیں جاتی، پہلے "نعمتِ نفع" کو لیجیے، پھر "نعمت دفع" کو دونوں بیشمار ہیں۔ "نعمت نفع" میں آدمی اپنے صحیح و سالم قد و قامت پر نظر کرے، صحت و عافیت پر غور کرے، ان لذتوں کا خیال کرے جو کھانے پینے اور جنسی خواہشوں کی تکمیل میں اس کو میسّر ہیں، پھر "نعمتِ دفع" کے سلسلہ میں یہ دیکھے کہ وہ اپاہج نہیں، ہزاروں بیماریوں سے محفوظ ہے، دشمنوں اور مخالفوں کے شر سے مامون ہے، صاحبِ ایمان پھر نعمت کو ایک اور نقطۂ نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ اس کو "نعمتِ توفیق" بھی حاصل ہے اور "نعمت عصمت" بھی! نعمتِ توفیق یہ کہ

لہ اے اپنے فعل میں ظلم روا رکھنے والے تجھے معلوم ہے کہ ظلم ظالم پر لوٹ کر آتا ہے۔ کب تک اور کہاں تک تو مصیبتوں کا شکوہ کرتا رہیگا اور نعمتوں کو بھلاتا جائیگا؟

اس کو ایمان توحید، صدق و استقامت حاصل ہے، نعمتِ عصمت یہ کہ وہ کفر و شرک، نفاق وارتداد، بدعت و فسق و غفلت سے محفوظ رکھا گیا ہے، اگر ان نعمتوں کی وہ تفصیلات میں جلائے، ان کی جزا پر نظر کرے، اپنی صلاحیت و استعداد پر غور کرے، یہ دیکھے کہ اس کو ان نعمتوں کا کیا حق ہے، تو بے اختیار چیخ اُٹھے۔

بے لطفِ تو من قرار نتوانم کرد　　　　احسانِ تو شمار نتوانم کرد

گر بر تنِ من زباں شود ہر موئے　　　　یک شکر تو از ہزار نتوانم کرد　(ابوسعید رحمۃ)

سچ ہے اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا (اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرو تو گن نہ سکو گے)
اب ان لاتعداد احسان کا شکر انسان کیسے ادا کر سکتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ "شکر ادائے شکر سے اپنے عجز کا جان لینا ہے" ادائے شکر کے ساتھ ہی ایک اور شکر لازم آتا ہے، کیونکہ شکر کی توفیق بھی تو حق تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے، اور یہ توفیق خود ایک بڑی نعمت ہے جس کا شکر ضروری ہوا، پھر اس شکر کا شکر، وھلم جرًا الیٰ نہایۃ۔ اس لیے احسان و منت باری تعالیٰ کا مشاہدہ خود شکر ہے، ان کی نعمتوں کا اعتراف خود شکر ہے۔ ان کے حصول کے بعد مرضیاتِ حق پر قائم رہنے کی دعا خود شکر ہے، ان پر حق تعالیٰ کی ثنا خود شکر ہے۔

حق تعالیٰ سے استعانت کے دوسرے طریقے اجمالاً یہ ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ گناہوں کے صدور پر توبہ کریں، حق تعالیٰ مغفرت سے ہماری استعانت فرماتے ہیں۔ اِنَّہٗ کَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا۔ وہ رجوع کرنے والے کو معاف کرتے ہیں، کتنا تسکین بخش اور محبت آمیز پیام ہے اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اھْتَدٰی۔ میں معاف کر دیتا ہوں اس کو جس نے توبہ کی، ایمان لایا، نیک عمل کیے اور پھر اس راستہ پر چلا، توبہ و ندامت سے گناہ کی سیاہی قلب سے محو ہو جاتی ہے۔ گناہوں سے تنفر پیدا ہو جاتا ہے نیکیوں سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ اور تائب حق تعالیٰ کا محبوب ہو جاتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ۔

ہم نے اوپر تفصیل سے دکھلایا ہے کہ قوت و اثر اصالۃً صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے ثابت

ہیں۔ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

ہماری خوف ورجا کی نسبت صرف حق تعالیٰ ہی سے قائم ہو جاتی ہے اور اس کے قیام کے ساتھ ہی حق تعالیٰ ہمیں مخلوق سے غنی اور بے نیاز کر دیتے ہیں اور اس غنا کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اس قاتل جذبہ کے چنگل سے آزاد ہو جاتے ہیں جس نے سنگ پرستوں کی زندگی کو سکون وطمانیت سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا ہے۔ یہ خوف کا جذبہ ہے جس نے ان کو سوتے جاگتے ہر وقت پریشان، مضطرو حواس باختہ کر رکھا ہے اور جس کی وجہ سے انہیں ہر کونہ میں ایک دام دکھائی دیتا ہے اور ہر گوشہ میں ایک درندہ!

اگر ہم اس امر میں حق تعالیٰ سے استعانت چاہیں کہ وہ ہمیں یاد رکھیں اور ہم سے راضی رہیں، تو ہمیں چاہیے کہ ہم حق تعالیٰ کو یاد رکھیں اور ان کے ہر حکم و فعل سے راضی ہو جائیں فاذکرونی اذکرکم۔ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کرونگا، اسی لیے حکم فرمایا کہ اذکروا اللہ ذکرًا کثیرًا۔ اور ہمارے راضی ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہم سے راضی ہو جاتے ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ورضوا عنہ۔

آنانکہ رضائے حق بجاں می جویند | در راہِ رضائے او بسر می پویند
ہر یک ہمہ آں کنند کہ حق فرماید | حق نیز ہماں کند کہ ایشاں گویند

اوپر جو کچھ ہم نے کہا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مذہب یا دین مشتمل ہے دو اجزاء پر عبادت و استعانت پر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ محمد رسول اللہ کی قلبی تصدیق اور لسانی اقرار سے ہمارے قلوب سے غیر اللہ کی معبودیت و ربوبیت فنا ہو جاتی ہے۔ اس قلب کی عظمت کا کیا کہنا جس سے غیر اللہ کی معبودیت و ربوبیت فنا ہو کر اللہ کی ربوبیت و معبودیت متمکن ہو گئی ہے، جس کے الٰہ قطعاً اللہ ہیں، یعنی جس کے معبود، جس کے مسجود، جس کے مطلوب، جس کے مقصود قطعاً اللہ ہیں، جس کے رب جس کے مستعان قطعاً اللہ ہیں! اس قلب میں توحید کا جلوہ ہے، ایمان کا نور ہے، وہ نورانی قلب ہے، حق تعالیٰ کا محبوب ہے اور حق تعالیٰ

اس کے وکیل ہیں، کفیل ہیں، ولی ہیں، مولیٰ ہیں، نصیر ہیں، حفیظ ہیں اور ہادی ہیں۔

اس ضمن میں چند تعریفات یاد رکھو، جیسا کہ تم نے دیکھا ہے۔ ذاتِ اللہ ہی کو الٰہ قرار دینا یعنی معبود و مستعان قرار دینا، زبان سے اقرار اور دل سے اس کی تصدیق کرنا توحید ہے، اس اقرار و تصدیق سے قلب سے شرک کا خروج ہوتا ہے، اور توحید داخل ہو جاتی ہے، جس ذاتِ پاک نے یہ پیام ہم تک پہنچایا (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی رسالت کے اقرار و تصدیق سے دل سے کفر کا خروج ہو جاتا ہے اور ایمان جلوہ افروز ہو جاتا ہے۔ ایمان میں دو چیزیں ہیں اور توحید میں بھی دو چیزیں۔ ایمان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی الوہیت کی تصدیق ہے، توحید میں اللہ تعالیٰ کی معبودیت و ربوبیت اور ان کے ماتحت بندہ کی عبادت و استعانت کی تصدیق داخل ہے۔ اس کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار یا شک نفاق ہے۔ اس کی تصدیق کے بعد انکار "ارتداد" ہے۔ یہ مثل شرک کے دین و مذہب کی نفی ہے، بغاوت ہے، اور اس لیے ناقابلِ معافی! اور بدعت بھی بُری بلا ہے۔ یہ دین میں کسی نئی بات کا پیدا کرنا ہے، جو دین کی بات نہیں اس کو دین سمجھنا ہے۔ غیر شریعت کو شریعت تبلانا افترا علی اللہ اور ایک گونہ "ادعائے نبوت" ہے، بدعتی کو توبہ کم نصیب ہوتی ہے، کیونکہ وہ تو اس کو مستحسن سمجھ رہا ہے، پھر توبہ کیوں کریگا۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار۔

قبل ایمان کفر و شرک سے توبہ لازم ہے، پھر ایمان یعنی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی قلبی تصدیق اور لسانی اقرار جس سے غیر اللہ کی معبودیت اور ربوبیت فنا ہو کر اللہ کی معبودیت و ربوبیت متمکن ہو جائے۔ اب نفاق، ارتداد، بدعت، فسق و فجور سے احتراز ایمان اور عملِ صالح پر استقامت، یہ ہے دین یا "بندگی" جس کے متعلق عارف روم نے کیا خوب کہا ہے ؎

گر تو خواہی حرّی و دل زندگی　　بندگی کن بندگی کن بندگی

زندگی مقصود بہر بندگی است — زندگی بے بندگی شرمندگی است

جز خضوع و بندگی و اضطرار — اندریں حضرت ندارد اعتبار

ہر کہ اندر عشق یابد زندگی — کفر باشد پیشِ او جز بندگی

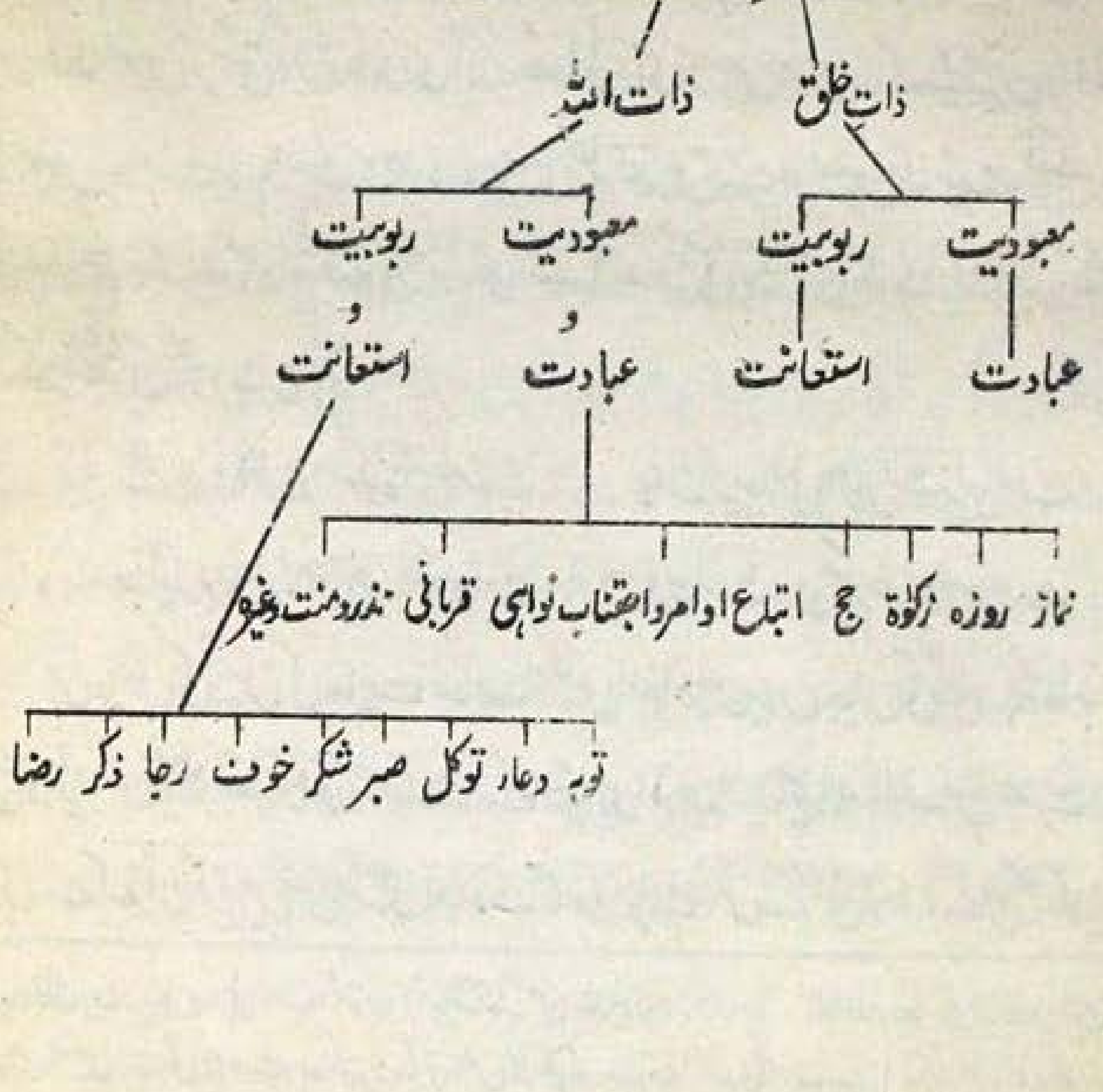
ذوق باید تا دہد طاعات بر — مغز باید تا دہد دانہ شجر

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. (یوسف ۱۲۶)

ضمیمہ

مندرجہ ذیل نقشہ سے دین کے سارے اجزاء کی تلخیص پیشِ نظر ہو جاتی ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ



توحیدِ اُلوہیّت[1]

سیری بحریمِ جان و دل منزل کن　　　　قطع نظر از صورتِ آب و گِل کن
جز معرفتِ الٰہ ہیچ است ہمہ　　　　بگذر ز ہمہ معرفتے حاصل کن!　(سیری غزنوی)

تخلیقِ عالم کی غایت کیا ہے؟ جن و انس پیدا کیوں ہوئے؟ "از آمدن و رفتن ما سودے کو؟" فلسفیوں کو اپنے گودکِ عقل کے ساتھ کھیلتا چھوڑ کر (ذَرْهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ) ہم اس اساسی سوال کے جواب کے لیے قرآن کریم کی طرف توجہ کرتے ہیں جو مبدء ہے علمِ حقیقی کا اور جو ریب و شک، ظن و تخمین، قیاس و وہم سے منزہ ہے۔ یہیں ہمیں وہ نورِ ہدایت نصیب ہوتا ہے جس کو عقل نظری ہمیں عطا نہیں کر سکتی، اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى! یہیں مومن کے لیے یقین و اذعان کا ذخیرہ ہے۔ یہیں بداہت و ہدایت کا جلوہ ہے یہیں علمِ حقایق ہے اور یہیں طمانیت و تسکین۔ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ[2]! (پ ۸ ع ۶)

علمے کہ نہ ماخوذ ز مشکوٰۃ نبی است　　　　واللہ کہ سیرابی ازاں تشنہ لبی ست
جائیکہ بود جلوۂ حق حاکمِ وقت　　　　تابع شدن حکمِ خرد بوالعجبی ست　(شاہ ولی اللہ)

جن و انس کی تخلیق کی غایت صاف و سلیس الفاظ میں یوں بیان کی گئی ہے "مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" عبادت کے معنی ہیں "توحید"۔ چنانچہ امام المفسرین حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ قرآنِ کریم میں جس جگہ بھی عبادت کا ذکر آیا ہے اس کے معنی توحید کے ہیں[3]۔ گویا محاورۂ قرآن

---

[1] یہ مقالہ رسالہ برہان دہلی، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔
[2] اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تمہیں اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی۔ اس کا تم کو اللہ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم احتیاط رکھو۔
[3] بخاری حدیث وفد عبد القیس۔

میں عبادت ہر جگہ توحید کے معنی میں آئی ہے "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کے معنی ہونگے نوحدک
ونطیعک اور "ایای فاعبدون" کا مفہوم ہوگا کہ میری ہی توحید تمہارے سینوں میں بس جائے۔
عبادت کی تعبیر توحید کے لفظ سے کرنے میں خوبی یہ ہے کہ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ عبادت
صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے جو واحد لاشریک ہے۔ اس سے شرک کی قطعی نفی ہو جاتی ہے
جس کو کسی دوسری جگہ کھول کر اس طرح بیان کیا گیا ہے وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا[۱] (پ۵
ع۳) ہمیں اپنی عبادت و معرفت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، ہماری زندگی کا مقصود یہی عبادت و بندگی
ہے۔ یہی عرفان یہی توحید ہے، تمام انبیاء نے اسی توحیدِ الوہیت کو پیش کیا۔ یہی ان کی بعثت و
دعوت کا اصل مقصود تھا۔

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم ۔۔۔ خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم!
(قاسم)
مقصودِ من خستہ زکونین توئی ۔۔۔ از بہر تو میرم و برائے تو زیم!

تمام پیغمبروں کے پیغام کا یہی نچوڑ تھا کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ یعنی اے
قوم تم اللہ ہی کی عبادت کرو کہ اس کے سوائے تمہارا کوئی معبود و رب نہیں، یا اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ
اِيَّاهُ یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، حضرت نوح نے اپنی قوم سے خطاب فرمایا: اَنِ اعْبُدُوا
اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ، اور یہ عبادت اسی توحید و تقویٰ و اطاعت پر مشتمل ہے، حضرت ہودؑ حضرت
صالحؑ اور حضرت شعیبؑ نے بھی انہی الفاظ سے کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ سے اپنی
قوم کو توحید کی طرف بلایا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کو یوں مخاطب کیا اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ذٰلِكُمْ
خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اور مشرکین سے اپنی برأت اس طرح ظاہر فرمادی اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ
اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ[۲] (پ۲۵ ع۹) انہوں نے اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو یہ
وصیت فرمادی تھی کہ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ[۳] (پ۱ ع۱۶)

---

[۱] تم اللہ ہی کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی اور چیز کو شریک مت کرو
[۲] میں ان چیزوں سے بیزار ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو مگر ہاں جس نے مجھ کو پیدا کیا پھر وہی مجھ کو رہنمائی کرتا ہے۔
[۳] اے میرے بیٹو اللہ تعالیٰ نے اس دین کو تمہارے لیے منتخب فرمایا ہے سو تم بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا!

حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کو اور حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اہلِ فرعون کو یہی بات پہنچائی تھی کہ تم صرف اللہ ہی کو پوجو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں" اسی تعلیم، اسی دعوتِ توحید کے ساتھ ہمارے نبی النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور حق تعالیٰ نے آپ کی ذات پر اس دعوت الی التوحید کو ختم فرمادیا، آپ کو ارشاد ہوا۔ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ؕ[1] (پ ۹ ع ۹)

غرض توحید الوہیت پر سارے انبیائے اولین و آخرین کا اجماع ہے، جو بھی رسول آیا وہ توحید کی دعوت لے کر آیا۔ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ[2] (پ ۱۷ ع ۲)

اسی لیے لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ اسلام کا دعوتی کلمہ ہے جس میں توحیدِ الوہیت اور رسالتِ محمدی کو پیش کیا جارہا ہے جن کا جان کر اقرار کرنا ایمان کے لیے ضروری ہے، فرض اول ہے اِلٰہ اسم صفت ہے اور باجماعِ اہلِ علم اس کے معنی "معبود" کے ہیں اور اس پر آیاتِ قرآنی دلیل ہیں ان میں سے بعض پر غور کرو۔

(۱) وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ	یعنی وہی ذات پاک آسمان اور زمین کا معبود ہے
(۲) أَمْ لَهُمْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ	یعنی کیا اللہ کے سوا ان کا کوئی معبود ہے؟
(۳) وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلَىٰ قَوْمٍ يَعْكُفُونَ عَلَىٰ	ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار اتار دیا، پس ان لوگوں کا ایک قوم پر گزر ہوا جو اپنے چند بتوں کو لگے بیٹھے

[1] آپ کہہ دیجیے کہ اے لوگو میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا ہوں جس کی بادشاہی ہے تمام آسمانوں اور زمین میں اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، سو اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر۔

[2] ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہیں بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری عبادت کیا کرو۔

اَصْنَامٍ لَّهُمْ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَا اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ (پ ۹ ع ۶)

ہیں کہنے لگے اے موسیٰ ہمارے لیے بھی ایک معبود ایسا ہی مقرر کر دیجیے جیسے ان کے یہ معبود ہیں، آپ نے فرمایا کہ واقعی تم لوگوں میں بڑی جہالت ہے۔

(۴) وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا

اور تو اپنے معبود کو دیکھ جس پر تو جما ہوا بیٹھا تھا ہم اس کو جلا دینگے پھر اس کو دریا میں بکھیر دینگے بس تمہارا معبود تو صرف اللہ ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں، وہ علم سے تمام چیزوں کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔

(۵) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے کہا تھا کہ اگر تم ایک کلمہ کا اقرار کر لو تو تمام عرب تمہارا مطیع ہو جائے اور تمام عجم تمہاری خدمت گزاری کرنے لگے۔ ابوجہل نے خوش ہو کر کہا کہ بتلایئے وہ کلمہ کیا ہے، ہم ایسے دس کلمے ماننے کے لیے تیار ہیں۔ فرمایا دس نہیں بس ایک ہی کلمہ ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ یہ سنتے ہی ان سب کو طیش آیا، کہنے لگے "اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ (پ ۲۳ ع ۱۰) یعنی اس نے تو اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا۔ واقعی یہ بہت ہی عجیب بات ہے"۔ (ترمذی شریف کتاب التفسیر)

ان تمام آیات سے صاف ظاہر ہے کہ اِلٰہ سے مراد معبود ہے اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ سے اسی توحیدِ الوہیت کو پیش کیا جا رہا ہے جس کو سارے انبیاء نے تبلیغ کیا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہی مستحقِ عبادت ہے اسی کی عبادت کی جانی چاہیے۔ اسی سے فقر و ذلت کی نسبت جوڑنی چاہیے۔ افرادِ عبادت لِلّٰہ ہی تمام پیغمبروں کے پیام کا حاصل ہے یعنی صرف اللہ ہی اِلٰہ ہے، غیر اللہ بحیثیت اِلٰہ قلب سے فنا ہو جائے۔

دل عاشق روئے تست با عہد درست | جاں طالبِ وصلِ تست از روزِ نخست
آں کس کہ نہ جُست وصلِ تو ہیچ نیافت | واں کس کہ ترا یافت دگر ہیچ نجست

(شیخ عطارؒ)

توحید فی العبادت کی ضد تشریک فی العبادت! موحد اللہ ہی کو الٰہ مانتا ہے، یعنی اللہ ہی کی عبادت کرتا ہے اور مشرک غیر اللہ کو بھی الٰہ مانتا ہے اور اس کی بھی عبادت کرتا ہے۔ سورۂ انعام میں اٹھارہ پیغمبروں کے نام لے کر یعنی ابراہیم، اسحٰق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسمٰعیل، یسع، یونس علیہم السلام کا ذکر کر کے ارشاد ہوتا ہے کہ اگر یہ نفوسِ قدسیہ حق تعالیٰ کی عبادت میں کسی کو شریک کرتے تو ان کی ساری طاعتیں باطل ہو جاتیں کیونکہ شرک کے ساتھ کوئی عمل مقبول نہیں۔ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (پ ۱۵۶)

تصریحاتِ بالا سے یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اس عالم میں انسان کی تخلیق عبادت و معرفت کے لیے ہوئی ہے، اسی لیے تمام انبیاء و رسل توحید ہی کی دعوت کے لیے مبعوث ہوئے، انہوں نے بنی نوع انسان کو توحید فی العبادت کی طرف بلایا، شرک سے ڈرایا، ہر ایک نے بآواز بلند فرمایا:۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۔

نقطۂ ادوارِ عالم لَآ اِلٰہ　　انتہائے کارِ عالم لَآ اِلٰہ!

اور جب مقصودِ زندگی توحید فی العبادت ہے تو ہمیں عبادت کے مفہوم پر اچھی طرح غور کرنا چاہیے۔ شرک کی ماہیت کو بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیے تاکہ جس مقصد کے لیے ہم پیدا ہوئے ہیں اس کے تحقق میں کامیاب ہوں اور کامیاب عمل ہونا بغیر علمِ صحیح کے ممکن نہیں! یاد رکھو کہ یہ دو روزہ پُرفریب زندگی اپنے مختلف ادوارِ طفلی و جوانی و پیری کی مخصوص نعمتوں اور بلاؤں سے گزر کر بہت جلد ختم ہو جاتی ہے اور آخری دور میں پہنچ کر ہم بیدل کے الفاظ میں کہہ اٹھتے ہیں:۔

طفلی کہ زمانِ بازی می آراست　　دامن افشاند
انگاہ جوانی کہ داغش پیداست　　گل کرد و نماند
اکنوں پیری نفس شماری دارد　　بیدل چہ علاج
زیں نسخہ ہم آخر ورق چند بجاست　　باید گرداند

لیکن ورق الٹنے کے بعد قصہ ختم نہیں ہو جاتا۔ اب دنیوی زندگی کے اعمال کی جزا و سزا کا دور شروع

ہوتا ہے اور یا بدی ہے، اس کی انتہا نہیں، یہاں یا تو سکھ ہی سکھ ہے یا پھر دکھ ہی دکھ۔ توحید پر خاتمہ ہوا تو سوائے سکھ[1] کے کچھ نہیں اور اگر شرک پر[2] دم توڑا تو سوائے دکھ کے کچھ نہیں۔ اسی لیے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت داؤدؑ نے اپنی اولاد کو یہ نصیحت فرمائی تھی کہ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ!

اب ذرا عبادت کے تضمنات پر تفصیل سے غور کرو۔

لغت میں عبادت نام ہے "غایتِ تذلل" کا یعنی نہایت درجہ کی خاکساری و نیازمندی کا اور شرع میں عبادت مراد ہیں بندوں کے ان افعال و اقوال و احوال سے جن کا تعلق خاص طور پر حق تعالیٰ کی عظمت و جلالت کے ساتھ ہوتا ہے۔ عبادت اسمِ جنس ہے اس کی بہت ساری انواع ہیں

(۱) عبادتِ اعتقادی: یہ اصل ہے سب انواع کی، اس کا دوسرا نام "توحیدِ الوہیت" ہے، جیسا کہ اوپر بتایا گیا۔ محاورہ قرآن میں عبادت کے معنی اسی توحید کے ہیں۔ یہ اس امر کا اعتقاد ہے کہ اکیلا اللہ ہی الٰہ یعنی معبود و رب واحد احد ہے، وہی خالق ہے، اسی کی سب خلق ہے اور اسی کا امر، وہی مالک ہے وہی حاکم، اسی کے ہاتھ میں نفع و ضرر ہے، وہی مولیٰ ہے۔ اسی طرح الوہیت کے دوسرے لوازم کا اعتقاد۔ لہذا دعا، ندا، استغاثہ، استعانت، التجا، رجا، خوف سب صرف اللہ ہی سے ہوں، غیر اللہ سے نہ ہوں۔

(۲) عبادتِ لفظی: کلمۂ توحید لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا زبان سے اقرار جس نے دل سے اس کا اعتقاد رکھا لیکن زبان سے اقرار نہ کیا تو اس کا خون و مال محفوظ ہوگا اور جس نے

---

[1] ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملئکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون، نحن اولیاءکم فی الحیوۃ الدنیا و فی الاٰخرۃ ولکم فیہا ما تشتھی انفسکم ولکم فیہا ما تدعون، نزلا من غفور الرحیم (پ۲۴ ۱۸۶) جن لوگوں نے اقرار کرلیا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر مستقیم رہے، ان پر فرشتے اتریںگے، کہ تم اندیشہ نہ کرو اور نہ رنج کرو، اور تم جنت پر خوش رہو جس کا تم سے وعدہ کیا جایا کرتا تھا، ہم تمہارے رفیق تھے دنیوی زندگی میں اور عقبیٰ میں بھی رہیںگے اور تمہارے لیے جس چیز کو تمہارا جی چاہیگا موجود ہے اور نیز تمہارے لیے اس میں جو مانگوگے موجود ہے۔

[2] انہ من یشرک باللہ فقد حرم اللہ علیہ الجنۃ وماوٰہ النار (پ۶ ۱۴۶) جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک قرار دیگا سو اس پر اللہ جنت کو حرام کر دیگا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

زبان سے کہا اگر دل سے معتقد نہ ہوا تو اس کا خون و مال تو بچ گیا لیکن وہ منافق ہے اور اس کا حساب اللہ پر ہے۔

(۳) عبادت بدنی: جیسے قیام و رکوع و سجود نماز میں۔

(۴) عبادت صوم و افعالِ حج و عمرہ جیسے طواف، ذبح، نحر، حلق وغیرہ

(۵) عبادت مالی: حق تعالیٰ کے امتثال امر میں انفاق مثلاً زکوٰۃ، صدقہ۔

اسی طرح واجبات و مندوبات کی افعال و اقوال، اموال و ابدان میں اور انواع ہیں جو سب عبادت میں داخل ہیں، ان کا حصر یہاں ضروری نہیں، صرف امہاتِ عبادت کی یہاں تصریح کردی گئی۔ کلی طور پر یوں سمجھو کہ غیبی نفع کے لیے مخلوق جو کام کرتی ہے وہ عبادت ہے۔ اگر اس کی اجازت اللہ تعالیٰ نے دی ہے (اذِنَ بہ اللہ) ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے، اگر اس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی وہ (مالم یأذن بہ اللہ) ہے تو وہ غیر اللہ کی عبادت ہے۔

خوب سمجھ لو کہ شرک واقع ہوتا ہے عبادت کے ان ہی افعال اور عقائد میں۔ بنی نوعِ انسان کے اکثر افراد عبادت ہی کے معاملہ میں شرک میں گرفتار ہوتے رہے۔ انہوں نے غیر اللہ کو اپنا اِلٰہ یا معبود قرار دیا، اپنے نفع کے لیے ان کی مرضی کا اتباع کیا یعنی اپنا نافع و ضار سمجھا، باعتقاد نفع و ضر ان کی تعظیم کی، وقت حاجت ان سے فریاد رسی چاہی، ان سے استعانت کی، ان کو پکارا ان سے التجا کی، استغاثہ کیا، رجا و خوف کا تعلق ان سے رکھا، ان کی نذر و نیاز میں اپنے مال کا ایک حصہ صرف کیا اور ذبح و نحر سے ان کا تقرب چاہا۔ غرض فقر و ذلت کی نسبت ان سے جوڑی، ان کے سامنے خضوع کیا اور جب انبیائے کرام نے انہیں افراد عبادت اللہ کی دعوت دی، توحید فی العبادت کی تلقین کی انہیں للکارا کہ

تا چند گہ از چوب گہ از سنگ تراشی بگزر ز خدائے کہ بصد رنگ تراشی

تو ان مشرکین نے ازراہِ تکبر و عناد پلٹ کر پوچھا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا؟ (پ۸ ع۱۶) کیا تم اس لیے آئے ہو کہ ہم سے یہ کہو کہ ہم صرف اللہ ہی کی عبادت کریں اور اپنے

باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا، اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ (پ ۲۳ ع ۱۰)
یعنی بڑے تعجب کی بات ہے کہ سب معبودوں کو اس شخص نے تو ایک معبود کر ڈالا۔

دیکھو ان مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار نہیں کیا تھا، وہ اللہ تعالیٰ کے قائل تھے، مقر تھے اس پر ایمان رکھتے تھے، ان کو اس بات کا بھی اقرار تھا کہ اللہ ہی ہمارا خالق ہے لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (پ ۲۵ ع ۱۳) زمین و آسمان کو بھی اللہ ہی نے پیدا کیا ہے لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ۔ رزاق بھی وہی ہے، محی و ممیت بھی وہی اور مدبرامر بھی وہی؛ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (پ ۱۱ ع ۹) اسی کے ہاتھ میں تمام چیزوں کا اختیار ہے اور وہی ہر شئے کی پناہ گاہ ہے: قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ (پ ۱۸ ع ۵) وہی آسمانوں کا اور عرش عظیم کا مالک اور رب ہے: قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ، قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (پ ۱۸ ع ۵) زندگی گذارنے کے قانون میں اپنے کو آزاد سمجھتے تھے، ہدایت رب کا محتاج نہ جانتے تھے۔

فرعون جس کو کفر میں اتنا غلو تھا اس کے متعلق بھی حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی زبانی کہلوایا ہے۔ لقد علمت ما انزل ھؤلاء الا رب السمٰوٰت والارض بصائر (پ ۱۵ ع ۱۲) تو یہ خوب جانتا ہے کہ یہ عجائبات خاص آسمان و زمین کے پروردگار نے بھیجے ہیں جو کہ بصیرت کے لیے ذرائع ہیں، اور تمام مشرکین کے بارے میں ابلیس لعین تک نے کہا۔ انی اخاف اللہ رب العلمین۔ نیز رب انظرنی اور رب بما اغویتنی؛

صاف ظاہر ہے کہ ان مشرکین کا جرم "اشراک فی الذات" نہیں تھا، یعنی یہ اللہ کی ذات کے برابر کسی غیر کو واجب الوجود یا ازلی و ابدی نہیں مانتے تھے، اور نہ ان کو اللہ تعالیٰ کی الوہیت سے انکار تھا سوائے ثنویہ کے دنیا میں کوئی فرقہ اس کا قائل ہی نہیں ملتا مشرکین مکہ توحید ربوبیت تک کے مقر

تھے۔ وہ حق تعالیٰ کی خالقیت اور رزّاقیت، مالکیت وحاکمیت و ربوبیت کو مانتے تھے اور غیر اللہ کو حق تعالیٰ ہی کا مربوب، مرزوق، مخلوق مملوک ومحکوم جانتے تھے چنانچہ وہ اپنے تلبیہ میں کہتے تھے۔ لبیك لا شریك لك الا شریك هو لك تملكه وما ملك یعنی "اے اللہ میں تیری خدمت میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ شریک کہ تو اس کا مالک ہے اور وہ کسی شئے کا مالک نہیں۔"

اس طرح وہ نہ صرف حق تعالیٰ کے وجود کا اقرار کر رہے ہیں بلکہ اسی کو مالک وحاکم قرار دے رہے ہیں اور اسی کی ربوبیت کے قائل ہو رہے ہیں لیکن باوجود اس اعترافِ وجود باری اور اس کی الوہیت و ربوبیت کے انہیں کافر و مشرک کیوں ٹھہرایا گیا، ان کے تمام نیک اعمال کیوں حبط اور برباد قرار دیے گئے۔ خلود فی النار کی وعید ان کو کیوں سنائی گئی؟ ان کا یہ ایمان باللہ" کیوں ان کی جان ومال کو مسلمانوں کے ہاتھ سے محفوظ نہ کر سکا؟ اس ایمان کے باوجود "اعداء اللہ" کیوں قرار پائے؟ ان کو کذاب، مسحور، ظالم کیوں کہا گیا؟ ان کا شمار "هالکین" میں کیوں ہوا؟ انہیں بے عقل حیوان بلکہ ان سے بدتر کیوں ثابت کیا گیا؟ اِنۡ هُمۡ اِلَّا كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ سَبِيۡلًا؟ کا فیصلہ ان کے متعلق کیوں فرمایا گیا؟

اس کا جواب تم اوپر پڑھ چکے ہو وہ ایک لفظ میں صرف یہ ہے: اشراک فی العبادۃ! ہر قوم اور ہر امت کے لیے ایک نبی مبعوث ہوا اور اس نے "توحید فی العبادت" ہی کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی: ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ (پ ۶) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لوگوں کو افراد عبادت الٰہی کی طرف بلایا کہ جس طرح تم افراد ربوبیت کے مُقِر ہو، اللہ ہی کو رب جانتے ہو، اسی طرح اللہ ہی کو معبود جانو۔ لا الٰہ الا اللہ کے قائل ہو جاؤ، اس کے معنی ومقتضیٰ پر عمل کرو: اللہ کے سوا کسی کو نہ پکارو، تمہاری ساری عبادت سرًّا وعلانیۃً قلبی وقالبی طور پر خالص اللہ کے واسطے ہو۔ استعانت ہو یا استغاثہ، ذبح ہو یا نذر، دعا ہو یا عکوف، طواف ہو یا کوئی عبادت یا پرستش کی کوئی سی شکل صرف اللہ ہی کے لیے مخصوص ہو

اس وقت غیر کا تصور بھی تمہارے ذہن میں نہ آئے! تم اللہ ہی کے فقیر ہو، ذل و افتقار کی نسبت اللہ ہی سے جوڑلو، جھوٹے معبودوں سے اپنی بندگی کی نسبت قطعاً توڑلو، ان سے نفع وضرر کی توقع مطلقاً چھوڑ دو، اللہ تمہارے لیے ہر حال کافی ہے۔ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ تمہیں صرف اللہ ہی کا ہو کے رہنا چاہیے۔ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

با خلق آشنا نہ شود مبتلائے تو ۔۔۔ بیگانہ باشد از ہمہ کس آشنائے تو

میخواہم از خدا بدعا صد ہزاراں جاں ۔۔۔ تا صد ہزار بار بمیرم برائے تو

مشرکین نے اس پیغام کو سن کر کہا دیکھو ہم اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل ہیں، اس کا انکار نہیں کرتے اپنے بتوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر نہیں جانتے بلکہ ان کو اللہ ہی کا مخلوق اور بندہ مانتے ہیں اللہ ہی کو مالک و حاکم و رب سمجھتے ہیں، مستقل معبود بھی اللہ ہی کو جانتے ہیں اور اپنے بتوں کو اللہ ہی کی ملک سمجھتے ہیں، ہم ان کو محض اپنا "شفیع" (وکیل اور سفارشی) جانتے ہیں۔ ہم ان کی عبادت اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ اپنی وجاہت کی وجہ سے ہماری سفارش یا "شفاعت" اللہ تعالیٰ کے پاس کر سکتے ہیں ھٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰہِ (پ۱۱ ع۶) ان کی عبادت ہمیں اللہ تعالیٰ کی ناراضی و خفگی سے چھڑا کر اس کا قرب عطا کر سکتی ہے۔ مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی (پ۲۳ ع۱۵) یہی ان کا کذب، کفر اور شرک تھا! اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ کَاذِبٌ کَفَّارٌ (پ ۶) سُبْحٰنَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ (پ ۶)

اب ذرا اسی موقع پر تحقیق کر لو کہ ان مشرکین کے معبود کون تھے جن کو وہ شفیع اور مقرب سمجھ رہے تھے؟ امام فخر الدین رازیؒ نے "تفسیر کبیر" میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے ان کی تحقیق کی رو سے بت پرستوں (عابدان اوثان) کے دین سے کوئی دین قدیم نہیں کیونکہ انبیاء میں سب سے پہلے نبی جن کی تاریخ ہم تک پہنچی ہے وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں اور جب انہوں نے ان بت پرستوں کو توحیدِ معبودیت کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا اعبدوا اللّٰہ واتقوہ واطیعون (پ۲۹ ع۹) تو ان بت پرستوں نے ان کی دعوتِ شب و روز کے جواب میں اپنے ساتھیوں سے کہا کہ

لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا یعنی تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور نہ ود کو اور سواع کو اور نہ یغوث کو اور یعوق کو اور نسر کو چھوڑنا" (پ ۱۰۶)

اب ان کے یہ معبودانِ باطل ود و سواع وغیرہ کون تھے؟ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم[1] نے نشان دہی کی ہے کہ یہ حضرتِ نوح علیہ السلام کی قوم کے چند نیک بخت اور بزرگ لوگ تھے، ان کی موت کے بعد ان کے بیٹھنے کی جگہ پر ان کے نشان قائم کیے گئے، ان کا بھی وہی نام رکھا گیا اور پھر کچھ عرصہ بعد ان نشانوں کی پرستش شروع کر دی گئی۔ اعتقاد یہ تھا کہ جس طرح یہ بزرگ زندگی میں مجاب الدعا رہے ہیں، روز حشر بھی مقبول الشفاعت رہیں گے، اور اللہ تعالےٰ کے ہاں ہماری شفاعت کریں گے۔ ان ہی کے حال کی خبر ہمیں اس آیت میں دی گئی ہے:۔

يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا	یعنی یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت
يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ	کرتے ہیں جو نہ ان کو ضرر پہنچا سکیں اور نہ ان کو نفع
هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ	پہنچا سکیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہمارے
اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي	سفارشی ہیں آپ کہہ دیجیے کہ کیا تم خدا کو ایسی چیز کی خبر
السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ	دیتے ہو جو خدا کو نہیں معلوم، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین
وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (پ ۶، ۷)	میں وہ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے

اس تحقیق سے صاف ظاہر ہے کہ بت پرست اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بالاستقلال بتوں کو معبود نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کی بت پرستی کا منشا اولیا و انبیاء وغیرہ کی تعظیم تھی۔ انہوں نے اپنے بتوں کو انہی کی صورت پر تراشا، اور انہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنا شفیع سمجھ کر اپنا سر نیاز ان کے سامنے جھکاتے تھے۔ اس طرح وہ اصل میں ولی پرست، صالح پرست اور نبی پرست تھے! اب ذرا فخر رازی کی عبارت بھی سن لو جو اوپر کی آیت کی توجیہ و تفسیر میں انہوں نے لکھی ہے۔

انھم وضعوا ھذہ الاصنام والاوثان	یعنی بت پرستوں نے یہ اصنام و اوثان اپنے انبیاء و
علیٰ صور انبیاءھم واکابرھم وزعموا	اکابر کی صورتوں پر تراشے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ

[1] رواہ البخاری۔

انھم متی اشتغلوا بعبادۃ ھذہ التماثیل	جب ہم ان کی عبادت میں مشغول ہونگے تو یہ اکابر
فان اولئک الاکابر تکون شفعاء ھم	اللہ کے پاس ہماری شفاعت کرینگے اس کی نظیر
عند اللہ تعالیٰ ونظیرہ فی ھذا الزمان	اس زمانہ میں اکثر لوگوں کی اپنے بزرگوں کی قبروں
اشتغال کثیر من الخلق بتعظیم قبور	سے مشغولیت ہے اس اعتقاد سے کہ اگر ہم ان
الاکابر علی اعتقاد انھم اذا عظموا قبورھم	قبروں کی تعظیم کرینگے تو یہ اللہ کے نزدیک ہمارے
فانھم یکونون شفعاء لھم عند اللہ [1]	شفیع ہونگے۔"

اوپر کی توضیحات سے مندرجۂ ذیل چار امور صاف طور سے لازم آتے ہیں۔ انہیں خوب ذہن نشین کر لو:۔

(۱) زمانۂ قدیم کے بت پرست حقیقت میں انبیاء پرست اور اولیاء پرست تھے۔ حق تعالیٰ نے انہیں "مشرک" قرار دیا۔

(۲) وہ خود اس امر کے قائل تھے کہ بت ہمارے بالاستقلال معبود نہیں بلکہ بالاستقلال ہمارا معبود اللہ ہی ہے اور یہ صرف ہمارے سفارشی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو شفیع یا سفارشی جان کر بھی اس کی عبادت کرنا موجبِ شرک ہے (یعنی کسی کو سفارشی یا شفیع سمجھنا یہ شرک نہیں ہے بلکہ ان کی عبادت اس لیے کرنا کہ ہماری سفارش کرینگے یہ شرک ہے۔)

(۳) جو افعالِ عبادت ان مشرکین سے صادر ہوئے اگر کسی کلمہ گو سے بھی صادر ہوں تو اس پر بھی شرک کا اطلاق کیا جائیگا اور اس کا دعوئے اسلام اور اس کی کلمہ گوئی اطلاقِ شرک سے مانع نہ ہوگی چنانچہ اسی وجہ سے امام رازیؒ نے گور پرستوں کو بت پرستوں کا نظیر قرار دیا۔

(۴) جب غیر اللہ کو شفیع جان کر ان کی عبادت کرنا شرک ہوا تو پھر ان کو بالاستقلال عالم میں متصرف جان کر پوجنا تو بدرجۂ اولیٰ شرک ہوگا۔ مثلاً اولیاء و انبیاء سے اولاد مانگنا، رزق کی کشادگی چاہنا، قضاءِ حاجات کی دعا کرنا وغیرہ۔

[1] تفسیر کبیر ج ۴ ص ۵۵۲ سورہ یونس تحت آیہ ھٰؤلاء شفعاء نا عند اللہ۔

مشرکین کی عبادت بس یہی تھی کہ وہ اپنے اصنام واوثان (غیر اللہ) کو مقرب و شفیع اور نافع وضار جان کر ان کے سامنے ذلیل وخوار بن کر کھڑے ہوتے اور

(۱) ان سے وقت حاجت فریاد رسی چاہتے تھے یعنی ان کو پکارتے یا استغاثہ کرتے تھے۔

(۲) اپنے مال کا ایک حصہ ان کی نذرونیاز کے لیے صرف کرتے تھے، ان سے منتیں مانگتے ان کے لیے جانور ذبح کرتے اور ان کے اردگرد پھرتے یا طواف کرتے تھے۔گو وہ حق کی ربوبیت کے قائل تھے اور اس کو خالق ورازق، محی وممیت، مدبر زمین وآسمان مانتے تھے: وما یومن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون!

اب قرآن کریم کی طرف رجوع کرو اور دیکھو کہ ندا، دعا، استغاثہ، استعانت، نذر، طواف وغیرہ سب افعال عبادت ہیں، جب حق تعالیٰ ہی معبود و رب واحد واحد ہیں تو پھر ان افعال کا تعلق صرف انہی سے ہونا چاہیے اور کسی غیر سے نہیں اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا (پ ۵ ۳۶) یہی ہے "افراد عبادت للہ" فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ، اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ[۱] (پ ۲۳ ۵۶) مشرکین نے ان کا تعلق غیر اللہ سے روا رکھا تھا اور اسی لیے انہیں تہدید کی گئی تھی کہ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یعنی تم جانتے ہو کہ حق تعالیٰ کا کوئی ند، ہمسر نہیں پھر تم کیوں غیر اللہ کی عبادت کرکے ان کو معبود قرار دے کر انہیں حق تعالیٰ کا ہمسر بنا رہے ہو؟ تمہارا یہ عقیدہ کہ اگر تم ان کا تقرب ندا ودعا، نذرونیاز، ذبح ونحر، طواف وعکوف کے ذریعہ حاصل کرو گے تو یہ تمہیں حق تعالیٰ کے "قریب" کر دینگے اور تمہارے شفیع بن جائینگے قطعاً باطل ہے کفر بحت ہے، شرک محض ہے!

دعا عبادت ہے دعا، دعوت، دعایۃ، دعوی کے معنی ندا یا پکارنے کے ہیں۔ اس پر ائمہ لغت کا اجماع ہے۔ چنانچہ امام راغب نے اپنی مفردات میں تصریح کی ہے کہ الدعاء کالنداء یعنی دعا ندا کے معنی میں ہے۔ صراح میں بھی دعا بمعنی خواندن ہے۔ مدارک میں ندا اور دعا کا فرق وامتیاز اس طرح ظاہر کیا گیا ہے: النداء مایسمع والدعاء قد یسمع وقد لا یسمع۔ اس سے دعا وظیفہ لسانی قرار پاتی ہے۔ مجمع البحار میں بتلایا گیا ہے

[۱] سو آپ خالص اعتقاد کرکے اللہ کی عبادت کرتے رہیے، یاد رکھو عبادت جو کہ خالص ہو اللہ ہی کے لیے سزاوار ہے۔

کہ الدعاء الغوث یعنی دعا فریاد کرنا اور دہائی مانگنا ہے اور بطور شہادت آیت اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ پیش کی ہے اور اس کے معنی اس طرح کیے ہیں: ای استغیثوا اذا نزل بکم الضر یعنی جب تم پر کوئی مصیبت نازل ہو تو مجھ سے فریاد رسی چاہو۔ قرآن کریم کی اس آیت سے بھی وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ دعا کے معنی پکارنے کے ثابت ہوتے ہیں۔ نیز اس آیت سے لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا۔ اگر یہاں دعا کے معنی عبادت کے لیے جائیں (جیسا کہ بعض کا زعم ہے) تو لازم آتا ہے کہ صحابہؓ ایک دوسرے کی عبادت کرتے تھے۔ وحاشا ھو عن ذٰلك۔

دعا شرع میں عبادت کا حکم رکھتی ہے کیونکہ اس سے عجز عباد، اور قدرت رب العباد، کا اظہار ہوتا ہے، مانگنا، گڑگڑانا، عجز کا ظاہر کرنا لوازمِ عبودیت سے ہے جس طرح عظمت و کبریا، ہیبت و قدرت، جلال و استغنا لوازم معبودیت سے ہیں۔ لوازم عبودیت ظاہر ہے کہ عبادت ہیں۔ چنانچہ صاحب تفسیر نیشاپوری نے اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ کے ذیل میں خوب تصریح کردی ہے۔

اعلم ان الدعاء مصدر، دعوت ادعو، وقد تکون اسما تقول سمعت دعاءً کما تقول سمعت صوتاً، وحقیقة الدعاء استدعاء العبد ربہ جل جلالہ العنایة والاستمداد والمعونة، وقال جمهور العقلاء: ان الدعاء من اعظم مقامات العبودیة وانہ من شعائر الصالحین ودأب الانبیاء والمرسلین والقرآن ناطق بصحتہ عن الصدیقین والاحادیث مشحونة بالادعیة الماثورة بحیث لامساغ للانکار ولا مجال للعناد" (مطبوعہ ایران ۱۲۸۰ھ ج ۱ ص ۱۹۳)

"خلاصہ یہ کہ دعا، مصدر ہے اور کبھی اسم بھی ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ میں نے دعا، کو سنا جس طرح کہ آواز کو سنا اور دعا کی حقیقت یہ ہے کہ عبد اپنے رب سے استدعا کرتا ہے اور اس مدد و معونت و عنایت کا خواستگار ہوتا ہے۔ جمہور عقلاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ دعا بلند ترین مقامات عبودیت سے ہے یہ صالحین کا شعار اور انبیاء و مرسلین کا طریقہ رہا ہے۔ قرآن ناطق ہے کہ وہ صدیقین سے ثابت ہے، اور احادیث ادعیۂ ماثورہ سے بھری ہوئی ہیں، یہاں مجال انکار نہیں"

جب دعا عبادت ہے تو پھر غیر اللہ سے دعا کرنا شرک صریح قرار پائیگا لیکن قرآن کریم نے مخلوق سے مدد و معونت اور استغاثہ اس صورت میں جائز رکھا ہے کہ جب یہ ایسے امور میں کیا جائے جو ان کی قدرت و قوت کے احاطہ میں ہوں، دیکھو قرآن میں اس اسرائیلی کا قصہ مذکور ہے جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کسی قبطی کے خلاف استغاثہ کیا تھا۔ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِي مِنْ شِيعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ[1] (پ ۲۰) کسی دوسری جگہ دین کے کاموں میں مدد چاہنا اور مدد دینا واجب قرار دی گئی ہے: وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ[2] (پ ۱۰) اسی طرح نیکی اور تقوٰی میں استعانت کا حکم دیا گیا ہے: تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ[3] (پ ۶) جب مظلوم کسی ظالم کے خلاف حاکم کے پاس فریاد کرتا ہے، یا بیمار حکیم سے کہتا ہے کہ تم میرا علاج کرو یا کسی مقدمہ میں وکیل سے مدد لیجاتی ہے تو اس طرح کی استعانت و استغاثہ منع نہیں۔ اسباب دنیویہ کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ مامور بہ ہے لیکن بنیادی عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اسباب بالذات مؤثر نہیں حق تعالیٰ ہی ان میں اثر پیدا کرتے ہیں، ہر چیز اپنے اثر کے ظہور میں اللہ تعالیٰ کے اِذن کی محتاج ہے۔ یہ عقیدہ باطل ہے کہ اشیاء کی وجود بخشی کے وقت ہی ان میں اثرات رکھ دیے گئے ہیں اور اسی راہ سے وہ اثر کرتی ہیں اور اب حق تعالیٰ کے حکم و امر کی حاجت نہیں، یا ان میں یہ قوت ہے کہ کبھی بھی اپنے آثار و احکام سے تخلف نہ کریں! دیکھو جب حضرت ابراہیمؑ آگ میں ڈالے گئے تو حق تعالیٰ نے آگ میں اثرِ احراق پیدا نہ کیا اور نہ جلے!

غرض آثارِ اشیاء حق تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہیں اور بارانِ صفت اشیاء پر برستے رہتے ہیں۔ اسی طرح مخلوق میں فعل کی جو قدرت ہوتی ہے وہ فعل کے وقت ہی عنایت ہوتی ہے اور اس سے فعل کا صدور ہوتا ہے، یہ نہیں کہ فعل کی قدرت پہلے ہی سے مخلوق میں موجود ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے افعال پر قادر ہے اور خالق کا محتاج نہیں، ورنہ یہ لازم آئیگا کہ تمام مخلوقات وجود میں آنے

---

[1] سو وہ جو ان کی برادری کا تھا اس نے موسیٰؑ سے اس کے مقابلہ میں جو کہ ان کے مخالفین میں سے تھا مدد چاہی۔
[2] اگر وہ تم سے دین کے کام میں مدد چاہیں تو تمہارے ذمہ مدد کرنا واجب ہے۔
[3] نیکی اور تقوٰی میں ایک دوسرے کی اعانت کرتے رہو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی اعانت مت کرو۔

کے بعد حق تعالیٰ سے مستغنی ہوں اور بے پرواہ، مستقل ہوں اور غیر محتاج، واللازم باطل فالملزوم مثلہ

ملا علی قاریؒ نے شرح فقہ اکبر میں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا ہے :-

ثم اعلم ان ارادة العبد التی تقارن — یعنی جان لینا چاہیے کہ بندہ کا ارادہ جو فعل کے ساتھ

فعلہ و قدرتہ علیہ حال صنعہ — ہوتا ہے اور اس فعل کی قدرت وقت وقوع فعل

مخلوقتان مع الفعل لا قبلہ ولا بعدہ — دونوں فعل کے ساتھ ہی مخلوق ہوتے ہیں نہ پہلے ہوتے ہیں نہ بعد۔

یعنی ارادہ، قدرت اور فعل سب مخلوق الٰہی ہیں، یہی عقیدہ ہے اہل سنت وجماعت کا، اور مبنی ہے اس آیتِ صریح پر: واللہ خلقکم وما تعملون (پ ۲۳ ع ۷) نیز اس آیت پر ماتشاؤن الا ان یشاء اللہ (پ ۲۹ ع ۲۶) نیز لا قوة الا باللہ پر۔

اس طرح عقیدہ کی تطہیر ہونے کے بعد ہی یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا نہ کوئی مغیث ہے اور نہ غیاث، نہ کوئی معین ہے اور نہ مستعان، ہماری ہر فریاد رسی علی الاطلاق حق تعالیٰ ہی سے ہے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک منافق تھا جو مسلمانوں کو دق کیا کرتا تھا حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا چلو حضرتؐ سے استغاثہ کریں۔ آپ نے سن کر فرمایا کہ مجھ سے استغاثہ نہ کرنا چاہیے استغاثہ تو اللہ ہی سے کرتے ہیں (رواہ الطبرانی) اگر کسی غیر کے ہاتھ سے کوئی چیز حاصل ہو جائے تو وہ مجاز ہے نہ کہ حقیقت، کیونکہ حقیقت اللہ ہی کے لیے ہے اور اسی کا اسم مبارک غیاث ومغیث ہے تاہم امورِ اختیاریہ میں خلق سے استعانت جائز ہے مگر اسی عقیدہ کے ساتھ جس کا ابھی ذکر ہوا۔

جن امور میں سوا حق تعالیٰ کے کسی اور کو قدرت نہیں ان میں کسی اور کو پکارنا اور ان سے استغاثہ کرنا، یا اعانت چاہنا حرام یا شرک ہے جیسے رزق کا دینا[1]، مینہ کا برسانا[2]، بیمار کو شفا بخشنا[3]، ہدایت کرنا[4]، گناہ کا بخشنا[5] وغیرہ۔ اب پہلے بعض ان آیات قرآنی پر بھی غور کرلو جن سے دعا کا عبادت ہونا صاف

---

[1] ھل من خالق غیر اللہ یرزقکم من السماء والارض۔ [2] وھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمتہ۔ [3] واذا مرضت فھو یشفین۔ [4] انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء۔ [5] ومن یغفر الذنوب الا اللہ۔

ثابت ہوتا ہے۔

دیکھو حق تعالیٰ اپنے بندوں کو دعا کا حکم فرما رہے ہیں۔ اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (پ ۸ ع ۱۴) دوسری جگہ ارشاد ہے: وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (پ ۸ ع ۱۴) ان آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں سے دعا چاہتے ہیں، اسی سبب سے دعا عبادت ہے۔ اس کی مزید توثیق اس امر سے ہوتی ہے کہ غیر کو پکارنے سے منع فرما رہے ہیں فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (پ ۲۹ ع ۱۱) وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (پ ۱۱ ع ۱۶) پھر دعا کو اپنے ہی لیے مخصوص کر رہے ہیں۔ لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ (پ ۱۳ ع ۸) اس طرح اثباتاً و نفیاً دعا کو حق تعالیٰ اپنی ہی ذات کے لیے مخصوص فرما رہے ہیں اور اپنے سوا کسی کو اس کے لائق نہیں قرار دے رہے ہیں یعنی منادیٰ صرف حق تعالیٰ ہی ہیں! پھر دعا کا حکم دے کر اس کو صاف طور پر عبادت قرار دیا گیا ہے: اُدْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (پ ۲۴)

اسی طرح جب دعا کا عبادت ہونا آیاتِ قرآنیہ سے ثابت ہوا تو اب احادیثِ نبویہ پر ایک نظر ڈالو، جو دعا کو عینِ عبادت قرار دے رہی ہیں۔

(۱) عن نعمان بن بشیر قال قال رسول اللہ صلعم: الدعاء هو العبادة" ثم قرأ و قال ربكم ادعونی استجب لكم (رواہ احمد والترمذی وابو داؤد والنسائی وابن ماجہ) یعنی دعا عبادت ہی تو ہے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی ادعونی استجب لکم۔ اس آیت کے پڑھنے سے مراد یہ ہے کہ دعا کے عبادت ہونے کا سبب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کا حکم کیا ہے۔

(۲) عن انس قال قال رسول اللہ صلعم "الدعاء مخ العبادة" (رواہ الترمذی) یعنی دعا مغز ہے عبادت کا، جس طرح مغز شے، شی کی حقیقت ہوتا ہے اسی طرح دعا یعنی خضوع و خشوع و تذلل کے ساتھ پکارنا عبادت کی حقیقت ہے اور اس لیے مخصوص ہے حق تعالیٰ ہی کے ساتھ جو مجیب الدعوات ہیں۔

لے تم لوگ اپنے پروردگار سے دعا کیا کرو تذلل ظاہر کرتے بھی اور چپکے چپکے بھی اور واقعی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو نا پسند کرتے ہیں

(۳) عن ابی ھریرة قال قال رسول اللہ صلعم: من لم یسأل اللہ یغضب علیہ (رواہ الترمذی) یعنی جو اللہ سے نہ مانگے اس سے اللہ ناراض ہوتا ہے، جب اللہ سے نہ مانگنا غصہ کا باعث ہوتا ہے تو اس سے نہ مانگ کر اوروں سے مانگنا تو اور زیادہ غضب ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دعا اللہ تعالیٰ کو کس قدر محبوب ہے۔

جب دعا کا عبادت ہونا ثابت ہوگیا تو اب صاف ظاہر ہے کہ غیر اللہ سے دعا مانگنا شرک ہے، شرک فی العبادت ہے۔ اس مقصد کے لیے آیاتِ قرآنیہ کا پیش کرنا ضروری نہیں لیکن مزید تقویت کے لیے چند آیات پر غور کرلو:

(۱) وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنْفَعُکَ وَلَا یَضُرُّکَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّکَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیْنَ یعنی مت پکار اللہ کے سوا ایسے کو کہ نہ بھلا کرے تیرا اور نہ نقصان پھر اگر تو ایسا کرے تو تو بھی اسی وقت ظالموں میں ہو جائیگا۔ (پ ۱۱ ع ۱۶)

جلبِ منفعت و دفعِ مضرت کے لیے غیر اللہ کو دور دور سے پکارنا، اپنی حاجتوں اور ضرورتوں کو ان سے عرض کرنا اور اس طرح ان کی پرستش کرنا بڑے ظلم وستم کی بات ہے، کیونکہ جس اللہ کی قدرت میں بندہ کا نیک و بد، نفع و نقصان سب کچھ ہے اس پروردگار کو چھوڑ کر، اس سے منہ موڑ کر ایسی ہستیوں کی طرف متوجہ ہونا اور ذلت و فقر کی نسبت ان سے جوڑنا جو نہ کسی کے نفع پر قادر ہیں اور نہ نقصان پر، اس سے بڑھ کر دنیا میں ظلم و ستم کیا ہو سکتا ہے! شرک ہی سب سے بڑا ظلم ہے: اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (پ ۲۱ ع ۱۱)

یہاں ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے، بعض مفسرین نے "دون اللہ" اور "غیر اللہ" کی توجیہ میں اصنام و اوثان کا ذکر کر دیا ہے۔ اس لیے بعض شرک پسندوں نے یہ سمجھ لیا کہ شرک اس وقت ہوگا جب بتوں سے دعا کی جائے۔ انبیاء و اولیاء سے دعا کرنا، مرادیں مانگنا شرک نہیں۔ یہ صریحاً غلط ہے اور اس کی دو وجہیں ہیں۔

(۱) علمِ اصول کا یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ "العبرة بعموم الالفاظ لا بخصوص المورد" یعنی اعتبار

عمومِ الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوصِ موارد کا، غیر اللہ اور دون اللہ دونوں عام الفاظ ہیں۔ اللہ کے سوا جتنی مخلوقات ہیں سب ان میں داخل ہیں، خواہ ولی نبی ہو یا بھوت پری۔ چنانچہ بیضاوی اس آیت کی تفسیر میں کہ قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُم مِّن دُونِهِ لکھتے ہیں کہ قل ادعوا الذین زعمتم انھم الھۃ من دونہ کالملئکۃ والمسیح وعزیر۔ یعنی ان لوگوں کو پکارو جن کو تم نے معبود سمجھ رکھا ہے اللہ کے سوا جیسے ملائکہ، مسیح و عزیرؑ۔ اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جو ملائکہ اور انبیاء کو پکارے وہ بھی مشرک ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی ویسی ہی زجر و توبیخ کی ہے جیسی کہ بت پرستوں کی کی ہے۔ اس عمومِ الفاظ کے اعتبار سے صاحب جلالین نے اکثر مقامات پر دون اللہ کا ترجمہ غیر اللہ سے کیا ہے۔

(۲) جیسا کہ ہم نے اوپر تصریح کی ہے، کفار نے اپنے بت اپنے اکابر (انبیاء و اولیاء) ہی کے نام پر تراشے تھے اور ان کی بت پرستی کا منشا ان ہی اکابر کی تعظیم تھی، لہٰذا وہ دراصل پتھروں اور درختوں کی عبادت نہیں کر رہے تھے بلکہ انبیاء و اولیاء و صلحاء کو پوج رہے تھے۔

غرض غیر اللہ و دون اللہ سے مراد نہ صرف بت ہیں بلکہ انبیاء و اولیاء سب اس میں شامل ہیں۔ اعتبار عمومِ الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص موارد کا۔ اور عقلاً غور کرو کہ انبیاء و اولیاء غیر اللہ ہیں کہ عین اللہ؟ جب غیر اللہ کی عبادت شرک ہے تو صنم و وثن، نبی و ولی، پیر، شہید، بھوت، پری سب حرمتِ عبادت میں مساوی ہیں اور ان میں تفریق باطل ہے۔ اگر ہم تفریق کے قائل ہو جائیں کہیں کہ عبادت من دون اللہ کی حرام و شرک ہے بخلاف عبادت اولیاء و انبیاء کے تو لازم آتا ہے کہ انبیاء اور اولیاء عین اللہ ہیں اللازم باطل فالملزوم مثلہ۔

(۱) إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ فَادْعُوهُمْ فَلْيَسْتَجِيبُوا لَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (پ ۹ ع ۱۴) یعنی واقعی تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں سو تم ان کو پکارو، پھر ان کو چاہیے کہ تمہارا کہنا کر دیں اگر تم سچے ہو!

اس آیت میں اس امر کی صاف طور پر تصریح ہے کہ مشرکین اللہ کے سوا بعض اولیاء

انبیاء اور ملائکہ کو دفعِ مضرت و جلب منفعت کے لیے پکارا کرتے تھے اس لیے ان سے کہا گیا کہ جن کو تم امداد کے لیے پکارتے ہو وہ بھی تمہارے مانند بندے ہیں محض اصنام و اوثان پر عباد کا اطلاق نہایت بعید معلوم ہوتا ہے اور اگر مجازاً اصنام بھی مراد لیں تو امثالکم کا لفظ اس سے ابا کرتا ہے۔ اسی لیے مقاتل رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ مراد ان عباد سے ملائکہ ہیں اور اس آیت کے مخاطب وہ ہیں جو ملائکہ کو پوجتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مقبول بندوں سے دعا کرنے والا بھی مشرک ہے اور مردود، اس لیے کہ وہ من دون اللہ سے دعا کرتا ہے اور مِن دُوْنِ اللہ عام ہے اور اس میں تمام مخلوقات شامل ہیں، مقبول ہوں یا مردود۔

(۲) قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ فَلَا یَمْلِکُوْنَ کَشْفَ الضُّرِّ عَنْکُمْ وَلَا تَحْوِیْلًا۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّھِمُ الْوَسِیْلَۃَ اَیُّھُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَہٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَہٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ کَانَ مَحْذُوْرًا۔ یعنی جن کو تم خدا کے سوا قرار دے رہے ہو ذرا ان کو پکارو تو سہی سو وہ تم سے نہ تکلیف کو دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں نہ ان کے بدل ڈالنے کا، یہ لوگ جن کو مشرکین پکار رہے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کی طرف ذریعہ ڈھونڈھ رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب بنتا ہے اور وہ اس کی رحمت کے اُمیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں"۔

اس آیت میں اس امر کی خوب تصریح کی گئی ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو قدرت نہیں کہ کسی کی مصیبت اور تکلیف کو دور کر سکے یا اس کو راحت و نعمت میں بدل دے، کوئی نبی، ولی، فرشتہ وغیرہ کسی کی مصیبت و ضرر کو دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اور یہ احمق مشرک جن ہستیوں کو اچھے بُرے کا مختار جان کر پکارتے ہیں ان کا خود یہ حال ہے کہ وہ حق تعالیٰ ہی سے اُمید رکھتے ہیں اور اسی کے عذاب سے لرزاں و ترساں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سے مراد خدا کے مقبول بندے ہیں نہ کہ اصنام و اشرارِ عباد، کیونکہ حق تعالیٰ سے اُمید و رجا رکھنا، اس کے قرب کا طالب ہونا اشرار سے ممکن نہیں اور اصنام سے تو اور زیادہ غیر ممکن ہے پھر جب مقبول بندوں کو پکارنے اور ان سے اپنے مصائب کا دفعیہ چاہنے والوں پر یہ عتاب ہو رہا ہے تو مردودین کے

ماننے والوں کا کیا حال ہوگا۔

تفسیرِ بیضاوی میں اس آیت کی تفسیر یوں کی گئی ہے۔ قل ادعوا الذین زعمتم انھم الھۃ من دونہ کالملائکۃ والمسیح وعزیر، فلا یملکون فلا یستطیعون کشف الضر عنکم کالمرض والفقر ولا تحویلا ولا تحویل ذلک منکم الی غیرکم[۱] دیکھو بیضاوی نے صراحت کردی ہے کہ ملائکہ اور مسیح اور عزیر تک کشف ضر یعنی مرض وفقر وقحط یا مصائب وآفات کے رفع کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ اس کو بطور خود پھیر سکتے ہیں۔ جب ان ابرارِ کبار کا یہ حال ہو تو ان سے کم درجے کے لوگوں کا کیا پوچھنا!

(۳) یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَہٗ ؕ وَاِنْ یَّسْلُبْھُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْہُ مِنْہُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۔ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ (پ ۱۷ ع ۱۰) یعنی اے لوگو! ایک عجیب بات بیان کی جاتی ہے اس کو کان لگا کر سنو، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن کو تم لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو، وہ ایک مکھی کو تو پیدا کر ہی نہیں سکتے گو سب کے سب بھی جمع ہو جائیں اور اگر ان سے مکھی کچھ چھین لے جائے تو اس کو اس سے چھڑا نہیں سکتے، ایسا عابد بھی لچر اور ایسا معبود بھی لچر، ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسی تعظیم کرنا چاہیے تھی وہ نہ کی۔ اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا سب پر غالب ہے۔"

ان آیات سے یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ حق تعالیٰ کے سوا کسی سے دعا مانگتے اور اس کی عبادت کرتے ہیں وہ صریح گمراہی اور ضلالت میں مبتلا ہیں، ان کا مذہب باطل ہے، کیونکہ

(۱) جن کی یہ عبادت کر رہے ہیں خواہ وہ اصنام ہوں یا ملائکہ عظام یا انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام وہ ایک مکھی تک کو پیدا نہیں کر سکتے، پھر ان سے کسی ایک چیز کا مانگنا اور اس کے لیے

[۱] تفسیر بیضاوی ص ۲، ۷ مطبوعہ دار الطباعۃ عامرہ قسطنطنیہ ۱۳۰۳ھ

اُر گڑگڑانا جس کو پیدا کرنے کی ضرورت ہو کیسی جہالت ہے! جب وہ سب کے سب جمع ہو کر حقیر سے حقیر چیز کو پیدا کرنے کے قابل نہیں تو پھر غور کرو کہ انفرادی حیثیت سے وہ کس قدر عاجز ٹھہرتے ہیں (۱) اب رہا ان سے ایسی چیز کا طلب کرنا جس کے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں سو یہ بھی باطل ہی، کیونکہ حق تعالیٰ نے جو چیز جس کے لیے مقدر کردی ہے اس میں نہ وہ ایک ذرہ کا اضافہ کرسکتے ہیں اور نہ اس سے ایک ذرہ کی کمی، وہ کسی چیز کو ایک مکھی سے بھی چھین کر دوسرے کو دینے کی سکت نہیں رکھتے اور نہ آپ ہی لینے کی قوت تو پھر ان سے عرضِ حاجات اور طلبِ مرادات کرنا کتنی حماقت ہے! اور آخر میں یہ بھی فرما دیا گیا کہ ان مشرکین نے حق تعالیٰ کی قدر جیسی چاہیے ویسی نہ سمجھی، اگر سمجھتے تو حق تعالیٰ کو چھوڑ کر ان بیچاروں سے کہ جن سے ایک مکھی تک نہیں بن سکتی کاہے کو حاجتیں مانگتے اور مرادیں طلب کرتے "خاک پڑے ایسی سمجھ پر جو بادشاہ کے روبرو فقیر سے بھیک مانگے"! ؎

شرمت بادکہ من بسویت نگراں　　　　باشم تو نہی چشم بسوئے دگراں　(جامی)

یہاں من دون اللہ سے محض اصنام اور بت مراد لینا کسی طرح درست نہیں جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے کہ یہ لفظ عام ہے، اللہ کے سوا جتنی مخلوق ہے سب اس میں شامل ہی۔ علاوہ ازیں حق تعالیٰ نے انہیں قابلِ عبادت اور لائقِ دعا اس سے نہیں قرار دیا کہ وہ کسی شے کی تخلیق پر قادر نہیں۔ لن یخلقوا میں کن اصل میں نفیِ مستقبل کے لیے آیا ہے اور اس کی نفی موکد ہوتی ہے جس طرح تمام اہلِ لغت اور مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ علت عام ہے تمام مخلوق کو خواہ انبیاء ہوں یا اولیاء، اغنیاء ہوں یا اشقیاء ان میں سے کسی کو تخلیق کی قابلیت نہیں۔ اور یہ تو ہم بتا چکے ہیں کہ بت پرست اپنے بتوں کو بذاتہٖ معبود نہیں سمجھتے تھے بلکہ مقصود ان کی تعظیم سے اولیاء و انبیاء کی تعظیم تھی جن کی صورتوں پر وہ مورتیں بنائی گئی تھیں۔ چنانچہ امام رازیؒ نے اس کی صراحت ان الفاظ میں کی ہے۔

"فالقوم کانوا یعتقدون فیھا انھا طلسمات موضوعۃ علیٰ صورۃ الکواکب

او انها تماثیل الملائکۃ والانبیاء المتقدمین وکانوا یعظمونہا علی ان

تعظیمہا یوجب تعظیم الملائکۃ ھولئک الانبیاء[1]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو تعظیم وعبادت مخصوص بحضرت حق تعالیٰ جل شانہ ہو اس کو انبیاء واولیاء کے ساتھ متعلق کرنا ایسا ہی شرک ہے جیسا کہ بتوں کے ساتھ کرنا ان وجوہ کی بنا پر ان آیات کی تخصیص بتوں کے ساتھ باطل ہے اور نتیجہ ظاہر ہے کہ جس طرح بتوں سے دعا کرنا شرک جلی ہے بالکل اسی طرح نبی وولی سے دعا کرنا بھی شرک جلی ہے۔

(۵) لَہٗ دَعْوَۃُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَہُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا کَبَاسِطِ کَفَّیْہِ اِلَی الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاہُ وَمَا ھُوَ بِبَالِغِہٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ (پ ۱۳ ع ۶) "سچا پکارنا اسی کے لیے خاص ہے اور خدا کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کی درخواست کو اس سے زیادہ منظور نہیں کر سکتے جتنا کہ پانی اس شخص کی درخواست کو منظور کرتا ہے جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوتا ہے کہ وہ اس کے منہ تک آجائے اور وہ اس کے منہ تک آنے والا نہیں اور کافروں کی جتنی پکار یا درخواست ہے سب گمراہی ہے"

یعنی پکارنا اسی کو چاہیے، درد ومصیبت میں دعا اسی سے کرنی چاہیے جو ہر قسم کے نفع و ضرر کا مالک ہو، عاجز وفقیر کو پکارنے اور اس کے سامنے گڑگڑانے سے کیا حاصل؟ حق تعالیٰ کے سوا کون ہے جس کے قبضہ میں اپنا یا دوسروں کا نفع وضرر ہے۔ غیر اللہ کو اپنی مدد کے لیے بلانا ایسا ہے جیسے کوئی پیاسا کنوئیں کے منہ پر کھڑا ہو کر پانی کی طرف ہاتھ پھیلائے اور خوشامد کرے کہ میرے منہ میں پہنچ جا۔ ظاہر ہے کہ قیامت تک پانی اس کی فریاد کو پہنچنے والا نہیں، بلکہ اگر پانی اس کی مٹھی میں ہو تب بھی خود چل کر منہ تک نہیں جا سکتا۔"

غور کرو کہ اس آیت میں "دعوت" یعنی دعاء کی تخصیص حق تعالیٰ ہی کے ساتھ کی گئی ہے اس لیے کہ جار مجرور جو معمول ہے "دعوت" کا وہ اپنے عامل پر مقدم ہے اور تقدیم معمول کی مفید حصر ہوتی ہے۔

[1] دیکھو تفسیر کبیر اور مقامات کے لیے ج اول ص ۲۲۳ - نیز ج ۴ ص ۹۰ - نیز ج ۸ ص ۲۳۲۔

اس پر علمائے بیان کا اتفاق ہے اور مفسرین کا اجماع، چنانچہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں بھی یہی صورت ہے۔ یہاں بھی حصر ہے۔ دعا کا تعلق صرف حق تعالیٰ ہی کے ساتھ چاہیے اور عبادت کا بھی۔ یہی تخصیص کو مثال سے واضح کیا گیا کہ جو حق تعالیٰ کے سوا اوروں کو پکارتے ہیں وہ ان نادانوں کے مانند ہیں جو پیاس لگنے پر کنوئیں کے منہ پر جا کر پانی کو پکارتے ہیں۔ ہر ایسی پکار کو کافروں کی پکار قرار دیا اور اس کا نتیجہ اور انجام "ضلال" یا گمراہی و بطلان و ناامیدی ٹھیرایا۔

(۶) اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰکِفِیْنَ قَالَ هَلْ یَسْمَعُوْنَکُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ، اَوْ یَنْفَعُوْنَکُمْ اَوْ یَضُرُّوْنَ (پ ۱۹ ع ۹) یہ گفتگو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی قوم کے درمیان ہوئی ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے فرمایا کہ تم کس چیز کی عبادت کیا کرتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم بتوں کی عبادت کیا کرتے ہیں اور ہم ان ہی پر جمے بیٹھے رہتے ہیں۔ ابراہیم ؑ نے فرمایا کہ کیا یہ تمہاری سنتے ہیں جب تم ان کو پکارا کرتے ہو، یا یہ تم کو کچھ نفع پہنچاتے ہیں، یا یہ تم کو کچھ ضرر پہنچا سکتے ہیں؟

ان آیات سے واضح ہے کہ غیرِ خدا کو پکارنا اُن سے اپنی حاجتیں طلب کرنا مشرکین کا شیوہ ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جو شخص اللہ کو چھوڑ کر کسی اور سے دعا کرے یا اس سے اُمیدِ نفع و ضرر کی بالاستقلال رکھے وہ بت پرست ہے اور جس کے ساتھ اس نے فقر و ذلت کی یہ نسبت قائم کر رکھی ہے وہ اس کا "بت" ہے۔ حضرت سعدی نے کیا خوب کہا ہے ؎

دل اندر صمد باید اے دوست بست! ۔۔۔ کہ عاجز تر است از صنم ہر کہ ہست!

اسی لیے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ نے فرمایا تھا۔ لیس الشرک عبادۃ الاصنام بل ہو متابعتک لہواک وان تختار مع ربک عزوجل شیئًا سواہ من الدنیا وما فیہا والاٰخرۃ وما فیہا فما سواہ عزوجل غیرہ فاذا رکنت الیٰ غیرہ فقد اشرکت بہٖ عزوجل غیرہ[1]۔ ؎

[1] شرک کچھ یہی بت پرستی نہیں ہے بلکہ خواہش نفس کی پیروی ہے اور حق تعالیٰ کے ہوتے ہوئے کسی شے کو ان کے سوا دنیا و عقبیٰ و مافیہما سے اختیار کرنا ہے کیونکہ جو کچھ حق تعالیٰ کے سوا ہے وہ غیر اللہ ہے، سو جب غیر کی طرف میل ہو تو گویا اس میں غیر کو اللہ کا شریک ٹھہرایا۔ (فتوح الغیب مقالہ ہفتم)

غیر حق ہرچہ دولت را برد | سترہ راہ تو ہماں خواہد بود
غیر حق یک ذرہ کاں مقصود تست | تیغ لا بر کش کہ آں معبود تست

مشرکین کے طریقے کے خلاف موحد کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ ہی سے مانوس ہوتا ہے رنج وغم، درد والم میں اسی کو پکارتا ہے، اسی سے اُمید و رجا رکھتا ہے اسی سے سکون و بردِ قلبی حاصل کرتا ہے۔

مرا بیگانگی از خلق با حق آشنا کردہ | بطبع من بعکس کم ساختن بسیار می سازد!

مومن موحد کی اسی شان کو حق تعالیٰ اس طرح ادا فرما رہے ہیں: وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (پ ۲ ع ۳) یعنی "ایسے صابرین کو بشارت سُنا دیجیے کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں اور ہم سب اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جانے والے ہیں"۔ غور کرو یہاں "مصیبت" اسم نکرہ ہے اور اذا بھی عام ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر مصیبت و آفت میں، ہر درد و الم میں، ہر رنج و غم میں حق تعالیٰ ہی کو یاد کرتے ہیں، اسی کو پکارتے ہیں، اسی سے فریاد کرتے ہیں کہ "اللّٰھم لک الحمد والیک المشتکی وبک المستغاث وانت المستعان ولا حول ولا قوۃ الا باللہ"[1] "حق تعالیٰ آپ ہی کے لیے تمام تعریف سزاوار ہے آپ ہی کی طرف ہماری شکایت ہے اور آپ ہی سے فریاد ہے اور آپ ہی مددگار ہیں، ہمیں کوئی دوسرا نہ بچا سکتا ہے اور نہ سوائے آپ کے کسی میں حرکت ہے نہ قوۃ"

یارب ز تو یافت صورت آب و گلِ من | الطافِ تو شد پناہ جان و دلِ من
آسانی کار از تو بد حاصلِ من | ہم از کرم تو حل شود مشکلِ من! (درد)

اسی آیت میں آگے صابرین کو جو بشارت دی گئی ہے اس کی تفصیل فرماتے ہیں: أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ یعنی "ان ہی لوگوں پر خاص خاص رحمتیں ہیں ان کے پروردگار کی طرف سے اور عام رحمت بھی ہے اور یہی لوگ ہیں ہدایت یافتہ" اسی

---

[1] دعائے موسوی ہے۔ دیکھو مجمع الزوائد کتاب الادعیہ ص ۱۸۳ ج ۱۰ طبع مصر ۱۳۵۲ھ

سے تفریعاً لازم آتا ہے جو مصیبت و غم کے وقت غیر اللہ کو یاد کرتے ہیں، ان ہی سے فریاد کرتے ہیں اور ان ہی کو اپنا مددگار اور پناہ گاہ سمجھتے ہیں وہ نہ خاص رحمتوں کے لائق ہیں اور نہ عام رحمت کے مستحق اور نہ ہدایت کے قابل، یعنی درد و غم میں غیر اللہ کی طرف شکایت لے جانے والے، ان ہی کو اپنی جان و دل کی پناہ سمجھنے والے حق تعالیٰ کی نفریں کے لائق، غضب کے قابل اور ضلالت میں گرفتار ہیں!

ذرا الفاظ کی نزاکت پر بھی غور کرو، اولٰئِكَ کے بعد ضمیر منفصل لائی گئی ہے اور ھم المھتدون فرمایا گیا ہے، علماء بیان کا اتفاق ہے کہ یہ ضمیر جہاں مبتدا و خبر میں آتی ہے مبتدا کو خبر میں منحصر کر دیتی ہے۔ اب اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ہدایت سے وہی لوگ مختص ہیں جو وقتِ غم و ہنگام مصیبت حق تعالیٰ ہی کو یاد کرتے ہیں اور ان ہی سے فریاد کرتے ہیں اور جب ہدایت کا انحصار ان ہی پر ہوا تو ضلالت یا گمراہی ان کے غیر میں منحصر ہوئی! ذلك ھو الخسران المبین۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی زندگی پر غور کرو جب ان پر مصائب کا نزول ہوتا (اور بمصداق اشد الناس بلاءً الانبیاء مصائب ان ہی پر زیادہ نازل ہوئی ہیں) تو ان کا رخ حق تعالیٰ ہی کی طرف پلٹتا، ان کے ہاتھ حق تعالیٰ ہی کے سامنے پھیلتے، ان کا سر حق تعالیٰ ہی کے قدموں پر جھکتا تھا۔ دیکھو حضرت آدم علیہ السلام اپنی لغزش سے واقف ہو کر انتہائی حزن و الم کی حالت میں حق تعالیٰ ہی کو پکارتے ہیں:-

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ (پ ۹۶)	اے ہمارے رب ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ کرینگے اور ہم پر رحم نہ کرینگے تو واقعی ہمارا بڑا نقصان ہو جائیگا۔

یا رب اگر از جہل خطا شد کارم
جاں از کرمت شاد بود بسیارم
زامیدِ تو بسکہ دل بود بیمارم
گویند کہ نیست از گنہ آزارم
(درد)

اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی سرکش قوم کے جور و ستم سے عاجز اور تنگ آکر حق تعالیٰ ہی سے فریاد کی کہ

اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (پ ۲۷ ع ۴)	میں درماندہ ہوں میرے پروردگار آپ انتقام لیجیے۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی تھکن، عجز و درماندگی کی حالت میں حق تعالیٰ ہی کی طرف توجہ کی اور پکارا:

رَبِّ اِنِّیۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَیَّ مِنۡ خَیۡرٍ فَقِیۡرٌ (پ۲۰ ع ۶) — اے میرے پروردگار جو نعمت بھی آپ مجھ کو بھیج دیں میں اس کا محتاج ہوں۔

غم نالم واز درِ تو با غم نروم — جز شاد و امیدوار و خرم نروم

از درگہ ہمچو تو کریمے ہرگز — نومید کسے نہ رفت و من ہم نروم (سرمد)

اور حضرت ایوب علیہ السلام نے ہجومِ غم و الم کے وقت حق تعالیٰ ہی کو اپنی پناہ گاہ سمجھا اور التجا کی۔

اِنِّیۡ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ (پ۱۷ ع ۶) — مجھ کو یہ تکلیف پہنچ رہی ہے اور آپ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں۔

یارب کرمِ تو گر نباشد مددم — خونِ جگر از دیدہ رود تا ابدم!

اور حضرت یونس علیہ السلام نے غم و اندوہ کی تاریکیوں میں حق تعالیٰ ہی کو پکارا کہ

لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنۡتَ سُبۡحٰنَکَ ٭ۖ اِنِّیۡ کُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ (پ۱۷ ع ۶) — (حق تعالیٰ) آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، آپ پاک ہیں، میں بیشک قصوروار ہوں!!

یارب ز کرم ببخش تقصیر مرا — مقبول بکن نالۂ شبگیر مرا

پیری و گناہ ماجرائیست عجیب — لطفِ تو کند چارۂ تدبیر مرا (سرمد)

اور حضرت یونسؑ ہی کے متعلق ارشاد ہے: فَلَوۡلَاۤ اَنَّہٗ کَانَ مِنَ الۡمُسَبِّحِیۡنَ لَلَبِثَ فِیۡ بَطۡنِہٖۤ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ (پ۲۳ ع ۹) یعنی اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو قیامت تک اسی (مچھلی) کے پیٹ میں رہتے۔ دیکھو لبث کو لام تاکید سے موکد فرمایا گیا ہے اور مناطِ نجات تسبیح الٰہی کو قرار دیا گیا ہے نہ کہ کسی نبی، ولی کے نام کا ختم پڑھنے، ان کو پکارنے اور اپنا دردِ غم ان کے سامنے رکھنے کو!

قرآن کریم میں ایک جگہ (پ۲۴ ع ۱۲) حق تعالیٰ ہمیں جنتیوں کی حالت کی خبر دے رہے ہیں کہ جب وہ عالمِ شہادت، عالمِ برزخ اور عالمِ حشر کی ہزاروں مصیبتوں اور بلاؤں، آفتوں اور

مشکلوں کو اٹھا کر بالآخر جنت میں داخل ہونگے تو کہینگے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ۔ یعنی حق تعالیٰ ہماری ہدایت نہ کرتے تو اس مقام راحتِ ابدی تک ہماری رسائی کبھی نہ ہوتی! زندگی کے ہر قدم پر اور موت کے بعد ہر مرحلہ پر حق تعالیٰ ہی کا دستِ کرم ہماری تائید کرتا ہے اسی لیے نصیحت فرمائی: وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰىكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (پ ۱۷ ع ۱۷) یعنی حق تعالیٰ ہی کو مضبوط پکڑے رہو وہی تمہارے کارساز ہیں کیسے اچھے کارساز ہیں اور کیسے اچھے مددگار! اب انہیں چھوڑ کر کسی اور کی طرف رخ کرنا بے شرمی نہیں تو کیا ہے!

اے آنکہ بقبلۂ بتاں روست ترا — بر مغز چرا حجاب شد پوست ترا
دل در پے این و آں نہ نیکوست ترا — یک دل داری بس است یکدوست ترا (جامی)

قرآنِ کریم کی ان تمام تصریحات کے بعد ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی طرف توجہ کرتے ہیں اور نہایت اختصار کے ساتھ چند دعاؤں کو پیش کرکے واضح کرتے ہیں کہ درد و رنج، غم و ہم، آفت و مصیبت کے وقت سوائے حق تعالیٰ کے کسی کو یاد نہ کرنا چاہیے ان ہی کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور ان ہی کا نام زبان پر آنا چاہیے، اس کے بعد امتثالِ امر میں اسبابِ دنیویہ کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جب بھی کسی قسم کی پریشانی لاحق ہوتی تو نماز پڑھتے، چنانچہ مروی ہے اذا حزنہ امر فزع الی الصلوٰۃ (رواہ احمد) اور ظاہر ہے کہ نماز میں سوائے تسبیح و تہلیل، تحمید و تقدیس کے اور کیا ہوتا ہے۔ ترمذی میں ہے کہ آپ کو جب کوئی سخت کام پیش آتا تو فرماتے: "یاحی یاقیوم برحمتك استغیث" اور دوسری حدیث میں ترمذی کی مذکور ہے کہ جب کسی امر کے متعلق فکر ہوتی تو آسمان کی طرف نظر کرتے اور کہتے: سبحان اللہ العظیم! جب دعا میں کوشش کرتے تو فرماتے: یاحی یاقیوم۔ آپ نے فرمایا کہ غمگین کی دعا یہ ہے: اللّٰھم رحمتك ارجو فلا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین واصلح لی شانی کلہ لا الٰہ الا انت[۱]۔ عمیس کی صاحبزادی اسماء (جو حضرت

---

[۱] اے اللہ مجھے بس تیری رحمت ہی کا آسرا ہے، تو مجھے پل بھر کے لیے بھی میرے نفس کے حوالہ نہ کر اور میرے سب کام درست کردے

یعنی میرا اللہ رب ہے

عائشہ صدیقہؓ کی بہن تھیں) کو فرمایا، کیا تجھے چند ایسی باتیں بتلادوں جو غم کے وقت کہا کرے! کہہ اللہ اللہ ربی لا اشرك به شیئا (سات بار) آپ نے ایک انصاری کو جن کا نام ابوامامہؓ تھا۔ غیر وقت نماز مسجد میں دیکھ کر پوچھا کہ اس وقت تم کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ قرض کے بار کے نیچے دبا جا رہا ہوں متفکر اور پریشان ہوں۔ فرمایا صبح و شام اس دعا کو پڑھا کرو:۔ اللھم انی اعوذبك من الھم والحزن واعوذبك من العجز والکسل واعوذبك من الجبن والبخل واعوذبك من غلبة الدین وقھر الرجال۔ ایک مرتبہ فرمایا من لزم الاستغفار جعل اللہ له من کل ھم فرجا ومن کل ضیق مخرجا ورزقه من حیث لا یحتسب۔ یعنی جو ہمیشہ استغفار پڑھا کرے تو اللہ اس کی ہر مصیبت کو دفع کر دیتا ہے اور ہر تنگی سے اس کو نکال لیتا ہے اور ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے گمان تک نہ ہو (رواہ احمد و ابو داؤد و ابن ماجہ عن ابن عباس) ایک اور موقع پر فرمایا کہ جب کسی پر غم و مشکل ٹوٹ پڑے تو کہا کرے لاحول ولا قوۃ الا باللہ (کذا فی المشکوۃ)

دیکھو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ ما اوذی نبی ما اوذیت یعنی جتنی اذیت مجھے پہنچی اتنی کسی نبی کو نہیں پہنچی مگر کیا کسی اذیت یا تکلیف کے وقت آپ نے کسی نبی کو یاد کیا کہ یا آدم ابونا، یا نوح نبینا، یا ابراہیم خلیل اللہ؟ یا ہر وقت اسی ذات پاک سے فریاد کی جو تمام مشکلات کو رفع کرتی ہے جو "فارج ہم" ہے، "کاشف غم" ہے، جو "مجیب دعوۃ المضطرین"[1] ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کو آپ نے تعلیم فرمائی تھی کہ: یا غلام احفظ اللہ یحفظك احفظ اللہ تجدہ تجاھك، واذا سألت فاسئل اللہ واذا استعنت فاستعن باللہ واعلم ان الامة لو اجتمعت علی ان ینفعوك بشیء لم ینفعوك الا بشیء کتبہ اللہ لك ولو اجتمعوا علی ان یضروك بشیء لم یضروك الا بشیء قد کتبہ اللہ علیك رفعت الاقلام وجفت الصحف (اخرجہ الترمذی عن ابن عباس) یعنی اے لڑکے اللہ کو یاد رکھو وہ تجھ کو یاد رکھیگا۔ اللہ کو یاد رکھ کر تو اس کو اپنے سامنے پائیگا اور جب تو کچھ

---

[1] یہ حدیث کے الفاظ ہیں۔ مصیبت زدہ یہ دعا پڑھے: اللھم فارج الھم، کاشف الغم مجیب دعوۃ المضطرین، رحمن الدنیا ورحیمھا، انت ترحمنی، فارحمنی برحمۃ تغنینی بھا عن رحمۃ من سواك (رواہ الحاکم و ابن مردویہ عن ابی بکر صدیقؓ)

مانگے تو اللہ ہی سے مانگ اور جب تو مدد چاہے تو اللہ ہی سے چاہ (ایاک نعبد و ایاک نستعین) اور یقین کرلے کہ اگر سب بندے مل کر کوشش کریں کہ تجھے اس چیز سے فائدہ پہنچائیں جو اللہ نے تیرے لیے مقدر نہیں کی تو وہ ایسا کرنے کی قدرت نہ پائینگے مگر جتنا کہ اللہ نے تیرے لیے لکھ دیا، اور اگر سب بندے مل کر تجھے کسی چیز سے ضرر پہنچانے کی کوشش کریں جو اللہ نے تیرے لیے مقدر نہیں کی تو اس پر قدرت نہ پائینگے، قلم اٹھا لیے گئے اور خشک ہوگئیں کتابیں؟ دیکھو اس حدیث میں کس وضاحت و صراحت کے ساتھ استعانت عن غیر اللہ سے منع کیا گیا ہے اور کس طرح سبھوں سے توڑ کر صرف حق تعالیٰ ہی سے جوڑا گیا ہے! کفی باللہ وکیلا!

از خدا خواہم و ز غیر نخواہم بخدا کہ نیم بندۂ دیگر نہ خدائے دگر ست!

یہ کہہ کر کہ ساری دنیا تجھے فائدہ نہیں پہنچا سکتی (کیونکہ وہ ایک مکھی کی تخلیق پر بھی قادر نہیں) احتیاج کی ساری نسبتوں کو جو غیر اللہ کے ساتھ قائم کی جاسکتی ہیں ایک ہی ضرب میں کاٹ دیا گیا ہے اور پھر یہ سنا کر کہ ساری دنیا تجھے ضرر پہنچانے پر قادر نہیں (کیونکہ وہ مکھی سے بھی کوئی شے چھین نہیں سکتی) غیر اللہ کے خوف کو سینے سے بالکل دور کردیا گیا ہے اور اس طرح ہمیں خوف و حزن کی ان زنجیروں سے بالکل آزاد کردیا گیا ہے جو غیر اللہ ہمارے جہل و شرک کی وجہ سے ہماری گردن میں ڈال سکتا تھا: اب میں توحید ہی کی بدولت آزادی و جرأت کے ساتھ بآواز بلند کہہ سکتا ہوں:

لو الثقلان الانس والجن اجمعوا یریدون ایلاما لاصغر نملة[1]
یکون لھا رب السموات ناصرا لما ظفروا منھا بادنی مضرة

کیا یہ آزادی و بے خوفی یا استقلال ان شرک پسند بت پرستوں یا گور پرستوں کو حاصل ہو سکتا ہے جو ہر پیر اور شہید کو نافع و ضار سمجھ کر ان سے اپنے فقر و احتیاج کی نسبت کو جوڑتے ہیں، ان ہی کے آگے سر نیاز خم کرتے ہیں اور ان ہی کے سامنے دست سوال پھیلاتے ہیں اور اپنے رسول کی

---

[1] اگر جن و انس دونوں جمع ہو کر چھوٹی سی چھوٹی چیونٹی کو دکھ پہنچانا چاہیں اور حق تعالیٰ اس کے ناصر و مددگار ہوں تو وہ اس کو ادنیٰ مضرت بھی نہیں پہنچا سکتے۔

اس نصیحت کو بھول جاتے ہیں کہ

لیسأل احدکم ربہ حاجتہ کلھا حتی	ہر کسی کو چاہیے کہ اپنی ساری حاجتیں اپنے پروردگار
یسأل الملح حتی یسألہ شسع	ہی سے مانگے یہاں تک کہ نمک بھی اسی سے مانگے
نعلہ اذا انقطع (اخرجہ الترمذی عن انسؓ)	اور جوتی کا تسمہ بھی اگر ٹوٹ جائے!

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جنھیں افسوس ہے کہ قادریہ کی ایک بڑی تعداد نے اپنا معبود مقرر کر رکھا ہے، مصائب میں ان ہی کو پکارتی ہے، آفات کے دور کرنے کے لیے ان ہی کے نام کا جھنڈا اپنے گھروں میں کھڑا کرتی ہے) حدیث ابن عباسؓ کو جو اوپر مذکور ہوئی اپنی فتوح الغیب میں نقل فرماتے ہیں اور اس کے بعد نصیحت کرتے ہیں کہ: فینبغی لکل مؤمن ان یجعل ھذا الحدیث مرآۃ لقلبہ وشعارہ ودثارہ وحدیثہ فیعمل بہ فی جمیع حرکاتہ وسکناتہ حتی یسلم فی الدنیا والاٰخرۃ ویجد العزۃ فیھما برحمۃ اللہ تعالیٰ۔ یعنی ہر مومن کو چاہیے کہ اس حدیثِ نبوی کو اپنے قلب کے لیے آئینہ بنالے تاکہ اس کے مضمون میں اپنے دل کا حال دیکھے اور اس کی خوبی و زشتی، راستی و کجی کو معلوم کرے، بلکہ اس حدیث کو اپنے اندر و باہر کا جامہ بنالے اور ہر وقت کے لیے اس کو ایک سخن و حکایت ٹھہرائے کہ اپنے دل سے اس کی تکرار کرتا رہے اور اپنے تمام حرکات و سکنات میں اس پر عمل کرے تاکہ دنیا و آخرت میں، تمام آفاتِ نفسی و آفاقی سے محفوظ رہے اور اللہ کی رحمت سے دونوں جہان میں عزت پائے[1]"

شیخ جیلیؒ توحید کے آفتاب تھے، آپ کی کتابِ مستطاب "فتوح الغیب" کی ہر سطر سے توحید کی تعلیم مترشح ہوتی ہے اور سلسلۂ عالیہ قادریہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے الفاظ میں "اتباعِ کتاب و سنت واجتناب از فتورع درمبادی بدعت" کے سوا کچھ نہیں؛ اسی لیے محدث دہلویؒ آگے چل کر فرماتے ہیں۔ "پیرما فرمود کہ در سلاسلِ دیگر از چیزہائے دیگر پرسند امادریں سلسلہ از شریعتِ زنہار کہ تا شریعت مطہرہ شکایت نہ کند از تو!"

---

[1] فتوح الغیب مترجمہ شاہ عبدالحق دہلویؒ ص ۲۵۰۔

اشراک فی العلم مشرکین کی "عبادت" کے پہلے جزو سے ہم نے صفحاتِ بالا میں تفصیل سے بحث کی کہ یہ غیر اللہ کو مقرب و شفیع، نافع و ضار جان کر ان سے اپنی حاجت کے وقت فریادرسی چاہتے تھے، یعنی ان کو پکارتے یا استغاثہ کرتے تھے، یہی ان کا شرک تھا "اشراک فی التصرف" تھا، اگر ان ہی افعال کا ارتکاب کسی کلمہ گو سے ہو تو اس پر بھی شرک کا اطلاق کیا جائیگا اور اس کی کلمہ گوئی اطلاقِ شرک سے مانع نہ ہوگی۔ دیکھو اس "اشراک فی التصرف" میں "اشراک فی العلم" بھی لازماً شامل ہوتا ہے۔ درد و مصیبت کے وقت غیر اللہ کو پکارنے والا نہ صرف یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس درد و غم کو دور کرنے کی قدرت رکھتے ہیں بلکہ اس کا قطعی یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ وہ اس کے اس استغاثہ اور پکار کو ہر وقت اور ہر جگہ سے سن بھی سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ بغیر سنے اور بغیر مطلع ہوئے وہ اس کی مدد کر کیسے سکتے ہیں؟ اس طرح وہ غیر اللہ کے لیے علمِ غیب بھی ثابت کرتا ہے، حالانکہ علمِ غیب خصائصِ الٰہیہ سے ہے اور غیر اللہ سے قطعاً مسلوب! یہی اس کا "اشراک فی العلم" ہے! اور اس سے زیادہ ضلالت اور گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے! وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَہٗ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ وَھُمْ عَنْ دُعَآئِھِمْ غٰفِلُوْنَ (پ۲۶ ع۱) "اس شخص سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو خدا کو چھوڑ کر ایسے معبود کو پکارے جو قیامت تک بھی اس کا کہنا نہ کرے اور ان کو ان کے پکارنے کی بھی خبر نہ ہو"

یہ امر کہ علمِ غیب[1] خاصۂ حق سبحانہ تعالیٰ ہے، اس کے سوا کسی کو نہیں، قرآنِ مبین میں نہایت صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں پہلے چند اجمالی آیات پر غور کرو۔

(۱) وَلِلّٰہِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اِلَیْہِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّہٗ (پ۱۲ ع۱) اور آسمانوں اور زمینوں میں جتنی غیب کی باتیں ہیں ان کا علم خدا ہی کو ہے اور سب امور اسی کی طرف رجوع ہونگے۔

[1] مختصر لفظوں میں غیب کی حقیقت سمجھ لو قاضی بیضاوی کہتے ہیں کہ غیب وہ امر ہے جس پر نہ عقلی دلیل قائم ہو سکتی ہے نہ وہ بدیہی ہو نہ حواس کی رسائی اس تک ہو۔ (تفسیر انوار التنزیل)

اسی مفہوم کو نفیاً اس طرح بیان کیا گیا ہے :-

قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ ؕ وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ (پ ۲۰ ع ۱)

آپ کہہ دیجیے کہ جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمین میں موجود ہیں کوئی بھی غیب کی بات نہیں جانتا بجز اللہ تعالیٰ کے اور ان کو یہ خبر نہیں کہ کب دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔

(۲) لَہٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِہٖ وَ اَسْمِعْ (پ ۱۵ ع ۱۷)

تمام آسمانوں اور زمین کا علم غیب اسی کو ہے وہ کیسا کچھ دیکھنے والا اور کیسا کچھ سننے والا ہے۔

(۳) فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰہِ (پ ۱۱ ع ۶)

آپ فرما دیجیے کہ غیب کی خبر صرف خدا کو ہے۔

مندرجہ ذیل آیات میں غیر اللہ سے علمِ غیب کی مطلق نفی کی جا رہی ہے۔

(۴) وَ عِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُہَآ اِلَّا ھُوَ (پ ۷ ع ۱۳)

اور اللہ ہی کے پاس کنجیاں ہیں تمام مخفی اشیاء کی، نہیں جانتا ہے اُنہیں لیکن وہی۔

خود آنحضرت صلعم نے غیب کی کنجیوں کی تفسیر ان پانچ چیزوں سے فرمائی جن کا ذکر صراحت سے سورۂ لقمان میں آیا ہے :-

اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ وَ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ؕ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ (پ ۲۱ ع ۱۳)

بیشک اللہ ہی کو قیامت کی خبر ہے اور وہی مینہ برساتا ہے اور وہی جانتا ہے جو کچھ رحم میں ہے، اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا عمل کریگا، اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مریگا۔ بیشک اللہ سب باتوں کا جاننے والا با خبر ہے۔

جتنے حوادثِ کونیہ اور وقائعِ غیبیہ ہیں سب ان پانچ میں داخل ہیں (۱) حوادثِ سماویہ کو "انزالِ غیث" میں شامل کیا جا سکتا ہے جس کا تعلق آسمان سے ہے (۲) حوادثِ ارضی "علم ما فی الارحام" میں داخل ہیں اور (۳) حوادثِ حیات کا تعلق لازماً "ماذا تکسب غداً" سے ہوگا اور (۴) حوادثِ موت و مابعدِ موت ظاہر ہے کہ "ما تدری نفس بای ارض تموت" میں شامل ہیں۔ جب ان تمام حوادث

وامورِ غیبیہ کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے اور کسی فردِ بشر کو عطا نہیں کیا گیا تو ظاہر ہے کہ کسی حادثۂ غیب کا علم انسان کو نہیں ہو سکتا اور جب (۵) علمِ قیامت (یعنی اس کے خاص وقتِ وقوع کا علم) کسی نبی کو نہیں حالانکہ سب اس کی خبر دینے میں متفق ہیں۔ تو اور حوادثِ آتیہ کا علم بدرجہ اولیٰ ان کو نہ ہوگا۔ غرض جب ان پانچ کا علم کسی کو نہ ہوا تو اور چیزوں کا علم بدرجہ اولیٰ نہ ہوا، اسی لیے ان کو "مفاتحِ غیب" کہا گیا ہے، گویا جملہ امورِ غیبیہ ان کے اندر ہیں اور یہ تمام خزائنِ غیب کی کنجیاں ہیں اور جب خزانہ کی کنجی ہی کسی کو نہ ملے تو اس میں سے ایک حبہ بھی نہیں مل سکتا۔

(۵) وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ (پ ۷ ع ۳)	اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے تمام خزانے ہیں اور نہ میں تمام غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔
(۶) قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ. (پ ۹ ع ۲۳)	آپ کہہ دیجیے کہ میں خود اپنی ذات خاص کے لیے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر کا مگر اتنا ہی جتنا کہ خدا تعالیٰ نے چاہا ہو اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو میں بہت سے منافع حاصل کر لیا کرتا اور کوئی مضرت ہی مجھ پر واقع نہ ہوتی، میں تو محض بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں۔

یعنی میں ایک بندۂ ناتواں ہوں اپنے لیے جلبِ نفع و دفعِ ضرر کی قوت نہیں رکھتا مگر جو میرا مالک چاہے نفع و دفع سے، پھر اس بیان کو اس طرح موکد کیا جا رہا ہے کہ اگر میں غیب کو جانتا تو جو بات بھلائی اور نفع کی ہوتی اس کو اپنے لیے حاصل کرتا۔ اور جو بات بُری اور نقصان کی ہوتی اس سے دور رہتا تاکہ وہ بُرائی مجھے نہ لگے، لیکن میں تو ایک بندۂ عاجز ہوں، میں کیا جانوں کہ میرے رب میرے مالک کے علم میں میرے لیے اچھا کیا ہے اور بُرا کیا، میرے حق میں اس کا حکم کیا ہے اور کونسی

چیز میرے لیے مقدر کر رکھی ہے، جب مجھے اتنا بھی معلوم نہیں تو پھر کسی اور بات کا معلوم ہونا کیسا! یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور تواضع و ادب نہیں فرما رہے ہیں بلکہ بطریقِ اعتقادِ قلبی پیش فرما رہے ہیں کیونکہ علمِ غیب حق تعالیٰ ہی کی خصوصیتِ خاصہ ہے عَالِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا (پ۲۹ ع۱۲) سے صاف طور پر اس کی وضاحت ہو رہی ہے اور اوپر جو آیات پیش کی گئیں وہ اس کی تائید کر رہی ہیں، ہر قسم کے اشتباہ و مغالطہ کو رفع کر رہی ہیں۔

اب رہے معجزات تو جیسے ملا علی قاریؒ نے شرح فقہ اکبر میں تصریح کر دی ہے وہ مخصص ہیں اس قضیۂ عمومی سے اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (پ۲۹ ع۱۲) یعنی جب حق تعالیٰ چاہتے ہیں کسی نبی یا رسول کو بذریعہ وحی کسی غیب پر مطلع کر دیتے ہیں۔ انبیاء سے علمِ غیب کی نفی عقائدِ اسلام میں داخل ہے اور کافۂ اہلِ اسلام کا اس پر اتفاق ہے۔ یہ عقائد خود انبیاء علیہم السلام کے تعلیم کردہ ہیں۔ لہٰذا انبیاء سے علمِ غیب کی نفی کرنے میں ان کی کسی طرح تحقیر نہیں ہوتی، ایسا سمجھنے والا مجنوں ہے، کتاب و سنت سے جاہل[1] دیکھو سورۂ نمل میں حق تعالیٰ ہدہد کا قول نقل فرما رہے ہیں "اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ" یعنی ہدہد حضرت سلیمان علیہ السلام سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ "میں ایسی بات معلوم کر کے آیا ہوں جو آپ کو معلوم نہیں ہوئی" اس آیت کو سن کر کوئی ہُدہُد کا بچہ بھی ایسی بیوقوفی نہ کریگا کہ انبیاء و اولیاء کو علمِ غیب سے متصف سمجھ کر دور دور سے استعانت کے لیے پکارے اور سمجھے کہ وہ اس کے پکارنے کو سن لیتے ہیں، آدمی کے بچے کا تو کیا ذکر ہے!

اب ذرا چند ان حدیثوں کو بھی سن لو جن سے غیر اللہ سے علمِ غیب کی کلی نفی ہوتی ہے اور حق تعالیٰ ہی سے یہ مختص کیا جاتا ہے۔

(۱) واللہ لا ادری واللہ لا ادری وانا رسول اللہ ما یفعل بی ولا بکم[1] — یعنی باوجودیکہ میں خدا کا نبی ہوں پھر نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ پیش آئے اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ پیش آئے۔

(۲) عن عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قالت من اخبرك ان محمدا صلی اللہ علیہ وسلم یعلم — حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ جو تجھ سے یہ کہے کہ آنحضرتؐ وہ پانچ باتیں جانتے تھے جن کا اللہ نے

[1] اخرجہ البخاری عن ام العلاء۔

الخمس التی قال اللہ تعالیٰ ان اللہ عندہٗ علم الساعۃ فقد اعظم الفریۃ[1] | ذکر کیا ہو (آخر سورۂ لقمان میں) تو اس نے بڑا طوفان باندھا۔

(۳) عن الربیع بنت معوذ بن عفراء قالت جاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم فدخل حین بنی علی فجلس علی فراشی بمجلسک منی فجعلت جویریات لنا یضربن بالدف ویندبن من قتل من اٰبائی یوم بدر اذ قالت احدٰھن وفینا نبی یعلم ما فی غد فقال دعی ھٰذہٖ وقولی بالذی کنت تقولین[2] | ربیع بنت معوذ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلعم میرے مکان میں تشریف لائے جب میری شادی ہو رہی تھی پھر میرے پاس مسند پر بیٹھ گئے۔ ہماری کچھ لڑکیاں گانے لگیں دف بجا کر اور ہمارے ان بزرگوں کا ذکر کرنے لگیں جو بدر میں مارے گئے تھے۔ ان میں سے ایک کہنے لگی کہ ہم میں ایک ایسا نبی ہے جو جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ ایسا مت کہہ بلکہ جو پہلے کہہ رہی تھی وہی کہے جا۔

ان تینوں احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی بزرگترین اور کامل ترین ہستی اپنی ذاتِ مقدس سے علمِ غیب کی نفی فرما رہی ہے، پھر آپ کی اُمت سے کسی کی یہ مجال کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ علمِ غیب کو اپنی جانب نسبت کرے۔ امورِ غیبیہ کا علم بذاتہٖ کسی انسان کو حاصل نہیں وہ مخصوص ہے حق تعالیٰ ہی کی ذات کے لیے انما الغیب للہ، کوئی شخص خواہ وہ نبی ہو یا ولی یہ بھی نہیں جان سکتا کہ خود وہ کل کیا کریگا: وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا۔

حدیث اول کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مناقض ہے آیۂ کریمہ لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ کے اور نیز منافی اس آیت کے وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی۔ اس لیے یہ حدیث منسوخ ہے اور اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو آپ کا ایسا فرمانا محض خوف و خشیتِ الٰہی کے لحاظ سے تھا نہ کہ واقعہ کے لحاظ سے۔

طیبی نے اس حدیث کی تشریح میں تبلایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد اس قول سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنی ذات سے علمِ غیب کی نفی فرمانا چاہتے ہیں اور صاف طور پر ظاہر فرمانا چاہتے ہیں کہ آپ ہرگز غیب پر مطلع نہیں، نہ اپنی تقدیر سے واقف ہیں نہ کسی

[1] بخاری [2] بخاری۔

اور کی تقدیر سے، نہ اپنے پوشیدہ کاموں سے واقف ہیں نہ غیر کے۔ آپ کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اپنی نجات کا بھی یقین نہیں رکھتے اس لیے کہ یہ امر تو بہت ساری دوسری حدیثوں سے ثابت ہو چکا ہے اور آیاتِ قرآنیہ بھی اس پر دلالت کرتی ہیں۔ لہٰذا اس حدیث کو کسی آیت کا معارض قرار دینا کسی طرح درست نہیں۔ رہا احتمالِ نسخ وہ بھی دو وجہ سے درست نہیں: (۱) نسخ کا حکم اس وقت تک نہیں لگایا جا سکتا جب تک کہ تاخر ناسخ کا معلوم نہ ہو اور ظاہر ہے کہ یہاں تقدم حدیث کا اور تاخر آیت کا معلوم نہیں (۲) نسخ "احکام" میں جاری ہوتا ہے "اخبار" میں جاری نہیں ہوتا، اخبار میں نسخ کا حکم لگانا گویا شارع پر کذب کی تہمت لگانی ہے۔[۱]

دوسری حدیث تو آیتِ قرآنی ہی کی ترجمان ہے اس کا انکار قرآن مبین کا انکار ہے۔ یہاں حجت یہ تراشی جاتی ہے کہ علم غیب کے اقسام میں امتیاز کیا جانا چاہیے۔ ایک علم غیب مطلق ہے دوسرے علمِ غیب اضافی۔ غیب مطلق یا غیب حقیقی کا تو علم حق تعالیٰ ہی کو ہوتا ہے لیکن غیب اضافی کے علم کی نسبت انبیاء و اولیاء کی طرف کی جا سکتی ہے۔

دیکھو غیبِ اضافی کے معنی تو یہی ہوئے کہ یہ بعض پر ظاہر ہوتا ہے اور بعض پر پوشیدہ رہتا ہے۔ مثال کے طور پر لذتِ جماع کو لو یہ رجولیت والے پر غیب نہیں، نامرد یا عنین کے لیے غیب ہے۔ یا رنگوں پر غور کرو، یہ مادر زاد اندھے کے لیے غیب ہیں لیکن آنکھوں والے کے لیے غیب نہیں یہی حال آوازوں کا ہے، سننے والے کے لیے یہ غیب نہیں مادر زاد بہرے کے لیے ضرور غیب ہے۔ اسی طرح حیدر آباد کا حال حیدر آباد والوں پر غیب نہیں، بریلی والوں کے لیے غیب ہے۔ تو ظاہر ہے کہ غیبِ اضافی کے جاننے میں کچھ اولیاء و انبیاء کی تخصیص نہیں۔ لذتِ جماع جو عنین کے لیے غیب ہے اس کو ہر مرد خواہ وہ کافر ہو یا مومن جانتا ہے، اسی طرح آوازوں کو ہر کان والا خواہ وہ نیک ہو یا بد جانتا ہے اور یہ مادر زاد بہرے کے لیے غیب ہیں۔ انبیاء و اولیاء کو جو وقائع یا حوادث حق تعالیٰ بذریعہ وحی و الہام بتلا دیتے ہیں وہ ضرور ان کو معلوم ہو جاتے ہیں لیکن حق تعالیٰ کے بغیر خبر

---

[۱] دیکھو تحریر ابن ہمام ج ۳ ص ۵۵ مطبوعہ مصر ۱۳۱۶ھ

دینے کے یہ ہرگز معلوم نہیں ہوسکتے اور حق تعالیٰ نے اس بات کی خبر نہیں دی کہ زمین و آسمان میں جتنے حوادث و واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں، ان کی اطلاع کسی نبی یا ولی کو اس نے دے رکھی ہے۔ لہٰذا ان کے علم کا دعویٰ کسی نبی یا ولی کے لیے کرنا محض بے دلیل ہے اور آیاتِ قرآنیہ کا صریح انکار۔ اور اس امر کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اخبار بالوحی میں غلطی کا کوئی احتمال نہیں ہوتا، شیطان کے تصرف سے یہ قطعاً محفوظ ہے، لیکن الہام میں عصمت شرط نہیں، الہام کبھی شیطانی ہوتا ہے اور کبھی رحمانی۔ اس لیے اولیاء کرام الہام پر اس وقت تک اعتماد نہیں کرتے جب تک کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق نہ ہو۔

تیسری حدیث کی تاویل میں مرضیاتی ذہنیت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ پہلے تو یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں جمیع علوم موجود ہیں اور ان سب کا علم رسول کو ہونا ضروری ہے ورنہ جہل لازم آئیگا اور جہل منافی شانِ رسول ہے! یہاں ایک کھلا مغالطہ ہے۔ قرآن میں جمیع علوم کے موجود ہونے سے مراد جمیع علوم دینیہ کے سوا کچھ نہیں، ان علوم کا تعلق سعادتِ انسانی سے ہوتا ہے جس کے حصول کا انسان مکلف ہے۔ قرآنِ کریم میں نہ ملائکہ کی جملہ تعداد موجود ہے نہ ذراتِ زمین کے اعداد اور نہ نجوم کی گنتی۔ نہ انجینرنگ کی تفصیلات اور نہ حیوانات، مصریات کی کلی توضیحات! نہ ان چیزوں کا کتابِ الٰہی میں ہونا ضروری ہے اور نہ ہم ان کی تحصیل پر مامور ہیں اور نہ رسول پر ان کی تبلیغ ضروری اور نہ ان سے جہل منافی شانِ رسول! خود حق تعالیٰ نے اس امر کی توضیح کردی ہے کہ بہت سی باتوں کا ہم نے قرآن میں ذکر نہیں کیا۔ مثلاً، وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ[۱] (پ ۲۴ ع ۱۳) یعنی بہت سے رسولوں کا ذکر ہم نے کیا ہے اور بہتوں کا ذکر نہیں کیا!

بعض دفعہ یہ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کا یہ کہنا کہ دعی هذه وقولی بالذی کنت

---

[۱] ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے تھے جن میں بعض تو وہ ہیں کہ ان کا قصہ ہم نے آپ سے بیان کیا ہے اور بعض وہ ہیں جن کا ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا۔

تقولین ۔محض اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کو ان لڑکیوں کی باتوں کے سننے کا اشتیاق تھا جو وہ شہداء بدر کے متعلق کہہ رہی تھیں، علم غیب کا انکار کرنا مقصود نہ تھا۔

اس توجیہ میں بالکل اسی قسم کی ہوشمندی و ذہانت سے کام لیا گیا ہے جو ہمیں اس احمق میں ملتی ہے جس کی ٹانگ میں تیر لگا تھا اور خون بہہ رہا تھا وہ اور اس کی عورت دونوں خون پونچھ رہے تھے اور احمق عقل کا دشمن برابر کہے جارہا تھا کہ خدا کرے تیر نہ لگا ہو! حضور انور صلعم تو ان لڑکیوں کی اتنی بات سن کر کہ ہم میں ایک نبی ایسا ہے جو کل کی بات جانتا ہے فرماتے ہیں کہ یہ بات چھوڑ دو اور اپنا پہلا قصہ جاری رکھو۔ اور اس کی تاویل یوں کی جارہی ہے کہ علم غیب کا انکار مقصود نہیں! "کل کی بات جاننے کی" نفی تو قضیہ کلیہ کے طور پر خود قرآن مبین میں حق تعالیٰ فرمارہے ہیں: وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا یعنی کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کریگا! اب اس صریح تردید کے بعد تاویل کا کونسا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ ع ہشدار کہ رہ خود بخود گم نہ کنی!

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اقوال کی تصدیق ان احوال و واقعات سے بھی کرلو جو آپ کی زندگی میں رونما ہوئے۔ ان میں سے صرف تین کا ذکر یہاں کافی ہوگا۔

(۱) واقعۂ افک: آپ کی محبوبہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر لوگوں نے تہمت لگائی آپ کو سخت صدمہ ہوا۔ آپ نے اس کی تحقیق و تفتیش فرمائی، اکابر صحابہ سے مشورے کیے، لیکن حقیقت کا انکشاف نہیں ہوا، آپ کے غم و حزن میں اضافہ ہوا اور تمیں دن اسی حال میں گذر گئے بالآخر حق تعالیٰ ہی نے بذریعہ وحی آپ کو بتلایا کہ عائشہ صدیقہ رض اس تہمت سے پاک ہیں۔

(۲) واقعہ بیرمعونہ: اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے حضور انور صلعم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ چند لوگ میرے ساتھ کردیں جو میری قوم کو دین کی تبلیغ کریں اگر وہ حلقہ بگوش اسلام ہوجائیں تو میں بھی مسلمان ہوجاؤنگا۔ آپ نے اس کی بات کو صحیح جان کر ستر صحابہ جلیل القدر اس کے ہمراہ کردیے۔ راستہ ہی میں اس غدار کی بیوفا قوم نے ان بزرگوں کو شہید کردیا! جب حضور اکرم ؐ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ کو نہایت رنج

ہوا، اور ایک مہینے تک قاتلین کے حق میں صبح کی نماز میں آپ نے بد دعا فرمائی!

(۳) سورۂ تحریم کی شان نزول۔ حضور انور کو شہد نہایت مرغوب تھا، آپ حضرت زینبؓ کے ہاں تشریف لیجا کر شہد نوش فرماتے تھے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے آپس میں مشورہ کیا کہ کوئی ایسی ترکیب نکالنی چاہیے کہ آپ کا حضرت زینبؓ کے ہاں زیادہ ٹھہرنا کم ہو جائے، سوچ بچار کے بعد بات یہ ٹھہری کہ ہم میں سے جس کے پاس پہلے آپ کی تشریف آوری ہو وہ آپ سے کہے کہ آپ کے منہ سے تو مغافیر کی بو آتی ہے۔ آپ کے قلب مبارک میں یہ شبہ پیدا کیا جائے کہ جو شہد آپ نوش فرماتے ہیں شاید ان مکھیوں کا ہو جو مغافیر پر بیٹھی ہوں، چونکہ بدبو سے آپ کو نفرت ہے اس لیے شہد پینا ترک فرما دینگے اور اس طرح حضرت زینبؓ کے پاس کی نشست کم ہو جائیگی۔ ان بیویوں کی یہ بات چل گئی اور حضور انورؐ نے قسم کھالی کہ اب شہد کبھی نہ پیونگا![1]

جس بات کی قرآن مبین نے صاف صریح الفاظ میں وضاحت کی جس بات کو رسول اکرم صلعم نے خوب کھول کر بیان کیا، جس بات کی تائید آپ کی زندگی کے مختلف و متعدد واقعات سے ہوتی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ حق تعالیٰ ہی عالم غیب ہیں ان کے سوا مخلوقات میں کوئی ہستی عالم غیب نہیں، ان ہی کے علم عطا فرمانے پر انبیاء و اولیاء کو غیب کے بعض واقعات کا علم ہوتا ہے، یہ ان کی اختیاری چیز نہیں کہ جب چاہا معلوم کر لیا، یہ حق تعالیٰ ہی کا اختیاری فعل ہے کہ جب چاہا اور جتنا چاہا کسی نبی و رسول کو بذریعہ وحی غیب پر مطلع کر دیا! اسی بات کو حضرت سعدیؒ نے اپنے مشہور اشعار میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے الفاظ میں اس طرح ادا کر دیا ہے ؎

یکے پرسید زاں گم کردہ فرزند — کہ اے روشن گہر پیر خرد مند!
ز مصرش بوئے پیراہن شمیدی — چرا در چاہ کنعانش ندیدی!
بگفتا حال من برق جہاں است — دمے پیدا و دیگر دم نہان ست!
گہے بر طارم اعلیٰ نشینم — گہے بر پشت پائے خود نہ بینم!
اگر درویش بر حالے بماندے — دو دست از ہر دو عالم بر فشاندے

[1] یہ تینوں واقعات صحاح ستہ کی ہر کتاب میں موجود ہیں۔

اشراک فی التصرف اور اشراک فی العلم کو اچھی طرح سمجھ جانے کے بعد اب یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ندا و صدا کی مندرجہ ذیل تمام صورتیں قطعاً ناجائز اور حرام قرار پاتی ہیں کیونکہ یہ کفر و شرک تک پہنچا دیتی ہیں۔

(۱) درد و مصیبت کے وقت اولیاء اللہ کو اس عقیدہ سے پکارنا کہ یہ ہر جگہ سے ہماری ندائے درد کو سُن لیتے ہیں اور ہماری اعانت کر سکتے ہیں، یہ قطعاً اشراک فی العلم و اشراک فی التصرف ہے۔ تمام فقہائے اس کی تکفیر کی ہے۔ قرآن کریم اور احادیثِ نبوی سے اس کا تفصیلی ثبوت اوپر دیا جا چکا ہے۔

(۲) اولیاء اللہ کی قبروں پر جا کر ان کو پکارنا۔ اس کی دو صورتیں ہیں: (ا) قبر کے نزدیک جا کر ان سے یہ کہنا کہ "آپ میری فریاد کو سنیے، میری بلا کو ٹال دیجیے، میری حاجت کو روا کیجیے" یہ استغاثہ و استعانت، دعاء اور طلبِ حاجت ہے خواہ قریب سے کی جائے یا دور سے اور یہ سراسر شرک اور کفر ہے۔ دعاء کی تفصیل میں اوپر اس کا ثبوت دیا جا چکا ہے۔ (ب) قبر کے نزدیک جا کر ان سے یہ کہنا کہ "آپ میرے لیے دعاء کیجیے کہ اللہ میری بلا کو ٹال دے اور میری حاجت کو روا کرے" یہ قطعاً بدعت ہے، قرونِ مشہود لہا بالخیر میں کسی نے ایسا نہیں کیا۔

امام ابو حنیفہؒ نے ایک شخص کو دیکھا کہ صالحین کی قبروں پر آ کر کہہ رہا ہے کہ "هل لكم من خبر و هل عندكم من اثر انی اتيتكم و ناديتكم من شهور و ليس سوالی منكم الا الدعاء فهل دريتم او غفلتم" (اے اہلِ قبور کچھ تم کو خبر بھی ہے اور کیا تم پر کچھ اثر بھی ہوتا ہے کہ کئی ماہ سے میں تمہارے پاس آتا ہوں اور تم کو پکارتا ہوں؟ میرا سوال تم سے صرف اتنا ہے کہ تم میرے لیے دعا کرو، کیا تم کو میرے حال کی خبر بھی ہے یا تم غافل ہو میرے حال سے) یہ سُن کر امام اعظمؒ نے اس شخص سے پوچھا "هل اجابوا لك؟" کیا انہوں نے تجھ کو کوئی جواب دیا۔ اس نے کہا "نہیں" آپ نے عتاب آمیز لہجہ میں فرمایا سحقاً لك و تربت يداك! كيف تكلم اجساداً لا يستطيعون جواباً ولا يملكون شيئاً ولا يسمعون صوتاً "یعنی" پھٹکار ہو تجھ پر! خاک آلود ہوں تیرے دونوں ہاتھ! ایسے جسم کیسے بات کر سکتے ہیں جو

جواب کی طاقت ہی نہیں رکھتے، جو کسی شئے کے مالک نہیں، جو کوئی آواز بھی نہیں سُن سکتے!"
پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: "وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ" یعنی حق تعالیٰ حضور انور صلعم کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں "آپ ان لوگوں کو جو قبر میں ہیں کچھ نہیں سُنا سکتے"[1]

امام اعظم کے اس عتاب سے مندرجہ ذیل امور کی وضاحت ہو رہی ہے:-

(۱) اولیاء و صالحین کی قبروں پر آ کر ان سے خطاب کسی طرح جائز نہیں۔ آپ نے ایسے لوگوں کو بد دعا دی ہے جو اہلِ قبور سے دعا کے طالب ہوتے ہیں! اگر آپ کو ان جہال کا حال معلوم ہوتا جو اہلِ قبور سے رزق، صحت و اولاد مانگتے ہیں اور ان کو مستقل یا غیر مستقل طور پر قادر جانتے ہیں تو یقیناً ان کو کافر و مشرک و ملعون قرار دیتے اور گردن مارنے کا حکم دیتے!

(۲) مُردے نہ سُن سکتے ہیں اور نہ جواب دے سکتے ہیں۔ پھر بلاؤں کا ٹالنا، مصیبتوں کا دور کرنا ان سے کیا ہو سکتا ہے! اور جب یہ نزدیک سے سُن نہیں سکتے تو دور کی کب سُنینگے؟ محققین حنفیہ سماعِ موتیٰ کے قائل نہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کشتگانِ بدر سے جو خطاب فرمایا تھا اس کی توجیہ مختلف طریقوں سے کی گئی۔ بہترین توجیہ یہ ہے کہ:-

یہ آپ کا معجزہ تھا، حق تعالیٰ نے آپ کی بات کفارِ موتیٰ کو سُنا دی تھی، چنانچہ کفایہ میں ہے ومن اجوبتھم انہ لوصح فذاک معجزۃ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ کافی شرح وافی میں صراحت کی گئی ہے کہ والمقصود من الکلام الافہام وذا بالاسماع وذا لا یتحقق بعد الموت یعنی مقصود کلام سے افہام ہے اور یہ سماع کے ذریعہ ہوتا ہے اور سماع موت کے بعد محقق نہیں" اسی طرح عینی شرح ہدایہ میں: قولہ لان المقصود من الکلام الافہام ای افہامہ فلاناً والموت ینافیہ ای ینافی الکلام الاسماع والمیت لیس باھل السماع الا تری الی قولہ تعالیٰ انک لا تسمع الموتیٰ والی قولہ تعالیٰ وما انت بمسمع من فی القبور۔

شرح مواقف[2] میں تشریح کی گئی ہے کہ علم و قدرت و ارادہ، سمع بصر میت کے لیے ثابت

---

[1] غرائب فی تحقیق المذاہب [2] شرح مواقف تذئیل فی ذکر فرق بعد موقف سادس۔ ص ۵۰، مطبوعہ نول کشور۔

کرنا فرقۂ صالحیہ کا عقیدہ ہے جو معتزلہ کا ایک گروہ ہے "الصالحیۃ اصحاب الصالحی ومذھبھم انھم جوزوا قیام العلم والقدرۃ والارادۃ والسمع والبصر بالمیت ویلزمھم جواز ان یکون الناس مع اتصافھم بھذہ الصفات امواتا وان لا یکون الباری تعالیٰ حیًا" یعنی صالحیہ گروہ ہے صالحی کا اور مذہب ان کا یہ ہے کہ انہوں نے میت کے لیے علم و قدرت و ارادہ و سمع و بصر کو جائز قرار دیا ہے، ان کے مذہب کی رو سے تو یہ لازم آتا ہے کہ جو لوگ ان صفات سے متصف ہیں وہ سب مردہ ہیں اور حق تعالیٰ بھی زندہ نہیں!" اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر گور پرست مشائخ اسی فرقۂ ضالہ کے عقیدہ پر قائم ہیں نعوذ باللہ من ذلک۔

غرض جب مردے سن نہیں سکتے اور اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے کافروں کی تشبیہ عدم سمع میں مردوں سے دی اور اثبات سمع عقیدہ ہے صالحیہ مفسدین کا جو معتزلہ کا گروہ ہے تو پھر قبروں کے پاس جا کر مردوں کو پکارنا اور ان سے دعا کی درخواست کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی بے عقل پتھر کو پکارے اور اس سے دعا کی خواہش کرے! یہ فعل کسی پاگل سے تو صادر ہو سکتا ہے عاقل و ہوشمند سے کیسے ممکن ہے؟ عموماً ایسے ہی پاگل مُردوں کو قبروں میں نہ صرف زندہ اور توانا سمجھتے ہیں بلکہ ان کو حق تعالیٰ کے ہاں اپنا شفیع اور مقرب بھی جانتے ہیں، اسی لیے وہ ان کی عبادت کرتے ہیں یعنی ان کے سامنے ذلیل و خوار بن کر کھڑے ہوتے ہیں، ان کی قبروں کو بوسہ دیتے ہیں اور ان کا طواف بھی کرتے ہیں اور کفر و شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں! ذٰلک ھو الخسران المبین!

یہاں غلط فہمی رفع کرنے کے لیے اس امر کا تذکرہ ضروری ہے کہ جو شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر دور سے درود بھیجتا ہے اس کو آپ تک فرشتے پہنچاتے ہیں، آپ اس کو نہیں سُنتے البتہ بزرگانِ دین اور محققین شرع متین نے اس امر کی تصریح کی ہے اور روایاتِ مرفوعہ میں بھی یہ امر مذکور ہے کہ جو شخص آپ کے مزار مبارک کے قریب درود بھیجتا ہے اس کو آپ بخوبی سنتے ہیں چنانچہ ابوبکر احمد بن حسین بیہقی نے شعب الایمان میں ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی علی عند قبری سمعتہ ومن صلی علی نائیا ابلغتہ[1] یعنی جو درود

[1] مشکوٰۃ باب الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فصل ثالث۔

بھیجتا ہے میری قبر کے نزدیک اس کو میں خود سنتا ہوں اور جو درود بھیجتا ہے مجھ پر دور سے وہ مجھ تک پہنچایا جاتا ہے۔ یعنی بذریعہ ملائکہ اور میں خود براہِ راست نہیں سنتا، ورنہ پہنچانے کی ضرورت نہ ہوتی جیسا کہ قبر کے پاس کے درود کے متعلق پہنچانے کا ذکر نہیں کیا!

اسی طرح ابنِ حجر مکی نے شرح ہمزیہ میں ذکر فرمایا ہے "اذا صلی وسلم علیہ عند قبرہ سمعہ سماعاً حقیقیاً ویرد علیہ من غیر واسطۃ وان صلی وسلم علیہ من بعید لا یسمعہ الا بواسطۃ یدل علیہ احادیث کثیرۃ" یعنی جب کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس سے آپ پر درود و سلام بھیجتا ہے تو آپ اس کو حقیقت میں سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں اس کا بلا واسطہ، اور اگر کوئی دور سے آپ پر درود و سلام بھیجتا ہے تو آپ اُس کو نہیں سنتے مگر بواسطہ (یعنی فرشتے آپ تک پہنچاتے ہیں[1]) بہت سی حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں۔

اس چیز کی شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے شرح مشکوٰۃ میں یوں تصریح کی ہے: "سخن دراں ماند کہ ایں فضیلت ردِ سلام از آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مخصوص بزائراں قبر شریف اوست صلی اللہ علیہ وسلم مثل داخل در مجلس کہ سلام گوید یا عام است بر ہر کسے را کہ سلام فرستد چنانکہ در تشہد وغیر آں، وظاہر ہمین است الا آنکہ سلام زائراں بنفس شریف خود بے واسطہ سماع فرمایند در و سلام نمایند و دیگراں بواسطہ ملائکہ سیاحین بود[2]"

خوب سمجھ لو کہ یہ امر یعنی رد و بلوغ سلام وغیرہ روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لیے آیا ہے، باقی رہے اور انبیاء اگرچہ حیات و صلوٰۃ ان کی قبر میں مسلم ہے مگر تبلیغ سلام و ردِ جواب کی کوئی تصریح نہیں کی گئی۔ المومن وقاف

بیانِ بالا سے صاف ظاہر ہے کہ ندائے بعید کو نبی ہو یا ولی کوئی نہیں سنتا اور ندائے قریب کا سننا مخصوص ہے انبیاء کے لیے، کسی ولی یا غوث و قطب کو یہ امر نصیب نہیں!

---

[1] ان للہ ملائکۃ سیاحین فی الارض یبلغون عن امتی السلام (سفیان ثوری کی حدیث عبداللہ بن مسعود سے رواہ النسائی وابو حاتم فی صحیحہ)

[2] شرح مشکوٰۃ ج ا ص ۳۱۹ باب فضل الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم طبع کلکتہ سنہ ۱۲۵۳ھ۔

ہماری اس تصریح کے خلاف بعض کم عقل ضعیف احادیث کو پیش کرتے ہیں، اپنی ضعفِ عقلی اور کتاب وسنت سے عدم مزاولت کی وجہ[1] سے ان احادیث کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے اور دعویٰ کرتے ہیں کہ انبیاء و اولیاء ندائے بعید کو بھی سُن سکتے ہیں، نہ صرف سُن سکتے ہیں بلکہ ہماری مدد بھی کر سکتے ہیں، لہٰذا انہیں پکارنا چاہیے یا محمداہ، یا غوث، یا خواجہ، یا نقشبند، یا بدوی یا شاذلی ہماری مدد کرو۔ اس میں انہیں نہ اشراک فی العلم کا کوئی شائبہ نظر آتا ہے اور نہ اشراک فی التصرف کا! انا للہ وانا الیہ راجعون:

ذرا ان کی پیش کردہ احادیث پر غور کرو۔ ”ابن سنی کتاب عمل الیوم واللیلہ میں دو روایتیں بیان کرتے ہیں۔ عبداللہ بن عمرؓ کے پیر میں چونٹیاں بھر گئی تھیں ان سے کسی نے کہا کہ آپ اپنے محبوب ترین شخص کو پکار دیں۔ انہوں نے یا محمداہ پکارا اور کھڑے ہو کر چلنے لگے۔ یہی حال عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا ہوا۔ انہوں نے یا محمد کا نعرہ مارا اور ایسے ہو گئے جیسے پیر سے بندھی رسی کھل گئی ہو“

یہ حدیث حصن حصین میں ان الفاظ میں ہے: اذا خدرت رجلہ فلیذکر احب الناس الیہ۔ اس کو موقوفاً ابن سنی نے نقل کیا ہے اور ظفر جلیل میں تحت الفائدہ یہ لکھا ہے کہ ”یاد کرے محبوب کو تاکہ حاصل ہو خوشی۔ پس کہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ سب سے زیادہ محبوب ہیں“۔

علماءِ حق نے اس حدیث کے متعلق جو تحقیق کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) یہ حدیث مرفوع نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول یا فعل ہو بلکہ موقوف ہے اور حدیث موقوف حجت نہیں خصوصاً جس وقت کہ صدہا آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ کے خلاف اور معارض ہو! چنانچہ علمائے اصول نے تصریح کر دی ہے کہ قول الصحابی لیس بحجۃ یعنی صحابی کا قول حجت نہیں۔

(۲) اس حدیث کو اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ پیر کے سُن ہو جانے کے وقت کسی محبوب کو یاد کرنا چاہیے، یاد کرنے سے خوشی حاصل ہوتی ہے اور خون جوش میں آتا ہے اور نتیجہ کے طور ”خدر“ دور ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک علاج طبی اور عملِ نفسیاتی ہے اور ادویہ طبیہ و

[1] اور اس وجہ سے کہ ان کا علم فروعِ مذاہب پر منحصر ہے۔

اعمالِ نفسیاتی کو دین میں کیا دخل! اطبا نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ خدر کا سبب اخلاط بلغمیہ و ریاحاتِ غلیظ ہیں، خوشی و فرحت سے خون میں جوش ہوتا ہے اور ریاح تحلیل ہو جاتی ہیں۔ دوست کا یاد کرنا خوشی پیدا کرتا ہے خوشی خون میں تغیر پیدا کرتی ہے اور نتیجہ کے طور پر مرض رفع ہوتا ہے، اس سلسلہ علت و معلول کا تعلق نہ ندائے بعید کے سننے سے نظر آتا ہے نہ اولیاء و انبیاء کی اعانت و مدد سے!

مزید تحقیق سے مندرجہ ذیل امور قابلِ لحاظ نظر آتے ہیں:۔

(۳) اس حدیث کی بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم کسی نبی سے تو کیا صحابی سے بھی نہیں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ کسی صحابی کے پیر سُن ہو گئے تو کسی نے کہا کہ تم اپنے محبوب ترین دوست کو یاد کرو، اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا معلم کوئی مجہول شخص ہے اور تعلیم مجہول حجت نہیں۔ چنانچہ نووی نے اذکار میں جو روایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں عن الھیثم بن جنش قال کنا عند عبد اللہ بن عمر فخدرت رجلہ فقال لہ رجل اذکر احب الناس الیک فقال یا محمد صلی اللہ علیک وسلم فکانما نشط من عقال۔ یعنی ہم عبد اللہ بن عمر کے ہاں تھے، ان کا پیر سُن ہو گیا۔ ایک شخص نے کہا کہ یاد کرو احب الناس کو تو اُنھوں نے کہا اے محمد رحمت کرے خدا آپ پر اور سلام نازل کرے۔ سو اسی وقت اُن کا پیر کھل گیا جیسے اونٹ رسی سے کھل جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس روایت سے بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس نسخہ کا بتلانے والا کون تھا۔

(۴) اس سلسلہ میں یہ امر نہایت ضروری ہے کہ ہم یاد کرنے کے صحیح معنی کا تعین کریں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یاد کرنا دو طرح پر ہو سکتا ہے:۔

ا۔ ایک وہ جس کا ثبوت شریعت میں ملتا ہے وہ یہ کہ آپ کے فضائلِ صحیحہ جو احادیث اور قرآن کریم میں وارد ہوئی ہیں ہم ان کا تذکرہ کریں جو مصائب اور آفات آپ نے ہماری ہدایت اور رہبری کی خاطر اٹھائی ہیں ان کو یاد کریں، آپ کے خصائل محمودہ، اخلاق حمیدہ، عادات پسندیدہ کا چرچا کریں۔

ب۔ دوسرا طریقہ جو قطعاً خلافِ شرع ہے یہ ہے کہ آپ کو دور سے پکاریں، ندا دیں، مدد مانگیں، استغاثہ کریں۔ یہ موہم شرک ہے اور قطعاً ناجائز، اس روایت سے تذکیر یا یاد کرنے کے معنی خلافِ شرع

مراد لینا مشرکانہ ذہنیت کا پتہ دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد آپ پر درود بھیج کر کرتا ہو جو حق تعالیٰ کا تعلیم کردہ طریقہ ہے، آپ کی احادیث کا چرچا کرتا ہو جو نزولِ رحمت کا باعث ہے۔

(۵) دیکھو بعض روایتوں میں لفظ "یا" مذکور ہی نہیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ندا ضروری نہیں اور تذکیر بغیر ندا کے ہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مجاہد کی روایت اسی پر دلالت کرتی ہے۔ عن مجاھد فقال خدرت رجل رجل عند ابن عباسؓ، فقال ابن عباس اذکر احب الناس الیک فقال محمد صلی اللہ علیہ وسلم فذھب خدرہ۔ یعنی مجاہد سے روایت ہے کہ ابن عباس کے پاس ایک شخص کا پیر سُن ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ اپنے محبوب ترین دوست کو یاد کرو انھوں نے کہا "محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان کا خدر جاتا رہا۔ اور خطاب جو مقرون بصلوٰۃ ہو وہ شرعاً جائز بھی ہے کیونکہ حدیث میں وارد ہے کہ درود کے پہنچانے کے لیے ملائکہ مقرر ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعہ درود کی اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو جاتی ہے۔ یا پھر شوق و محبت میں پکارا جا سکتا ہے اس میں آپ کے حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ منضم نہیں ہوتا جو صریحاً شرک ہے۔

(۶) اخیر میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ آثار نہ قولی ہیں نہ فعلی کہ ان کی تعمیم کی جائے اور ان سے یہ ثابت کیا جائے کہ ہر تکلیف یا مصیبت کے وقت احب الناس کو یاد کیا جائے، نیز یہ امر سلف سے ثابت بھی نہیں کہ مصیبت کے وقت ایسا کیا کرتے تھے!! اور نہ یہ کسی مجتہد مسلّم الاجتہاد کا مذہب ہے کہ مصیبت کے وقت 'احب الناس' کو یاد کیا جائے تاکہ مشکل حل ہو جائے آفت ٹل جائے اور مصیبت دور ہو جائے۔ اس کے برخلاف ہم نے اوپر قرآن کریم سے اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ مصیبت کے وقت ہر نبی نے حق تعالیٰ ہی کو پکارا، ان ہی سے اعانت چاہی اور غیر اللہ کا اس سلسلہ میں خیال بھی نہ آنے دیا، باآوازِ بلند کہا ؎

ایں بسکہ دلم جز تو ندارد کامے ‌ ‌ ‌ تو خواہ بدہ کام دلم خواہ مدہ[1]!

جن لوگوں کے قلوب میں غیر اللہ سے مدد سما گئی ہے اور یہ ان کی طبیعتوں میں رچ گئی ہے وہ

---

[1] جامیؒ کا پہلا شعر یہ ہے ؎ یا من ملکوت کل شئی بیدہٖ ‌ طوبیٰ لمن ارتضاک ذخراً لغدہٖ۔

ایک دوسری حدیث اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں: "حصن حصین میں حضرت[1] سے مروی ہے کہ آپ نے اس شخص کے متعلق جو راہ گم گشتہ ہو فرمایا کہ پکارے اعینونی یا عباد اللہ۔ "اے بندگانِ خدا تم میری مدد کرو" اس حدیث سے استناد کرکے کہا جاتا ہے کہ "ہم راہ گم گشتہ ہیں، ہم پکارتے ہیں: اعینونی یا عباد اللہ! یا غوث! یا خواجہ، یا نقشبند، یا بدوی، یا شاذلی ہماری مدد کرو!

حصن حصین کے الفاظ یہ ہیں: ان اراد عونا فلیقل یا عباد اللہ اعینونی یا عباد اللہ اعینونی یا عباد اللہ اعینونی (رواہ طبرانی) اس حدیث سے جو استدلال کیا گیا ہے اس پر علماء حق نے جو تنقید کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) اس حدیث کی سند میں ایک راوی ابن حسان ہے جو محدثین کے نزدیک منکر الحدیث ہے اور ہیثمی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے!

(۲) اس کی سند منقطع بھی ہے، بیچ میں ایک راوی چھوٹ گیا ہے اور منقطع کا حکم مثل مرسل ہے اور محدثین اور اہل اثر کی جماعت کے نزدیک یہ حجت نہیں!

(۳) اس حدیث کے راویوں میں ایک راوی عتبہ بن غزوان ہے وہ مجہول الحال ہے یعنی اس کا تقویٰ اور عدل معلوم نہیں۔ چنانچہ تقریب ابن حجر میں اسی بنا پر استدلال کیا گیا ہے کہ جب اس حدیث کا ایک راوی ضعیف اور مجہول الحال ہو تو یہ نہ قابلِ اعتماد ہے اور نہ لائقِ استدلال!

(۴) جرح سے قطع نظر کرکے اگر ہم اس حدیث کو تسلیم بھی کرلیں تو ہم عقلِ سلیم کا واسطہ دے کر پوچھتے ہیں کہ کیا یہ اموات سے استعانت پر دلیل ہو سکتی ہے؟ عباد اللہ سے مراد تو فرشتے ہیں جو حفاظت کے لیے معین و مقرر ہیں۔ چنانچہ فیض القدیر[2] شرح جامع الصغیر میں اس کی یوں توضیح کی گئی ہے۔ ان للہ ملائکۃ فی الارض یسمون الحفظۃ یکتبون ما یقع فی الارض من ورق الشجرۃ فاذا اصاب احدکم حرجۃ واحتاج الی عون بفلاۃ من الارض فلیقل

---

[1] ابن بریدہؓ اور ابن مسعودؓ کے درمیان۔ [2] فیض القدیر ج ا ص ۳۰۷ مطبوعہ مصر ۱۳۵۶ھ

اعینونی عباد اللہ رحمکم اللہ فان ان شاء اللہ یعان (رواہ ابن السنی والطبرانی من حدیث الحسن بن عمر عن معروف ابن حسانؒ عن سعید ابن ابی عروبۃ عن ابی بریدہ عن ابن مسعود وقال ابن حجر حدیث غریب ومعروف قالوا منکر الحدیث وقد تفرد بہ وفیہ انقطاع بین ابی بریدہ وابن مسعودؓ) یعنی اللہ کے کچھ فرشتے زمین میں مقرر ہیں جن کو حفظ اور نگہبان کہتے ہیں، جو درخت کا پتہ زمین پر گرتا ہے اس کو لکھا کرتے ہیں تو جب ہم میں سے کسی کو تکلیف پہنچے اور مدد کا محتاج ہو زمین کے کسی صاف میدان میں تو اس کو چاہیے کہ یوں کہے کہ اے خدا کے بندو میری مدد کرو، اللہ تم پر رحم فرمائے، ایسے کہنے سے بیشک مدد حاصل ہوگی"

دیکھو عباد اللہ سے مراد فرشتوں کا ہونا خود حدیث ہی سے ثابت ہے جو زندہ ہیں، اب اہلِ استمداد کا اموات کو اپنی مدد کے لیے پکارنا ان کی مشرکانہ طبیعت کی ایجاد ہے، حدیث سے اس کی اجازت کہاں نکلتی ہے ہم اوپر بتا آئے ہیں کہ قرآنِ کریم نے مخلوق سے استعانت ان امور میں جائز رکھی ہے جو ان کی قوت وقدرت کے احاطہ میں ہوں، یا استعانت بالمربوبیت یا عون مابین العباد ہے جب کسی کا گھوڑا بھاگ جائے یا کوئی چیز کھو جائے تو اس معاملہ میں ادنیٰ لوگوں سے بھی مدد لی جاسکتی ہے جس امر میں مخلوق سے استعانت کرسکتے ہیں اس میں ملائکہ، ابدال اور جنوں سبھی سے مدد لی جاسکتی ہے۔ یہ زندہ مخلوق سے ان امور میں استعانت کرنا ہے جو ان کے دائرہ قدرت میں شامل ہے۔ اب رہی وہ استعانت جو حق سے مخصوص ہے، استعانت بالربوبیت وہ کسی طرح اس حدیث سے ثابت نہیں ہوسکتی اور نہ کسی ذی علم و ذی ہوش نے اس کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ استعانت عن الاموات کا یہاں تو شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔

(۵) بفرضِ محال ہم مان لیتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور اس سے بات بھی وہی ثابت ہوتی ہے جو اہلِ استمداد سمجھتے ہیں! دعاء و استعانت کے متعلق اوپر جو تصریحات پیش کی گئیں

---

[1] منکر الحدیث (میزان ذہبی)

ان کو پیشِ نظر رکھ کر یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ حدیث جو خبرِ واحد ہے قرآن مبین کے معارض و مخالف ہے اور اسی وجہ سے رد کردی جانی چاہیے کیونکہ قرآن مقدم ہے، اس کا تقدم اس کی قطعیت، اس کے متواتر النظم ہونے اور اس کا سند کے محتاج نہ ہونے پر مبنی ہے۔

(۶) اس حدیث کے مخالف و معارض دوسری حدیث بھی اسی کتاب حصن حصین میں ملتی ہے جس کو طبرانی اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے، اذا اضاع لہ شیئاً اوابق فلیقل: اللھم رادالضالۃ وھادی الضلالۃ انت تھدی من الضلالۃ اردد علی ضالتی بقدرتک وسلطانک فانھا من عطائک وفضلک۔ یعنی "جب آدمی کی کوئی چیز گم ہو جائے یا اس کا غلام بھاگ جائے تو یوں دعا کرے: "اے خدا جو پھیر لاتا ہے گم ہوئی چیز کو، اے بھولے بھٹکے کی راہ بتلانے والے تو ہی راہ بتلاتا ہے بھول اور گمراہی سے، واپس دلا دے مجھ کو میری گم ہوئی چیز اپنی قدرت اور غلبہ سے کہ وہ چیز تیری بخشش اور احسان سے تھی"۔

علاوہ بریں ابن عباسؓ سے جو حدیث مروی ہے اور جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے اس میں صاف طور پر حکم دیا ہے فاذا استعنت فاستعن باللہ یہ معارض و مخالف ہے حدیث اعینونی کے اور ظاہر ہے کہ حدیث ابن عباس موافق ہے بحوائے کلام مجید کے لہذا اس کو دوسری حدیث پر ترجیح ہونی چاہیے۔

کیا غضب ہے یہ اموات کے پرستار زندہ خدا کو چھوڑ کر مردوں سے استعانت کرتے نہیں شرماتے اور اپنی بے شرمی کو رفع کرنے کے لیے کتاب وسنت سے دلائل تلاش کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں! لیکن کتاب وسنت سے تو بس یہی ثابت ہوتا ہے کہ مَا لَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (بقرہ۔۱۰۷) دیکھو حضرت جامیؒ نے اسی بات کو کس خوبی سے ادا کر دیا ہے:-

حق فاعل و ہر چہ جز حق آلات بود — تاثیر ز آلت از محالات بود

ہستی کہ موثر حقیقی ست یکیست — باقی ہمہ اوہام و خیالات بود

ندا اور استعانت کی تائید میں اہلِ استمداد ایک اور حدیث پیش کرتے ہیں، سوال خود پیش

کرکے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ "یارسول اللہ! یا غوث! پکارنا بھی کیا ناجائز نہیں؟ شرک نہیں؟ ترمذی، نسائی، طبرانی، ابن خزیمہ، حاکم، بیہقی نے یہ دعا روایت کی ہے: اللھم انی اسئلک واتوجہ الیک بحبیبک المصطفیٰ عندک یا حبیبنا یا محمد انا نتوسل بک الی ربک فاشفع لنا عند المولی العظیم یا نعم الرسول الطاہر۔ اللھم شفعہ فینا بجاھہ عندک۔ اس دعاء میں یا محمد کی ندا ہے اور حضرت عثمان کے زمانہ میں بھی اس دعا کو صحابہؓ نے خود پڑھا اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دی" تو سوال کا جواب یہ ہوا کہ یا رسول، یا غوث پکارنا شرک نہیں جائز ہے اور ادھر بھی دو حدیثوں سے استدلال کرکے اہل استمداد نے اپنی دانست میں ثابت کردیا ہے کہ یا خواجہ یا بدوی، یا شاذلی، یا نقشبند پکارنا جائز ہے۔

اس حدیث کی تحقیق یہ ہے:۔

(۱) مروی ہے ایک اندھے نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ میرے لیے حق تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ مجھے اس مرض سے شفا دیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تو چاہے تو میں دعا کروں اور چاہے تو نابینائی پر صبر کر کہ تیرے حق میں یہی بہتر ہے۔ اس نے عرض کیا کہ میرے لیے دعا ہی کیجیے۔ آپ نے خود دعا نہیں فرمائی بلکہ حکم دیا کہ وضو کرے اور پھر ارشاد فرمایا کہ یہ دعا پڑھے:۔ اللھم انی اسئلک واتوجہ الیک بنبیک نبی الرحمۃ یا محمد انی اتوجہ بک الی ربی فی حاجتی ھذا لتقضی لی فشفعہ فیّ[1] (ترمذی) نسائی، ابن ماجہ، حاکم نے روایت کی) اس نے یہ دعا پڑھی اور بینا ہو گیا۔ (کذا فی المشکوٰۃ)

(۲) یہ حدیث اعتقاد کے بارے میں قابلِ استدلال نہیں کیونکہ اس کا ایک راوی عثمان بن خالد متروک الحدیث ہے۔ فقہا و محدثین کے نزدیک ایسے راوی کی نقل قابلِ حجت نہیں۔ چنانچہ نووی کی تقریب اور اس کی شرح تدریب الراوی میں یہ مسئلہ مصرح ہے۔

---

[1] یا اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں اپنی حاجت اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں بذریعہ تیرے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ نبی رحمت ہیں۔ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں متوجہ ہوتا ہوں اپنے پروردگار کی طرف آپ کے ذریعے سے اپنی اس حاجت میں تاکہ میرے حق میں حاجت روائی کی جائے۔ الٰہی تو ان کی شفاعت میرے حق میں قبول فرما۔

(۳) اگر ہم اس حدیث کو بفرضِ محال قابلِ استدلال بھی مان لیں تو اس سے محض توسل ثابت ہوتا ہے نہ یہ کہ جب کوئی اس ندا اور خطاب سے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ بارگاہِ خداوندی میں پیش کرتا ہے تو آپ اس کی آواز سنتے ہیں جیسا کہ اہلِ استمداد ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ توسل میں کیا ہوتا ہے؟ متوسل کرتا کیا ہے؟ وہ طلبِ حاجت کرتا ہے اسی ذات سے جو عطا و منع میں مستقل و منفرد ہے جو صاحبِ امر و نہی ہے، جس کے ہاتھ میں ہر شے کا "ملکوت" ہے اور طلب سے پہلے ایک سبب اجابت کو آگے کر دیتا ہے۔ جیسا کہ صحیحین میں قصہ ان تین آدمیوں کا آیا ہے جو ایک غار میں بند ہو گئے تھے۔ ان میں سے ہر شخص نے اپنے سب سے اچھے عمل کے ساتھ توسل کیا اور وہ پتھر غار کے منہ سے ہٹ گیا۔ اگر یہ توسل بہ اعمالِ فاضلہ جائز نہ ہوتا یا شرک ہوتا تو حق تعالیٰ ان کی دعا کو قبول نہ فرماتے نہ حضورِ انورؐ اس حکایت کے بعد سکوت فرماتے۔

لیکن اگر متوسل یہ سمجھے کہ انبیاء یا ملائکہ ایسا واسطہ اور وسیلہ ہیں کہ جن کو پکارنا اور ان پر بھروسہ کرنا ضروری ہے اور طلبِ نفع اور دفعِ ضرر کے لیے ان کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور ان کی تعظیم بجا لانا چاہیے تو یہ سب سے بڑا شرک ہے۔ حق تعالیٰ نے اس کے رد میں بہت ساری آیتیں نازل فرمائیں۔ کفار و مشرکینِ مکہ نے اللہ کے سوا اوروں کو اپنا شفیع اور حمایتی قرار دے رکھا تھا، نفع حاصل کرنے اور ضرر دفع کرنے کے لیے ان ہی کی طرف رجوع کرتے تھے، مشرکین یہود و نصاریٰ، مسیحؑ اور عزیرؑ اور ملائکہ کو پکارتے تھے، استغاثہ کرتے تھے۔ حق تعالیٰ نے ان کے متعلق صاف طور پر صراحت فرما دی کہ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا۔

دیکھو بادشاہ اور رعایا کے درمیان عرض معروض کے لیے چوبدار عرض بیگی ہوتے ہیں جو بادشاہ کے کانوں تک رعایا کا درد دکھ پہنچاتے ہیں، اگر کوئی انبیاء و اولیاء کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ یہ بھی حق تعالیٰ کی جناب میں خلق کی حاجتوں کو پہنچاتے ہیں، ان کے درد دکھ کو سناتے ہیں اور حق تعالیٰ خلق کی جو حاجت روائی کرتے ہیں، ان کو رزق دیتے ہیں، ہدایت کرتے ہیں تو ان ہی کے واسطے سے لہٰذا خلق کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان ہی سے حاجت طلب

کریں اور وہ حق تعالیٰ سے عرض کریں جیسے کہ عرض بیگی بادشاہوں سے کرتے ہیں۔ تو ایسا عقیدہ رکھنے والا باتفاق اہل اسلام کافر و مشرک ہے۔ بعینہ یہی دین مشرکین کا ہے جو بت پرست ہیں، وہ اپنے بتوں کو انبیاء و صالحین ہی کی صورتوں پر بناتے تھے اور ان کو اپنے اور حق تعالیٰ کے درمیان واسطہ اور وسیلہ قرار دیتے تھے جو ان کو حق تعالیٰ سے قریب کر سکتے تھے[1] (کما صرح ص ۱۵۸) اور یہی وہ شرک ہے جس کی وجہ سے نصاریٰ معتوب ہوئے۔ ان کے متعلق قرآن مبین نے صراحت کی ہے۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ[2] (پ ۱۰ ع ۱۱) غرض حق تعالیٰ نے اس توحید کو قرآن کریم میں جا بجا بیان فرمایا ہے اور شرک کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ پھینکا ہے اور اس کی اصل صرف اتنی ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی سے خوف نہ کرے اور نہ کسی سے امید رکھے اور نہ کسی کو ان کے سوا اپنے کاموں میں کافی جانے ؎

موحد کہ در پائے ریزی زرش | وگر ارّہ می نہی بر سرش
امید و ہراسش نہ باشد ز کس | ہمیں است بنیاد توحید و بس

ذرا اس واسطہ یا وسیلہ کے مسئلہ پر عقلی پہلو سے بھی غور کر لو، عالم خارجی کی بادشاہت پر نظر ڈالو، یہاں بادشاہ اور رعایا کے درمیان وسائط تین ہی قسم کے ہوتے ہیں (۱) چونکہ خود بادشاہ اپنی تمام رعایا کے احوال کی خبر نہیں رکھ سکتا اس کو ایسے وسائل کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کو رعایا کے حال کی خبر دیتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا کوئی واسطہ خدا اور بندوں کے درمیان فرض نہیں کیا جا سکتا کیونکہ حق تعالیٰ پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ زمین و آسمان کا کوئی ذرہ ان کے علم محیط سے باہر نہیں، وہ "سمیع" و "بصیر" و "علیم" ہیں اور بفحوائے ھو بکل شی علیم ہر شئے سے

---

[1] من جعل بینہ وبین اللہ وسائط یتوکل علیھم ویدعوھم کفر اجماعاً لان ذلک کفعل عابدی الاصنام قائلین ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ۔ (اقناع اور اس کی شرح دیکھو)

[2] انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ کو رب بنا رکھا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی حالانکہ ان کو صرف یہ حکم کیا گیا ہے کہ فقط ایک معبود کی عبادت کیا کریں جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ وہ ان کے شرک سے پاک ہے۔

واقف!

(۲) چونکہ بادشاہ اکیلا سارے ملک کا انتظام نہیں کر سکتا اور نہ ہی تنہا اپنے دشمنوں سے جنگ کر سکتا ہے، لہٰذا اس کو اعوان و انصار کی ضرورت ہوتی ہے لیکن حق تعالیٰ کو نہ کسی ناصر و مددگار کی ضرورت ہے اور نہ کسی معین، ظہیر کی، وہ کائنات کے تمام اسباب و آلات کے خالق، رب، مالک ہیں، ان کی ذات تمام اشیاء سے غنی و بے نیاز ہے، سارا عالم ان کا فقیر و محتاج ہے، مملوک و مربوب ہے۔

(۳) چونکہ بادشاہ اپنی رعایا کی نفع رسانی اور خبر گیری میں سستی اور غفلت کر سکتا ہے، لہٰذا اس کو کسی ایسے محرک کی ضرورت ہے جو اس کو اپنے فرائض کی ادائی پر آمادہ کرے لیکن اس قسم کے کسی محرک کی حق تعالیٰ کو ضرورت نہیں کیونکہ وہ خود خلق پر ماں باپ سے زیادہ رحیم ہیں۔

عقائد کے ان بدیہیات کو ماننے کے بعد اگر کوئی یہ خیال کرے کہ حق تعالیٰ اور ان کے بندوں کے درمیان ان وسائط کی ضرورت ہے جو سلاطین اور رعایا کے درمیان ضروری ہیں اور وہ وسائط انبیاء، اولیاء، ملائکہ یا اور موجودات ہیں تو وہ کھلا بُت پرست ہے جو اپنے اصنام اور اولیاء کو حق تعالیٰ کے دربار میں شفیع، وکیل، حامی، مقرب سمجھتا ہے اور اسی خاطر ان کی عبادت کرتا ہے؛ وہ خالقِ اکبر کو مخلوقِ ابتر کے مشابہ سمجھتا ہے جو بغیر اپنے اعوان و انصار کے، بغیر اپنے معین و ظہیر کے کائنات کا انتظام ہی نہیں کر سکتا۔ فَلَا تَضْرِبُوا لِلّٰہِ الْاَمْثَالَ تعالی اللہ عن ذٰلک علوا کبیرا۔[1]

شفاعت اسی سلسلہ میں شفاعت کا صحیح طور پر علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ شفاعت کے معنی ہیں سفارش، دنیا میں سفارش یا شفاعت کئی قسم کی ہوتی ہے۔

(۱) شفاعتِ وجاہت: بادشاہ کے دربار کا ایک امیر، بادشاہ کے پاس ایک چور کی سفارش کرتا ہے جس کی چوری ثابت ہے، بادشاہ سزا دینا چاہتا ہے لیکن اس امیر کی سفارش سے دب کر اس چور کی تقصیر کو معاف کر دیتا ہے تاکہ امیر کی ناخوشی کی وجہ سے امورِ سلطنت میں خلل نہ پڑے۔

---

[1] ان امور کی مزید توضیح کے لیے دیکھو ابن تیمیہؒ کا رسالہ قاعدہ واسطیہ جو توسل پر ایک بے نظیر رسالہ ہے جس سے ہم نے یہاں استفادہ کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو شخص کسی فرشتے یا نبی یا ولی کو حق تعالیٰ کی جناب میں اس قسم کا شفیع سمجھتا ہے وہ سخت جاہل اور کھلا مشرک ہے۔

(۲) شفاعتِ محبت:۔ اس چور کی سفارش بادشاہ کا کوئی معشوق یا منظورِ نظر کرتا ہے اور بادشاہ اس کی محبت سے ناچار ہو کر چور کو معاف کر دیتا ہے اور اپنا غصہ پی جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی بھی شفاعت حق تعالیٰ کی بارگاہ میں تصور نہیں کی جا سکتی۔ بندہ اپنی عبودیت کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا!

(۳) شفاعت بالاذن: اس چور کی سفارش بادشاہ کی مرضی پا کر، اس کی اجازت سے کی جاتی ہے، نہ اس وجہ سے کہ سفارش کرنے والا اس کا قرابتی ہے یا آشنا یا حمایتی۔ بس یہی ایک شفاعت حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ممکن ہے۔ اسی کا ذکر قرآن کریم و احادیثِ نبوی میں آیا ہے۔ شفاعت بالاذن کے متعلق مندرجہ ذیل چند امور کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

(۱) شفاعت نہ ہوگی مگر حق تعالیٰ کے اذن سے، ان آیات سے اس کی توضیح ہوتی ہے:۔

ا۔ یَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا (پ ۱۶ ع ۱۵) اس روز سفارش نفع نہ دیگی مگر اس شخص کے لیے جس کے واسطے اللہ تعالیٰ نے اجازت دیدی ہو اور اس شخص کے واسطے بولنا پسند کر لیا ہو۔

ب۔ مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِندَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (پ ۳ ع ۲) ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس سفارش کر سکے بدوں اس کی اجازت کے۔

ج۔ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِن بَعْدِ أَن يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَن يَشَاءُ وَيَرْضَىٰ (پ ۲۷ ع ۶) یعنی ان کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آسکتی مگر بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہیں اجازت دیدیں اور راضی ہوں۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ شفاعت حق تعالیٰ کے حکم و اجازت سے ہوگی نہ شفیع کی مختاری و خود رائی سے کہ اپنے جس دوست کے حق میں چاہا بغیر مرضیِ حق کے معلوم کرنے اور بدون اجازت سفارش کر دی۔

کفار و مشرکین یہی سمجھتے تھے کہ ان کے معبود ان کی سفارش کرینگے اور عذاب سے بچالینگے اس سفارش کو حق تعالیٰ باطل کررہے ہیں اور جس سفارش کو ثابت کررہے ہیں وہ اس بندۂ محکوم کی شفاعت ہے جو اپنے مالک و مولیٰ کے سامنے بدون اس کی اجازت وامر کے پیشقدمی نہیں کرتا پہلی قسم کی شفاعت "شریک" کی شفاعت ہے اور حق تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں، دوسری قسم کی شفاعت بندۂ محکوم کی ہے وشتان بین ذٰلك جب یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ حق تعالیٰ جس کو چاہیں گے اسی کے واسطے سفارش کا حکم دینگے تو یہ بات بھی کھل جاتی ہے کہ واقع میں سفارش حق تعالیٰ ہی کی ہوئی اور جو شخص ان کے سامنے سفارش کریگا وہ ان کے امر واجازت سے کریگا۔ ابن قیم کے الفاظ میں "وہ ذات پاک خود اپنے نفس سے سفارش کریگی یعنی اپنے آپ ہی بندہ پر رحم کرنا منظور ہوگا۔ یہی معنی ہیں قُلْ لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا کے اور نیز اس آیت کے مَا لَهُمْ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ اللہ کے سوا نہ کوئی ولی ہے اور نہ شفیع" اور جس نے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا ولی و شفیع ٹھہرایا، اس کی مثال ایک مکڑی کی سی ہے جس نے ایک گھر بنایا جو سب سے زیادہ بودا اور کمزور ہے!! تھوڑی دیر کے لیے اس آیت پر غور کرو، شرک فی التصرف اور شفاعت کو کس خوبی سے رد کیا جارہا ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ۔ یعنی آپ فرمائیے کہ جن کو تم خدا کے سوا سمجھ رہے ہو ان کو پکارو، وہ ذرہ برابر اختیار نہیں رکھتے، نہ آسمانوں میں اور نہ زمینوں میں اور نہ ان کی ان دونوں میں کوئی شرکت ہے اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے اور خدا کے سامنے سفارش کسی کی کام نہیں آتی مگر اس کے لیے جس کی نسبت وہ اجازت دیدے (پ ۲۲ ع ۹) مشرک نے جس کو اپنا معبود قرار دے رکھا ہے اس سے وہ نفع کی اُمید کرتا ہے اور نفع اسی سے پہنچ سکتا ہے جس میں ان چار صفات میں سے کم از کم ایک صفت ہوتی ہے

۱۔ یا تو وہ اس شئے کا مالک ہو جس کی اُمید یہ عابد کررہا ہے اور جس کے لیے وہ دعا کررہا ہے۔

۲۔ اگر مالک نہ ہو تو مالک کا "شریک" ہو۔

۳- اگر شریک بھی نہ ہو تو کم از کم اس کا معین و ظہیر یعنی مددگار ہو۔

۴- اگر معین و ظہیر بھی نہ ہو مالک کے نزدیک شفیع ہو۔ (ابن قیم)

ان ہی چار صورتوں میں عابد کو اپنے معبود سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اب حق تعالیٰ ان چاروں کی ترتیب وار نفی فرما رہے ہیں، اعلیٰ صفت سے شروع کر کے ادنیٰ صفت کی طرف رجوع فرماتے ہیں، ملک و شرکت و مظاہرت (مددگاری) و شفاعت کی کلی نفی فرمائے ہیں اور اس شفاعت کا اثبات کیا جا رہا ہے جس سے مشرک کو کوئی فائدہ نہیں اور یہ شفاعت حق تعالیٰ ہی کے اذن سے ہوگی۔ یہ آیت ایک نور ہے، برہان ہے۔ اس سے توحید کا قطعی اثبات ہوتا ہے اور شرک کی ساری جڑیں کٹ جاتی ہیں۔

(۲) اذن نہ ہوگا مگر اس شخص کے لیے جس کے قول و فعل کو حق تعالیٰ پسند فرمائیںگے۔

حق تعالیٰ شفاعت کا حکم اسی شخص کی نسبت عطا فرمائیںگے جو قول و فعل کے لحاظ سے ان کا پسندیدہ ہوگا۔ لَا يَشْفَعُونَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى (پ ۲۶) یعنی جن کو شفاعت کا اذن دیا گیا ہے وہ بجز اس کے جس کے لیے خدائے تعالیٰ کی مرضی ہو اور کسی کی سفارش نہیں کر سکتے۔

(۳) کسی کا قول و عمل پسند نہ ہوگا مگر توحید و اتباعِ رسول۔

ابو العالیہ فرماتے ہیں کلمتان یسئل عنهما الاولون والاخرون، ما ذا کنتم تعبدون وماذا اجبتم المرسلین۔ یعنی دو باتوں کا تمام اولین و آخرین سے سوال کیا جائیگا، تم کس کی عبادت کرتے تھے اور تم نے رسولوں کی کن کن باتوں پر عمل کیا؟ حدیث ابو ہریرہ میں آیا ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ من اسعد الناس بشفاعتك یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا من قال لا الٰہ الا اللہ خالصاً من قلبہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت اہلِ اخلاص کے لیے ہوگی جنہوں نے کوئی شرک نہیں کیا۔ بخاری نے ابو ہریرہؓ سے جو روایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ شفاعتی لمن قال لا الٰہ الا اللہ مخلصا یصدق قلبہ لسانہ ولسانہ قلبہ۔ اس کو امام احمد نے صحیح کہا ہے۔ مسلم نے جو روایت ابو ہریرہ سے کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:-

انی اختبات دعوتی شفاعۃ لامتی یوم القیامۃ فھی نائلۃ ان شاء اللہ، من مات لا یشرک باللہ شیئاً۔

شفاعت کے متعلق ان تین اصول کو سمجھ جانے کے بعد شرک کا استیصال ہو جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر جس نے یہ سمجھ لیا کہ شفاعت حق تعالیٰ ہی کے حکم و اجازت سے ہوگی اور اسی کے لیے ہوگی جس کے قول و فعل کو وہ پسند کرتے ہوں گے اور وہی قول و فعل ان کو پسند ہوگا جو شرک و بدعت سے منزّہ اور توحید و سنت کے مطابق ہو تو اب وہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو اپنا شفیع کیسے ٹھہرا سکتا ہے اور مشرکین کی طرح ھٰؤلاءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللّٰہِ کا کب قائل ہو سکتا ہے، حق تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف کس طرح اپنے قلب کو رجوع کر سکتا ہے، وہ جانتا ہے کہ افضل ترین مخلوقات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز ہوں گے، اپنے رب، اپنے مولیٰ و مالک کی حمد و ثنا میں رطب اللسان ہوں گے لیکن سجدہ سے سر نہ اٹھائیں گے اور شفاعت کے لیے اس وقت تک زبان نہ کھولیں گے جب تک کہ حق تعالیٰ کی اجازت نہ ہوگی کہ "قل تسمع واشفع تشفع وسل تعطہ"[۱] پھر آپ نے تصریح فرما دی کہ فیحد لی حداً، کہ میرے لیے ایک حد مقرر کر دی جائے گی یعنی آپ شفاعت ان ہی کی فرمائیں گے جن کا قول و فعل حق تعالیٰ کو پسند ہوگا، یعنی جو مشرک نہ ہوگا، جس نے صدق دل سے توحیدِ الوہیت کا اقرار کیا ہوگا! اسی کی شفاعت کا اذن ہوگا اور اس کی شفاعت کی جائیگی اور اسی پر حق تعالیٰ رحم کرنا منظور فرمائیں گے!! اسی کی بالآخر نجات ہوگی! جب اذنِ شفاعت دینے والے حق تعالیٰ ہی ہیں، اور قبول کرنے والے بھی وہی ہیں، مشفوع لہ کو ایسے کاموں کی توفیق دینے والے بھی وہی ہیں جس کی وجہ سے وہ مستحقِ شفاعت ٹھہرتا ہے تو پھر صاف ظاہر ہے کہ شفاعت در حقیقت حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے! قُل لِّلّٰہِ الشَّفَاعَۃُ جَمِیْعًا کے یہی معنی ہیں! یہی وجہ ہے کہ جس شخص نے اپنے اللہ ہی کو معبود ٹھہرایا، اسی کے لیے اذنِ شفاعت ہوگا، اور جس نے غیر اللہ کو معبود ٹھہرایا اس کی نہ کوئی شفاعت کریگا اور نہ کوئی شفاعت اس کے ....

---

[۱] متفق علیہ کہو سنا جائیگا۔ شفاعت کرو قبول کی جائیگی۔ مانگو! دیا جائیگا۔

لیے مفید ہوگی۔ ان ہی "متخذین شفعاء" کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے: قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۔ یعنی کیا تم خدا کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جو خدا کو معلوم نہیں نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں، وہ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے (پ ۱۱ ع ۸) اس طرح ان کے افترا و شرک کو ظاہر فرما دیا!

نذر لغیر اللہ مشرکین کی عبادت کا ایک اور عمل جس پر ہمارے مقالہ کے آخر میں بحث کرنی باقی ہے وہ "نذر لغیر اللہ" ہے۔ مشرکین اپنے مال کا ایک حصہ غیر اللہ کی نذر و نیاز کے لیے صرف کرتے تھے، ان کے لیے جانور ذبح کرتے تھے، اس طرح ان کی تعظیم و تکریم کرتے تھے: وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا (پ ۸ ع ۳) اور اللہ تعالیٰ نے جو کھیتی اور مواشی پیدا کیے ہیں، ان لوگوں نے ان میں سے کچھ حصہ اللہ کا مقرر کیا اور بزعمِ خود کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کا ہے اور یہ ہمارے معبودوں کا" ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا	یہ لوگ ہماری دی ہوئی چیزوں میں ان کا حصہ لگاتے ہیں
مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ۭ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔــلُنَّ عَمَّا	جن کے متعلق ان کو کچھ علم نہیں قسم ہے خدا کی تم سے تمہاری
كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ (پ ۱۴ ع ۱۳)	ان افترا پردازیوں کی ضرور باز پرس ہوگی۔

حضرت شاہ عبد القادرؒ ان آیات کی تفسیر میں صراحت فرماتے ہیں کہ "کافر اپنی کھیتی اور مواشی کے بچوں میں اور تجارت میں سے اللہ کی نیاز نکالتے اور بتوں کی بھی نیاز نکالتے تھے جنہیں وہ اپنی جہالت اور بے خبری سے معبود، یا مالکِ نفع و ضرر سمجھتے تھے حق تعالیٰ ان کے اس ظلم اور بے انصافی اور افترا پردازی کی مذمت فرما رہے ہیں۔

نذر و نیاز کا رواج اسلام کی "غربت" کے اس زمانہ میں اس کثرت سے ہوگیا ہے کہ یہیں یہاں اس کی تحقیق ضروری نظر آتی ہے۔ ہر زمانہ کے مشرکین کے قلوب میں ایک نمایاں تشابہ ہوتا ہے، وہ وہی بات کہتے ہیں اور وہی عمل کرتے ہیں جو ان سے پہلے گزرنے والے مشرکین نے کہی تھی اور اس پر عمل کیا تھا۔ "كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ (پ ۱ ع ۱۴)

نذر (نیاز) لغت میں وعدہ کرنا ہے نیکی کا ہو یا بدی کا اور شرع میں کسی عبادت کا لازم کرلینا ہے جو لازم نہیں تھی۔ نذرت نذرًا اذا اوجبت علی نفسك شیئًا تبرعًا من عبادة او صدقة او غیر ذلك (نہایہ) تمام فقہاء نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ نذر اللہ کی قربت اور عبادت ہے چنانچہ قاضی حسین اور متولی اور رافعی، اور سوا ان کے دوسرے علماء شافعیہ اور زین الدین بن نجیم اور علامہ قاسم وغیرہ علمائے حنفیہ نے اپنی تصانیف میں اسی کی صراحت کی ہے اور

وَمَا أَنفَقْتُم مِّن نَّفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُم مِّن نَّذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهُ (پ ۳ ع ۵) اور تم لوگ جو کسی قسم کا خرچ کرتے ہو یا کسی طرح کی نذر مانتے ہو تو حق تعالیٰ کو سب کی یقینًا اطلاع ہے۔

سے بھی یہی بات مترشح ہوتی ہے۔ چنانچہ تفسیر ابو المسعود میں وضاحت کی گئی ہے کہ او نذرتم، النذر عقد الضمیر علی شیء والتزامہ" یعنی نذر دل میں کسی چیز کا ارادہ کرنا اور اس کو لازم کرلینا ہے۔

جب نذر عبادت[1] ہوئی تو غیر اللہ کے لیے اس عبادت کا بجا لانا شرعًا صریح شرک ہے۔ عوام الناس بزرگوں کی جو نذر و نیاز کرتے ہیں وہ حاجت برآری کے خیال ہی سے کرتے ہیں یا تو کسی مقصد کا حصول پیش نظر ہوتا ہے یا پھر کسی بلا کا ٹالنا، گویا اس طرح وہ ان بزرگوں کو رشوت دینا چاہتے ہیں، اس خیال سے تو حق تعالیٰ کی نذر بھی روا نہیں کہ وہ ذاتِ مقدس بھی اخذِ رشوت سے پاک ہے چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لا تنذروا فان النذر لا یغنی من القدر شیئًا وانما یستخرج بہ من البخیل (متفق علیہ) یعنی نذر نہ مانو اس لیے کہ نذر تقدیر کے نوشتے کو نہیں مٹا سکتی، اس کے ذریعہ تو فقط بخیل کا مال نکالا جاتا ہے۔ طیبی نے اس حدیث کی شرح میں وضاحت کردی ہے کہ "جس نذر سے روکا گیا ہے وہ نذر مقید ہے جس کا ماننے والا یہ خیال کرتا ہے کہ وہ تقدیر کے لکھے سے بچا لیتی ہے، جیسا کہ بہت لوگوں نے سمجھ رکھا ہے اور ہم اپنے زمانہ کی کتنی جماعتوں کو اسی اعتقاد پر پلتے ہیں"۔

غرض عوام جو بزرگوں کی نذر کرتے ہیں ان سے پوچھنا چاہیے کہ تمہاری اس نذر کا مقصد کیا ہے؟

[1] مقابلہ کرو شامی ج ۲ ص ۱۳۹، والنذر للمخلوق لا یجوز لانہ عبادة والعبادة لاتکون للمخلوق۔

۱۔ تقرب اور عبادت؟ یہ تو صریحاً شرک ہے۔

۲۔ مقصود یابی اور حاجت براری؟ یہ بھی شرک و حرمت دونوں پر مشتمل ہے۔

۳۔ ایصال ثواب؟ ہاں یہ جائز ہے، لیکن یہاں نیت کی تصحیح سخت ضروری ہے، غور کرو، تمہیں خود اپنی نجات کی فکر کرنی چاہیے، خود ثواب کمانے پر مائل ہونا چاہیے اس کو چھوڑ کر تمہیں دوسروں کو ثواب پہنچانے کی فکر زیادہ دامن گیر معلوم ہوتی ہے اور پھر تمہارے آباؤ اجداد اس امر کے زیادہ مستحق ہیں کہ تم انہیں ثواب پہنچاؤ، اس کا تم کو زیادہ خیال نہیں ہوتا، پیروں اور شہیدوں کی نیاز اور فاتحہ التزام کے ساتھ کرتے ہو، ذرا اپنے قلب کی طرف ایمان کی روشنی میں دیکھو، کیا تمہاری غرض یہ تو نہیں کہ ایسا کرنے سے تمہارے مال میں برکت ہوگی، بال بچے تندرست اور عافیت سے رہینگے، تجارت میں خسارہ نہ ہوگا، زمانہ کے لکد کوب سے نجات ملیگی۔ اگر تم اس غرض سے نذر و نیاز بزرگوں کی کیا کرتے ہو (مثلاً حضرت پیرؒ کی گیارہویں یا کندوری دسترخوان یا سرمنی) تو مشرکین کی طرح تم ان بزرگوں کو اپنا معبود بنا رہے ہو، ان کو نفع و ضرر کا مالک سمجھ رہے ہو، اور یہ کھلا شرک ہے! اس کی تصریح قرآن و حدیث سے اوپر تفصیل کے ساتھ کی گئی ہے۔ علامہ قاسم شارح درر کے اس بیان پر غور کرو۔

النذر الذی ینذرہ اکثر العوام کان یقول یا سیدی فلان یعنی بہ ولیا او نبیا ان ردغائبی اوعوفی مریضی او قضیت حاجتی فلک من الذہب او الفضۃ او الطعام والشراب او الزیت کذا فہذا باطل بالاجماع لانہ نذر مخلوق وہو لا یجوز، لان النذر عبادۃ والعبادۃ لا یکون لمخلوق والمنذور لہ میت والمیت لا یملک وانہ ان ظن ان المیت یتصرف فی الامور کفر الا ان قال: یا اللہ انی نذرت لک ان فعلت معی کذا ان اطعم الفقراء الذین بباب السیدۃ النفیسۃ او الامام الشافعی ونحوہ فیجوز حیث یکون فیہ نفعا للفقراء والنذر للہ۔

یعنی وہ نذر جو عوام الناس کرتے ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ اے میرے بزرگ (کسی ولی یا نبی کو مخاطب کرکے) اگر میرا غائب واپس آجائے یا بیمار اچھا ہو جائے، یا میری حاجت برآئے تو آپ کے لیے اتنا سونا

یا چاندی یا طعام و شربت یا تیل بطور نذر پیش کرونگا۔ سو یہ باطل ہے بالاجماع، اس لیے کہ یہ مخلوق کی نذر ہے اور یہ جائز نہیں کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کی روا نہیں، جس کے لیے نذر مانی ہے وہ میت ہو اور میت کسی چیز کا مالک نہیں، اور اگر اس کے ساتھ ساتھ وہ نذر ماننے والا یہ بھی خیال کرے کہ میت کو کاموں میں اختیار حاصل ہو تو وہ کافر ہو جائے۔ ہاں اگر وہ یہ کہے کہ "یا اللہ میں نے تیری نذر کی کہ اگر تو میرے ساتھ یہ معاملہ کرے تو میں سیدہ نفیسہ والے فقیروں کو کھانا کھلاؤنگا، یا امام شافعیؒ کے دروازے والوں کو کھانا دونگا" تو یہ جائز ہے کیونکہ اس میں نفع ہے فقیروں کا اور نذر ہے اللہ عزوجل کی"۔

دیکھو اس بیان کا تجزیہ کرنے سے مندرجہ ذیل امور واضح طور پر پیش ہو جاتے ہیں۔

١۔ عوام کالانعام جو نذر اپنے پیروں، بزرگوں کی حاجت براری کی خاطر کرتے ہیں وہ بالاجماع باطل ہے اور قطعاً شرک ہے، کیونکہ

٢۔ مخلوق کی نذر کسی معنی میں جائز نہیں اس لیے کہ وہ عبادت ہو اور سوائے خالق کے کسی کے لیے روا نہیں۔

٣۔ عوام کی غرض بزرگوں کی نذر و نیاز سے یہی ہوتی ہے کہ آفات و بلیات سے وہ محفوظ رہیں، مال و دولت میں اضافہ ہو، صحت و عافیت حاصل ہو، اگر وہ زبان سے اس امر کا اقرار بھی کریں کہ ہمیں صرف ایصالِ ثواب ہی منظور ہے تو بھی وہ اپنے نفس کو دھوکہ دے رہے ہیں، انہیں ایمانداری کے ساتھ اپنے نفس کا محاسبہ کرنا چاہیے۔

٤۔ یہ بھی کہنا درست نہیں کہ یہ فلاں ولی یا نبی کی نذر ہے بلکہ انہیں یہ کہنا چاہیے کہ یہ اللہ کی ہے اور ثواب اس کا فلاں کو پہنچے۔

اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہو کہ کسی نبی یا ولی کی نذر مانی بھی جائے تو وہ منعقد نہیں ہوتی کیونکہ لا وفاء لنذر فی معصیۃ[1]۔ یعنی نذر معصیت کی وفا ضروری نہیں۔ اور ظاہر ہو

[1] یہ حدیث مسلم بن عمران بن حصین سے مرفوعاً مروی ہے۔

کہ عبادت غیر اللہ معصیت ہے اور نذر منجملہ عبادات ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ "من نذر ان یطیع اللہ فلیطعہ ومن نذر ان یعصیہ فلا یعصہ" جس نے اللہ کی اطاعت کی نذر کی اس کو چاہیے کہ اطاعت کر کے اپنی نذر پوری کرے اور جو اللہ کی نافرمانی کی نذر کرے وہ نافرمانی نہ کرے۔

توحیدِ الوہیت کی جو تفصیل اوپر پیش کی گئی اس کا خلاصہ صرف اتنا ہے کہ دعوئی کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی رو سے اللہ تعالیٰ ہی ہمارے الٰہ قرار پاتے ہیں، الٰہ کے معنی ہیں معبود و رب، یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہمارے معبود ہیں اور ہمارے رب، اللہ تعالیٰ کے سوا ہمارا نہ کوئی معبود اور نہ کوئی رب یا مستعان۔ توحیدِ الوہیت میں یہی "توحیدِ معبودیت" و "توحید ربوبیت" شامل و داخل ہیں۔ شرک واقع ہوتا ہے عبادت و استعانت ہی کی راہ سے، یعنی اگر غیر اللہ کی عبادت کی جائے، یا اس سے استعانت کی جائے تو شرک پیدا ہوتا ہے۔ دیکھو قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (پ ۸۶) سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شرک الوہیت ہی کی راہ سے پیدا ہوتا ہے۔ واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئاً سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر اللہ کی عبادت شرک ہے اور قل انما ادعو ربی ولا اشرک بہ احداً سے واضح ہوتا ہے غیر اللہ کو پکارنا (دعا و ندا) شرک ہے ایاک نعبد و ایاک نستعین کی تعلیم دے کر عبادت و استعانت کو بطریق حصر حق تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص کر دیا گیا اور اس طرح توحیدِ الوہیت کی کامل حفاظت کر دی گئی۔

توحیدِ الوہیت کے اس معنی کو پیش نظر رکھ کر مشرکین عرب کی عبادت پر غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ اپنے اصنام و اوثان (غیر اللہ) کو مقرب و شفیع جان کر ان سے وقت حاجت فریاد رسی چاہتے تھے اور اپنے مال کا ایک حصہ ان کی نذر و نیاز کے لیے صرف کرتے تھے۔ قرآن کریم اور احادیث کی روشنی میں بتلایا گیا کہ استغاثہ استعانت، دعا و ندا، نذر و نیاز سب افعال عبادت ہیں۔ لہٰذا ان افعال کا تعلق صرف حق تعالیٰ ہی سے ہونا چاہیے۔ مشرکین نے ان کا تعلق غیر اللہ سے روا رکھا تھا اسی لیے انہیں تہدید کی گئی کہ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ پس ان کا شرک بھی

غیراللہ کی عبادت اور اس سے استعانت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ حق تعالیٰ کے وجود کے منکر نہ تھے اور نہ ان کی ذات ہی میں کسی غیر کو شریک کرتے تھے۔

غیراللہ کی عبادت ہی شرکِ محض اور کفرِ بحت ہے، یہ شرکِ اکبر انسان کے خون و مال کو حلال کر دیتا ہے اور اس کو "مخلد فی النار" بنا دیتا ہے، جب کسی کے کانوں تک توحید کی دعوت پہنچ چکی اور اس پر حجت کا قیام ہو گیا اور اس کے باوجود وہ شرک پر جا رہا اور کفر کا اعلان کرتا رہا تو وہ کافر مشرک ہو گیا، اب اس کی نجات کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں کہ وہ کفر و شرک سے توبہ کرے اور توحید پر ایمان لائے اور اگر نام کا مسلمان ہے تو تجدیدِ اسلام کرے۔

احادیثِ نبویہ میں کلمۂ توحید کے چند قیود و شرائط بیان کیے گئے ہیں، مثلاً کسی قسم کا شبہ الوہیتِ الٰہی میں نہ کرے، متکبر نہ بنے، جائز نہ ہو، یہ کلمہ اس کو گناہوں سے روکے وغیرہ۔ انسان جب ان پر غور کرتا ہے تو اس کو اپنی ہلاکت کا خوف پیدا ہوتا ہے۔ پھر ان لوگوں کا کیا ذکر جو غیراللہ کی عبادت بجا لا کر کھلے شرک و کفر میں مبتلا ہیں۔ ائمہ اربعہ نے تارکِ صلوٰۃ، مانعِ زکوٰۃ، یا تارکِ اذان یا نمازِ عید سے قتال کرنا واجب قرار دیا ہے کیونکہ یہ شعائرِ اسلام ہیں، پھر اہلِ شرک و کفر سے قتال کا کیا ذکر، بعض نے تو اس پر اجماع بھی نقل کیا ہے۔ جب نماز، روزہ، حج یا زکوٰۃ کے ترک کرنے سے کفر لازم آتا ہے تو ترکِ توحید و اخلاص سے کس طرح شرک لازم نہیں آئیگا۔ امرت ان اقاتل الناس حتیٰ یشھدوا ان لا الٰہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ ویقیموا الصلوٰۃ ویوتوا الزکوٰۃ فاذا فعلوا ذٰلک عصموا منی دماء ھم واموالھم الا بحق الاسلام وحسابھم علی اللہ!

مقالہ کے دوران میں جو آیتیں شرک و کفر کے رد میں پیش کی گئیں ان کو عرب ہی کے مشرکین کفار اور عابدینِ اصنام و اوثان کے حق میں سمجھنا غلطی ہے۔ ان کا اطلاق ہر زمانہ کے مشرکین پر ہوتا ہے، ہر زمانہ کے مشرکوں کے درمیان ایک ہی امر جامع ہے اور وہ شرک باللہ ہے لہٰذا حکم ایک ہی ہوگا کیونکہ جامع موجود ہے اور فارق معدوم، چنانچہ اصولِ فقہ کا قاعدہ بھی یہی ہے کہ العبرۃ

لہ اسی کو پیش نظر رکھ کر شاید اقبال نے کہا ہے ؎ چو می گویم مسلمانم بلرزم ۔ کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را ۔ (ارمغان حجاز)

بعموم الالفاظ لا بخصوص المواد (یعنی اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص سبب کا، سارے احکام شرعیہ کا مدار اسی اصول پر ہے اور حدیث میں صراحت کی گئی ہے کہ "حکمی علی الواحد کحکمی علی الجماعۃ" اس کے انکار سے یہ بات لازم آئیگی کہ جو حکم کسی خاص سبب کی بنا پر کسی گزشتہ واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوا ہے وہ اسی کی حد تک محدود رہے اور متعدی نہیں، یہ قطعاً باطل ہے۔ اس سے احکامِ شرعیہ کا تعطل لازم آتا ہے۔ کیونکہ جتنی آیاتِ حدود و جنایات و مواریث ہیں وہ سب خاص خاص واقعات ہی کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں لیکن ان کا حکم عام ہے اور قیامت تک باقی ہے۔ چنانچہ ابنِ عباسؓ نے ان آیات کی بابت جو بنی اسرائیل کے حق میں اتری ہیں فرمایا تھا: ھذا نزل علی بنی اسرائیل وانہ علینا مثلھم وما اشبہ اللیلۃ بالبارحۃ۔ اسی چیز کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ نعم الاخوۃ بنی اسرائیل اذ کان کل حلوۃ لکم وکل مرۃ لھم! اور ائمہ ثلاثہ نے تو اس امر کی صراحت کردی ہے کہ شرائع ماقبل ہمارے لیے بھی شرع ہیں اور امام شافعیؒ بھی اسی اصول کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن اسی صورت میں جب کہ اس کی توضیح ہماری شرع میں بھی آچکی ہو۔ جب ہماری شریعت نے بھی ان مسائل کی توضیح کردی ہے۔ اور کتاب وسنت ان پر ناطق ہیں۔ ان کا تعلق امم سابقہ اور مشرکینِ عرب ہی کے ساتھ سمجھنا کس قدر فاحش غلطی ہے۔

پھر ذرا غور تو کرو کہ جس چیز سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکینِ عرب کو منع فرمایا، خلاف ورزی پر ان سے مقاتلہ فرمایا، جس پر قرآنِ مبین نازل ہوا وہ شرک ہی تو تھا اور کفران کے متعلق ساری آیتیں محکم ہیں اور غیر منسوخ، اول و آخر ہر ایک کے لیے یکساں ہیں، علاوہ ازیں قرآن کریم میں ایسی آیتیں بھی ہیں جو خاص انبیاء بلکہ افضل الانبیاء اور مومنین کے حق میں اتری ہیں ان میں شرک کو حبطِ اعمال قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ انعام میں اٹھارہ پیغمبروں کے نام لے کر ارشاد ہوتا ہے کہ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ، کسی جگہ خطاب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوتا ہے لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ ایک جگہ اہلِ ایمان کے متعلق خبر دی گئی ہے کہ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُوْنَ!

ہمارے اس زمانہ کے مومن مشرک بمصداقِ حدیث لتتبعن سنن من قبلکم اپنے پیشرو مشرکینِ عرب اور یہود و نصاریٰ کے نقشِ قدم پر "توحید الوہیت" ہی کا انکار کر رہے ہیں یعنی وہ اس امر کے قائل نہیں رہے کہ حق تعالیٰ کے سوا اور کوئی لائقِ دعا و عبادت، خوف و رجا، استعانت و استغاثہ نہیں جس کے لیے جانور ذبح کیا جائے یا نذر مانی جائے بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہو گیا ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا ان کے انبیاء و اولیاء بھی شدائد و مصائب و آفات و بلیات میں ان کی فریاد سن کر ان کی حالت سے مطلع اور واقف ہو کر ان کی مدد کر سکتے ہیں "کشفِ ضرر" کر سکتے ہیں۔

اسی لیے ان کے اہلِ علم و فضل بھی اس کی علی الاعلان تعلیم کرنے لگے ہیں کہ حالتِ درد و مصیبت میں پکارنا چاہیے، حضرت معروف کرخیؒ کو، حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کو، حضرت سالار مسعود غازیؒ کو، حضرت شاہ بدیع الدینؒ مدار کو، حضرت شیخ معین الدین چشتیؒ کو، حضرت قطب الدین کاکیؒ کو، اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کے جاہل اور عالم دونوں غیر اللہ سے اس طرح استعانت ہر مصیبت کے وقت کرتے ہیں، ان کے لیے مرغ، بکری، گائے ذبح کرتے ہیں، نذر و نیاز لاتے ہیں، منت مانگتے ہیں، چراغ روشن کرتے ہیں، ان کی قبروں کا طواف کرتے ہیں، سجدہ کرتے ہیں۔ وہ ان بزرگوں کو اپنے پیش روؤں کی طرح اللہ کی ذات میں شریک نہیں کرتے بلکہ ان کو اللہ کا مملوک و محکوم ہی مانتے ہیں، اللہ ہی کو حاکم و مالک و رب سمجھتے ہیں، مستقل معبود اللہ ہی کو جانتے ہیں اور اپنے ان بزرگوں کو اللہ ہی کی ملک سمجھتے ہیں لیکن پھر اپنے پیشروؤں کی طرح ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کے یہ بزرگ، یہ صلحاء، مقربِ الٰہی ہیں وہ ان کی نذر و نیاز، ان سے دعاء و التجاء استغاثہ اس لیے کرتے ہیں کہ ان کی وجاہت و شفاعت و قرب سے اللہ کے غصے اور خفگی و ناراضی سے نجات پا کر قرب حاصل کر لیں۔

اس مختصر مقالہ میں یہ بتلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بعینہ یہی عقیدہ "شرک فی الالوہیت" ہے۔ یہی مذہب ابوجہل اور ابولہب کا ہے سوا، البوا، حضرت عیسیٰؑ کو حضرت عزیرؑ و ملائکہ و انبیاء کے پکارنے والے بعینہ اسی مسلک پر قدم زن تھے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى - وقوله تعالیٰ: وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاءُ نَا عِنْدَ اللّٰهِ!

محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی وامی) نے دینِ حق کا پیغام لا الٰہ الا اللہ پیش فرما کر افرادِ عبادت اللہ کی طرف دعوت دی، ساری عبادت کو اللہ ہی کے لیے مختص کر دیا خواہ استعانت ہو یا استغاثہ، ذبح ہو یا نذر، دعا ہو یا عکوف، طواف ہو یا کوئی عبادت قلبی ہو یا قالبی، مشرکین نے جن وسائط کو تقرب الی اللہ کا وسیلہ قرار دیا تھا ان کی نفی فرمائی، وضاحت فرمادی کہ توسط ان اولیاء و انبیاء و شہداء و ملائکہ کا اس اعتقادِ فاسد و زعمِ کاسد کے ساتھ کہ وہ ان کی شفاعت کرینگے، بغیر اذن و مرضیِ حق کے کارآمد نہیں ہوگا، جو چیز کہ نفع دیگی وہ یہی عبادتِ خالص و توحیدِ مفرد ہوگی جو کلمہ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ سے ثابت ہے، جو شخص اس کلمہ کے معنی پر چلا اس کے مقتضی پر عمل کیا، وہی مومنِ موحد اور محسنِ مخلص کہلایا اور جس کا قول و فعل حال و خیال اس کے معنی و مقتضی کے خلاف ہو وہ مشرک کافر ہوا یا مبتدع ضال!

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚۖ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚۖ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝

صالحیت

"اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَنُدْخِلَنَّھُمْ فِی الصّٰلِحِیْنَ" (پ۲۰ ع ۱)

راہِ خدا کے مسافر، طریقِ طلب اور راہِ سفر کے لحاظ سے دو قسم کے ہوتے ہیں (۱) اصحابِ بحث وافکار جنھیں حکماء وعقلاء کہا جاتا ہے، اور (۲) اصحابِ کشف وابصار جو عرفا و اولیاء کہلاتے ہیں۔ اہلِ بحث ونظر مقدمات کی ترکیب، دلائل وبرہان کی تقریر اور نظر واستدلال سے حقائق کا علم حاصل کرتے ہیں۔ وہ ممکن کے وجود سے واجب کے وجود پر استدلال کرتے ہیں، مصنوعات سے صانع کا، مخلوقات سے خالق کا پتہ لگاتے ہیں۔ یہ حکماء ومتکلمین کی جماعت ہے۔ ان کا طریقہ گو محمود ہے، لیکن نظر واستدلال کا انجام حیرتِ مذموم کے سوا کیا ہو سکتا ہے! ان کی حیرت کو "حیرتِ نظّار" سے تعبیر کیا گیا ہے، جو تصادمِ شکوک وتعارضِ دلائل کا نتیجہ ہوتی ہے جو یقیناً مذموم ہے۔ اس کے برخلاف اصحابِ کشف وابصار بھی ایک قسم کی حیرت میں مبتلا ہوتے ہیں، جس کو "حیرت اولی الابصار" کہا جاتا ہے، لیکن یہ نتیجہ ہوتا ہے مشاہدۂ وحدانیت والوہیت کا، آثار وعجائبِ ربوبیت کا، توالیٔ تجلیات کا، اور یہ حیرتِ محمودہ ہے۔ "رَبِّ زِدْنِیْ فِیْکَ تَحَیُّرًا" کی دعا، اسی حیرتِ محمودہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

جب اسلام کے نام لیوا حکماء ومتکلمین، فلاسفۂ یونان کے اتباع میں انبیاء علیہم السلام کے عقائد سے اختلاف کرنے لگتے ہیں تو وہ بقول شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کتّوں سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کتے بھی پرانی ہڈیوں کو نہیں سونگھتے، اور یہ احمق دو ہزار سال کی پرانی ہڈیوں کو اب تک جھنجھوڑنے میں لگے ہیں! ان کی ضلالت وگمراہی کا سبب ان کی "عقلِ ناقص" کے سوا کچھ نہیں

وَفَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ ٥

مصطفےٰ اندر جہاں آنگہ کسے گوید ز عقل ۔۔۔ آفتاب اندر فلک آنگہ کسے جوید سُہا

اہلِ کشف و بصیرت وہ ہیں جو تصفیۂ باطن، تخلیہ تخیل، کمالِ تبتّل، اور دوامِ توجہ سے تمہارے مقصود کو پہنچتے ہیں "وھو الوصول الی معرفۃ اللہ ولقائہ" انہیں صراطِ مستقیم کے جادہ پیما کہا جاتا ہے، اور یہی طریقہ تمام انبیاء علیہم السلام کا ہے، اور ان میں سب سے زیادہ کامل ملتِ حنیفی و دینِ مصطفوی ہے (صلوات اللہ علیہ و علیہم اجمعین) یہ گروہِ مقدس اُن ہستیوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کی خود حق تعالیٰ نے ثنا کی ہے (يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ) اور حضرتِ الوہیت سے ان کی تائید کی جاتی ہے (اُولٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ) یہ خدائے عزّ و جلّ لم یزل ولا یزال کے پسندیدہ بندوں کا طبقہ ہے (رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ) یہ اپنے خالق کے وجود کا ادراک مقدماتِ عقلیہ قائم کیے بغیر کر لیتے ہیں، اور حق کو نورِ حق ہی سے پہچانتے ہیں (أَفَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِنْ رَبِّهِ) انہیں نظر و استدلال کی حاجت نہیں ہوتی! بینا کو رنگوں کے ادراک میں نظری دلیلوں سے کام لینے کی کب ضرورت ہوتی ہے (أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ) چنانچہ کسی نے حضرت جنید سے پوچھا کہ وجودِ صانع پر تمہاری کیا دلیل ہے، تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا "لقد اغنی الصباحُ عن المصباح" مجھے دن کی روشنی نے چراغ کی روشنی کا محتاج نہیں رکھا ٥

حق را ز حق شناس نہ از حجت و قیاس ۔۔۔ خورشید را چہ حاجتِ شمع است و مشعلہ (جامی)

یہ مقدس ہستیاں درجۂ کمال پر فائض ہوتی ہیں، انہیں مکتبِ خانۂ وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا سے سبق ملتا ہے، یہ شکوک و اوہام سے آزاد ہوتی ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے علوم کی وارث ان کی تعریف میں کسی نے کیا خوب کہا ہے: ٥

آنہا کہ رہ بودۂ الست اند ۔۔۔ از عہدِ الست باز مستند

در منزلِ درد بستہ پابند ۔۔۔ در دادنِ جان کشادہ دستند

چالاک روندپس بیک گام ۔۔۔ از جوئی حدوث باز جستند

فانی زخود و بدوست باقی	ایں طرفہ کہ مستند و ہستند
این طائفہ اند اہلِ توحید	باقی ہمہ خویشتن پرستند

یہ بزرگ ہستیاں طہارتِ فطرت پر ہوتی ہیں، دریائے توحید میں غرق ہوتی ہیں، خلق نے جو کچھ دیکھا، شنا، ہو وہ اپنی بصیرت کے نور سے دیکھتی ہیں، خلق کے لیے جو "غیب" ہے، ان کے لیئے "شہادت" ہے، چنانچہ عارف رومی نے ان کے اس کمال کی طرف یوں اشارہ کیاہے: ؎

دفترِ صوفی سوادِ حرف نیست	جز دلِ اسپید ہمچو برف نیست
زادِ دانشمند آثارِ قلم	زادِ صوفی چیست اسرارِ قدم
انچہ تو در آئینہ بینی عیاں	پیر اندر خشت بیند بیش ازاں
در دلِ انگور می را دیدہ اند	در فنا محض شئ را دیدہ اند

لیکن ایسی ہستیاں کم ہوتی ہیں، اور ان کی شناخت بھی آسان نہیں ہوتی، وہ گم نام ہوتی ہیں، اور زاویۂ گمنامی میں اپنی زندگی بسر کرتی ہیں۔ ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ ایک ایسی صاحبِ کمال ہستی سے اخذِ فیض کا ہمیں کچھ موقع مل گیا، یہ محض فضلِ یزدانی و موہبتِ ربانی ہے کہ ہم ان کے کچھ ارشاداتِ عالیہ کو یہاں پیش کرنے کے قابل ہوگئے ہیں۔ ان ارشادات کا تعلق مرتبۂ صالحیت سے ہے۔

حق تعالیٰ نے صالحین کے دو وصف بیان فرمائے ہیں۔ ایمان وعملِ صالح۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِی الصّٰلِحِیْنَ (۲۹-۶-۱)

ایمان لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کا نام ہے۔ ذات اللہ ہی کو الٰہ قرار دینا، یعنی معبود و مستعان قرار دینا، زبان سے اقرار اور دل سے اس کی تصدیق کرنا توحید ہے، توحید ایمانی ہے، اس اقرار و تصدیق سے قلب سے شرک کا خروج ہوتا ہے، اور توحید داخل ہوتی ہے، جس ذاتِ پاک نے یہ پیغام ہم تک پہنچایا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اس کی رسالت کے اقرار و تصدیق سے دل سے کفر نکلتا ہے، اور ایمان جلوہ افروز ہوتا ہے۔

ایمان میں دو چیزیں ہیں، اور توحید میں بھی دو چیزیں ہیں۔ ایمان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی

رسالت اور صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی الوہیت کی تصدیق ہے۔ توحید میں حق تعالیٰ کی معبودیت و ربوبیت اور ان کے ماتحت بندہ کی عبادت و استعانت کی تصدیق داخل ہے۔

اس کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار یا شک "نفاق" ہے، جس کا نتیجہ ابدی جہنم ہے۔

"وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا" (پ ع ۹)

اس کی تصدیق کے بعد انکار ارتداد ہے، جس کا نتیجہ خلود نار و حبطِ اعمال ہے۔

وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (پ ۲ ع ۲۷)

ارتداد و شرک کی طرح دین و مذہب کی نفی ہے، بغاوت ہے اور اس لیے ناقابلِ معافی!

کفر و شرک، نفاق و ارتداد بڑے جرائم ہیں، سخت گندگی و نجاست ہیں۔ ان سے قلب کی تطہیر ضروری ہے۔ یہ تطہیر ان سے توبہ اور لا الٰہ الا اللہ کے اقرار و تصدیق ہی سے ہو سکتی ہے۔ یہی وہ علم ہے جس کو تمام انبیاء علیہم السلام نے حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر نبی آخر الزماں (علیہ الصلوٰۃ والسلام) تک پیش کیا ہے اور دعا کی ہے کہ:۔

"اللّٰھم توفنا مسلمین والحقنا بالصالحین غیر خزایا و لا مفتونین"۔

ایمان محض تصدیقِ قلب کا نام ہے، اور اعمالِ جوارح اس میں داخل نہیں ہیں۔ امور ذیل پر غور کرنے سے یہ امر روز روشن کی طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔

(۱) ایمان لغت میں تصدیق یا سچ ماننے کو کہتے ہیں۔ حق تعالیٰ برادران یوسف علیہ السلام کی زبان سے فرماتے ہیں:۔

وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ۝ — گو ہم سچ ہی کیوں نہ کہتے ہوں آپ کو تو ہماری بات کا یقین آنے کا نہیں

(۲) خود حق تعالیٰ ایمان کو فعلِ قلب قرار دیتے ہیں:۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا — (جو شخص کفر پر مجبور کیا جائے) مگر اس کا دل ایمان کی طرف

مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ	سے مطمئن ہو (اس سے کچھ مواخذہ نہیں) لیکن جو شخص
وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا	ایمان لائے پیچھے کفر کرے، اور کفر کرے بھی تو جی کھول
فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ	کر، تو ایسے لوگوں پر خدا کا غضب ہوگا، اور ان پر
عَذَابٌ عَظِيْمٌ (پ۱۴ ع ۲۰)	سخت عذاب ہوگا۔

یہاں قلب کو ظرفِ ایمان قرار دیا جا رہا ہے اور ایسے شخص کو کفار کے زمرہ میں سے نکال لیا جا رہا ہے جو جبر و اکراہ کے سبب اعمالِ ظاہری کی پابندی کو چھوڑ دیتا ہے، مگر دل سے مسلمان ہے۔ اور مورد غضب خداوندی وہی شخص قرار دیا جا رہا ہے جس کے دل نے خوشی سے کفر کو قبول کر لیا ہے۔

(۳) قرآن کریم میں اکثر جگہ اعمالِ نیک کی جزا اور ثواب کے لیے ایمان کو شرط ٹھہرایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ شرط مشروط سے خارج ہوتی ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اعمال ایمان میں داخل نہیں ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ	جو شخص کوئی نیک کام کریگا خواہ وہ مرد ہو یا عورت
اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ	بشرطیکہ وہ مومن ہو، سو ایسے لوگ جنت میں داخل
الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا (پ۵ ع ۱۸)	ہونگے، اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔
مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ	جو شخص کوئی نیک کام کریگا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت
هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَ	بشرطیکہ صاحب ایمان ہو، تو ہم اس شخص کو بالطف
لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا	زندگی دینگے، اور ان کے اچھے کاموں کے عوض میں
يَعْمَلُوْنَ (پ۱۴ ع ۱۸)	ان کا اجر دینگے۔
وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا	جو شخص آخرت کی نیت رکھیگا اور اس کے لیے جیسی
وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ	سعی کرنا چاہیے ویسی سعی کریگا بشرطیکہ وہ شخص مومن
مَّشْكُوْرًا (پ۱۵ ع ۲)	بھی ہو، تو ایسے لوگوں کی یہ سعی مقبول ہوگی۔

(۴) حق تعالیٰ گنہ گاروں کے لیے مغفرت کا وعدہ فرماتے ہیں:۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (پ ۲۴ ع ۳)

آپ کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں، تم خدا کی ذات سے ناامید مت ہو بالیقین خدا تمام گناہوں کو معاف فرمادیگا واقعی وہ بڑا بخشنے والا اور بڑی رحمت کرنیوالا ہے۔

بہت سی آیتوں میں مغفرت ذنوب کی نوید ہے، اس کے برخلاف کفر کے لیے عذابِ مخلد کی وعید ہے:-

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ (پ ۲۶ ع ۸)

بیشک جو لوگ کافر ہوئے اور انھوں نے اللہ کے راستہ سے روکا، پھر وہ کافر ہی رہ کر مرگئے، سو خدائے تعالیٰ ان کو کبھی نہ بخشیگا۔

اگر اعمال داخلِ ایمان ہوتے اور ان کا نہ کرنا داخلِ کفر، تو ان کی نسبت بھی بصورتِ عدمِ تعمیل، کفر کی طرح عدمِ مغفرت اور دوامِ عذاب کی وعید ہوتی نہ کہ مغفرت و رحمت کی نوید!

(۵) حق تعالیٰ نے دو صاحبِ تصدیق قتال کرنے والے گروہوں کو مومن کہہ کر یاد فرمایا ہے:-

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۞ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ (پ ۲۶ ع ۱۳)

اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑپڑیں تو ان کے درمیان اصلاح کرادو، پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہوجائے، پھر اگر رجوع ہوجائے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کردو، اور انصاف کا خیال رکھو، بیشک اللہ انصاف والوں کو پسند کرتا ہے، مسلمان تو سب بھائی ہیں سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان اصلاح کرادیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ

اگر اعمال جزوِ ایمان ہوتے تو اس باہمی قتال سے دونوں کافر ہوتے ان کو مومن نہ کہا جاتا، نہ

ان میں صلح کرا دینے کی یہ وجہ بیان کی جاتی کہ مسلمان باہم بھائی ہیں۔

ان آیاتِ بینات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہے کہ اعمال ایمان میں داخل نہیں۔ حق تعالیٰ نے صالح اسی شخص کو کہا ہے جو ایمان بھی رکھتا ہو اور عمل صالح بھی کرتا ہے۔ اب عملِ صالح کے معنی کا تعین ضروری ہے۔

عملِ صالح کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ صواب: یعنی عمل کا موافق سنّت صحیحہ کے ہونا۔ اخلاص: یعنی شرکت غیر اللہ سے پاک وصاف ہونا۔ نیتِ صحیحہ

وہی عمل صالح ہوگا جو موافق سنّتِ صحیحہ ہو اور نیتِ صحیحہ کے ساتھ حق تعالیٰ کے امتثال امر میں انہی کی رضا و خوشنودی کے لیے کیا جائے۔ ان تینوں خصوصیات کو اجمالی طور پر خوب سمجھ لو۔

ا۔ نیت کے متعلق جو اصول حضور انور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے:

"انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرئ ما نوی" آگے مثال کے ذریعہ اس کی وضاحت فرمائی ہے: فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او امراۃ ینکحھا فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ (رواہ الشیخان) یعنی اعمال کا اعتبار نیت سے ہے، ہر شخص کے لیے وہی ہے جو اس نے نیت کی، پھر جس نے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کی، اس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہوئی اور جس نے دنیا کی طرف ہجرت کی جو اس کو ملیگی یا کسی عورت کی طرف جس سے وہ نکاح کریگا تو یہ ہجرت اسی کی طرف ہوئی"

یہ حدیث اصولِ دین میں سے ایک عظیم الشان اصل ہے، ارکان اسلام میں سے ایک مہتم بالشان رکن ہے۔ سارے اعمال کا نیت ہی پر دار و مدار ہے۔ بے نیت کے کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، نہ اس کا کچھ اعتبار ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے یعنی دوسری کتبِ حدیث کے علاوہ صحیحین (بخاری و مسلم) میں بھی ہے۔

ب۔ اخلاص کے متعلق حضور انور کا یہ ارشاد بہت واضح ہے:-

یا ایھا الناس اخلصوا اعمالکم فان اللہ   یعنی اے لوگو تم اپنے اعمال کو خالص حق تعالیٰ

تبارك وتعالى لا يقبل من الاعمال الا — کے لیے کرو کیونکہ حق تعالیٰ عمل خالص کے سوا
ما خلص (رواہ البزار عن الضحاک بن قیس) — کوئی عمل قبول نہیں کرتے۔

جب حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کی جانب روانہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یا رسول اللہؐ مجھے کچھ نصیحت فرمائیے، تو ارشاد ہوا:-

اخلص دينك يكفيك العمل القليل — تو اپنے دین کو خالص کر، تجھے تھوڑا سا عمل کفایت
(رواہ الحاکم) — کریگا۔

عمل جب حق تعالیٰ ہی کے امر کے امتثال میں اور ان ہی کی رضا کے لیے کیا جاتا ہے اور اس سے انہی کی ذات مقصود ہوتی ہے تو وہ "خالص" ہوتا ہے اور ایسا ہی عمل "صالح" کہلایا جاتا ہے۔

ج۔ صالح ہونے کے لیے عمل کا مطابق کتاب وسنت ہونا ضروری ہے۔ من احدث فی امرنا هذا ما ليس منه فهو ردٌّ (اخرجہ الشیخان) اس پر نص ہے۔ یعنی جو شخص دین کے کام میں وہ چیز نکالتا ہے جو اس میں نہیں وہ مردود ہے۔ اسی مفہوم کو اس طرح بھی ادا کیا گیا ہے: "من صنع امرا علی غیر امرنا فهو ردٌّ" (رواہ ابو داؤد) ایک اور طرح بھی اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے۔ من عمل عملا ليس عليه امرنا فهو ردٌّ (رواہ مسلم)

ان نصوص سے ظاہر ہے کہ جس کام کے کرنے کا دین میں حکم اور اذن نہ ہو وہ کام دین میں بدعت ہے، گو یہ کام بظاہر کیسا ہی اچھا کیوں نہ نظر آئے! جب اسلام میں اعمالِ صالحہ وافعالِ حسنہ بے حد و بے شمار ہیں تو ان اعمالِ ثابتہ کو چھوڑ کر افعالِ مستحدثہ کو اپنا دین ٹھہرانا عقل کا ہیضہ نہیں تو کیا ہے! "بہتر بات تو خدا کی بات ہے، بہتر ہدایت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہدایت ہے، سب سے بدتر کام وہ ہیں جو نئے نکالے گئے ہیں۔ ہر بدعت گمراہی ہے" (عن جابرؓ)

بدعت بھی عجیب بلا ہے۔ دیکھو گنہگار یا فاسق خواہ وہ کتنا ہی بدکردار کیوں نہ ہو گناہ کو گناہ سمجھتا ہے، جی میں اس کام کو بُرا جانتا ہے گو منہ سے نہ کہے، اُمید ہو سکتی ہے کہ وہ جس چیز کو بُرا جانتا ہے اس سے کسی روز توبہ کر لیگا! لیکن صاحبِ بدعت کو توبہ کم نصیب ہوتی ہے کیونکہ وہ تو اس کو مستحسن سمجھ کر کر رہا ہے! حضرت ابن عاصمؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے مرفوعاً جو حدیث روایت کی ہے وہ اس روز آ

کے تجربہ کو عجیب و غریب طریقے سے ظاہر کرتی ہے :۔

"ابلیس نے کہا کہ میں نے لوگوں کو گناہ کا مرتکب کر کے ہلاک کر دیا اور انہوں نے مجھے گناہ سے توبہ کر کے برباد کیا۔ جب میں نے یہ حال دیکھا تو پھر میں نے ان کو ہوئی و بدعت میں مبتلا کر کے ہلاک کیا۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم راہِ حق پر ہیں اس لیے استغفار نہیں کرتے، اس طرح ہلاک ہو جاتے ہیں۔"

اسی لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا تھا، کہ :۔

"کل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار!!"

"ایمان" اور "عمل صالح" کی ماہیت کو سمجھ لینے کے بعد اب مومن لا معبود الا اللہ کے شغل میں مصروف ہو جاتا ہے، اور جملہ معبودانِ باطل کی قلب سے نفی کرتا ہے اور یہ معبودانِ باطل اس کے حق میں تین ہیں :۔ دنیا، خلق اور ہوائے نفسانی۔

لا معبود الا اللہ کے ایک معنی یہ ہیں کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ کے سوا میں امورِ دنیا میں سے کسی کا مطیع و منقاد نہیں جب بھی امورِ دنیا سے کوئی خطرہ میرے قلب میں آتا ہے تو میں حق ہی کی حول و قوت سے اس کی نفی کرتا ہوں اور لا الٰہ الا اللہ کی تلوار سے اس کو کاٹ کر رکھ دیتا ہوں! میرا ہر عمل، میری ہر حرکت حق تعالیٰ کے امر کے امتثال میں ہوتی ہے اور میرے تمام جذبات احکامِ الٰہیہ کے پابند ہوتے ہوتے ہیں کیونکہ ان کے سوا میرا معبود کوئی دوسرا نہیں! میرا کوئی عمل اسی وقت صالح یا قابلِ قبول ہوگا جب میں حق تعالیٰ ہی کی رضا و خوشنودی کے لیے اُن ہی کے بتلائے ہوئے طریقے سے اس کو انجام دوں!۔

اسی طرح میں خلق کو اپنے کسی عمل میں شریک نہیں کرتا، ریا و سمعہ کا کوئی خطرہ جب میرے قلب میں خطور کرتا ہے، عمل کے وقت جب کسی مخلوق کا خیال میرے ذہن میں آتا ہے تو یہ جان کر کہ ایسی حالت میں حق تعالیٰ کی بجائے یہی میرا معبود بن جاتا ہے میں لا الٰہ الا اللہ کی تیغ سے اس کو کاٹ کر رکھ دیتا ہوں۔

اسی طرح جب عمل کے وقت نفسانی خواہشات میں سے کسی خواہش، جاہ و عزت، خودنمائی، عجب و کبر یا کسی لذتِ نفسانی کا گزر میرے قلب میں ہوتا ہے تو صاف طور پر یہ جان کر کہ "ہرچہ در بند

آئی بندۂ آئی، اور حق تعالیٰ کی اس تہدید کا خیال کر کے کہ: "اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ" میں لا الٰہ الا اللہ کی تلوار سے ان تمام خطرات کی نفی کرتا ہوں تاکہ ماسوی اللہ کی عبادت کی ذلت سے پوری طرح نجات پاؤں! مجھے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ بددعا یاد آتی ہے جو انہوں نے اُس شخص کے حق میں کی تھی جو مال و دولت کو، عمدہ لباس و شہرت کو اپنا معبود بنا لیتا ہے اور جس کا سارا عمل ان ہی کے حصول کے لیے ہوتا ہے۔

تعس عبد الدینار وتعس عبد الدرهم وتعس عبد الخمیصة وانتکس واذا شیك فلا انتقش

"تباہ ہوا اشرفی کا بندہ اور روپیہ کا بندہ اور کپڑوں کا بندہ (یعنی جو رات دن بس انہی کی طلب اور فکر میں رہے) منھ کے بل گرے پھر سر کے بل الٹ جائے، اور جب اس کے کانٹا چبھے تو کوئی اس کا کانٹا نکالے (اتنی بھی مدد نہ کرے کیونکہ وہ بندۂ زر ہے)"

جب میرے قلب پر سے ان معبودانِ باطل کی حکومت کامل طور پر اٹھ جاتی ہے اور سریرِ دل پر صرف حق تعالیٰ کی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور میرے تمام جذبات اوامرِ الٰہیہ کے پابند ہو جاتے ہیں تو میں آزادی و حریت کا وہ ذوق محسوس کرنے لگتا ہوں جو ہفت کشور کے بادشاہ کو بھی میسر نہیں ہو سکتا!

عارف رومی نے اسی حلاوت کو محسوس کر کے فرمایا ہے: ؎

گر تو خواہی حرّی و دل زندگی — بندگی کن بندگی کن بندگی
زندگی مقصود بہرِ بندگی است — زندگی بے بندگی شرمندگی است
ہر کہ اندر عشق یابد زندگی — کفر باشد پیشِ او جز بندگی
ذوق باید تا دہد طاعات بر — مغز باید تا دہد دانہ شجر!

عبدیت ہی حریت کا اصلی سبب ہے، حریت کیا ہے؟ "هو انقطاع الخاطر عن تعلق ماسوی اللہ تعالیٰ بالکلیہ!" سچی آزادی اس انسان کو نصیب ہوتی ہے جس نے اغراضِ دنیادی و خواہشاتِ نفسانی سے اپنے قلب کو آزاد کر کے حق تعالیٰ سے بندگی و افتقار کی نسبت جوڑ لی ہے! حریت نہایتِ عبودیت کا نام ہے" آزادگی بے بندگی" نہیں ؏ کہ بستگانِ کمندِ تو رستگارانند" (حافظ) ولنعم ماقیل۔

خواجگی را خواجگی از بندگی ست   بندگی کردن کمالِ خواجگی ست؛

من ازاں روز کہ دربندِ توام آزادم   بادشاہم کہ بدستِ تو اسیر افتادم!

لا الٰہ الا اللہ کے معنیٔ اوّل لا معبود الا اللہ کے ہیں۔ عبادت کے معنی غایتِ تذلل و افتقار کے ہیں۔ زندگی کو جی کی خواہش کے مطابق نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی مرضی کے مطابق بسر کرنے کے ہیں۔ زندگی کی ہر حرکت امتثال امرالٰہی ہی ہو، ہر فعل کا مقصود حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کا حصول ہو یعنی مقصود و محبوب اللہ ہی ہو! لا مقصود الا اللہ، لا محبوب الا اللہ یہ ہیں دوسرے معنی لا الٰہ الا اللہ کے۔

لا الٰہ الا اللہ یعنی لا معبود الا اللہ کے شغل سے سالک کے قلب سے دنیا، خلق اور ہوائے نفسانی یا جذبات کا تسلط اُٹھ جاتا ہے لیکن باطن میں حق تعالیٰ کے سوا اور مقصود موجود رہ سکتے ہیں جن کا لا مقصود الا اللہ کے شغل سے دور کرنا ضروری ہے، یہ مقاصد بھی تین ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ ۱: بہشت و ما فیہا من الحور والقصور۔ ۲: مقامات کشفی مثلاً کشفِ قبور، کشفِ قلوب، یا کشفِ بلاد وغیرہ۔ ۳: تجلیاتِ قربی۔

مقصودِ حقیقی حق تعالیٰ ہوں تو جنت بھی بالذات مطلوب نہیں قرار پاتی[۱]۔ اگر جنت کا سوال کیا جاتا ہے تو محض اس بنا پر کہ وہ محلِ دیدارِ محبوب ہے ؎

عاشقاں جنت برائے دوست می دارند دوست!

"و رضوان من اللہ اکبر" سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ رضائے حق کو جنت سے اکبر قرار دیا گیا ہے۔ نہ ہی مقصود وہ مقاماتِ کشفی ہیں جو اولیاء اللہ کو تبعاً حاصل ہوتے ہیں جیسے کشفِ قبور یا کشفِ قلوب یا کشفِ بلاد۔

---

[۱] اس سے ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ جنت کی طلب ایمان یا کمالِ ایمان کے منافی ہے۔ انبیا علیہم السلام خصوصاً سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کامل کون ہوگا۔ بایں ہمہ قرآن و حدیث میں ان حضرات کی جو دعائیں نقل کی گئی ہیں ان میں جنت کا سوال بار بار کیا گیا ہے اور دوزخ سے پناہ مانگی گئی ہے۔ البتہ بندۂ مومن کا اصلی اور اولی محبوب و مطلوب بس حق تعالیٰ کی ذات اور اس کی رضا ہی ہونا چاہیے۔ "والذین آمنوا اشد حبا للہ" ۱۲ م

دریں منزل بود کشف و کرامات   و لے باید گزشتن زاں مقامات

نہ ہی وہ تجلیاتِ قربی مقصود ہیں جو اولیاء اللہ کو حاصل ہوتی ہیں مثلاً ولایت و غوثیت و قطبیت وغیرہ، مقصود صرف ذاتِ حق رہے، ان کا حضور، ان کا ذکر، ان کی فکر، ان کی یاد ؎

یارب ز تو آنچہ من گدا می طلبم   افزوں ز ہزار پادشاہی طلبم

ہر کس ز درِ تو حاجتے می خواہد   من آمدہ ام ز تو ترا می طلبم

اس شغل کے تسلسل سے حق تعالیٰ کی محبت دل پر ایسی غالب ہو جاتی ہے کہ ایک لحظے کے لیے بھی ان سے غفلت نہیں ہوتی، اور اس کا یہ حال ہو جاتا ہے: ؎

از بس کہ خیالت بہ نظر می دارم

در ہر چہ نظر کنم توئی پندارم

یہ مقامِ تلوین ہے، یہاں عاشقوں کے قلب و زبان سے فریاد نکلتی ہے، حال طاری ہوتا ہے لیکن وہ اس حال سے ترقی کرتے ہیں اور محض رضائے حق ان کا مطلوب ہو جاتا ہے جس حال میں رکھیں اس سے راضی رہتے ہیں، ہجر و وصال دونوں سے راضی ہو جاتے ہیں ؎

معشوقہ کہ شد بکام عاشقِ من   گفتا کہ نہ بہ عاشقی لائقِ من!

وصل است ز من کامِ تو اے ہستی   تو عاشقِ کامِ خویش نے عاشقِ من

اب ہر فعل و حرکت میں حق تعالیٰ کی رضا طلب کرتے ہیں، حق تعالیٰ کے جملہ افعال و احکام میں سے کسی فعل یا حکم پر جو خود ان کی جان پر یا جہان پر جاری ہو جاتا ہے   کوئی اعتراض نہیں کرتے، اور ع

"ہر چہ از دوست می رسد نیکو است"

کہہ کر سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں! توافق بالقضاء، اعراض عن الاعتراض ان کا شعار ہو جاتا ہے، مرض ہو یا خلافِ نفس کوئی چیز ہو اپنے محبوب کے حکم اور اس کی مشیت کا اس کو نتیجہ سمجھ کر اس سے محظوظ و خوش وقت ہوتے ہیں اور ان کی زبان سے ایسے وقت بس یہی نکلتا ہے، کہ ؎

عاشقم بر رنجِ خویش و دردِ خویش!   بہرِ خوشنودیٔ شاہِ فردِ خویش!

اور عارفِ رومی کے الفاظ میں اپنے یقین کا اس طرح اظہار کرتے ہیں: ؎

آں کسے را کہ چنیں شاہے کشد | سوئے بخت و بہتریں جاہے کشد
نیم جاں بستاند و صد جاں دہد | انچہ در وہمت نیاید آں دہد

اور ہر حال میں رضا ان کا مقام ہوتا ہے: ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اب "لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ" کا یہ نفوسِ قدسیہ صحیح مصداق بن جاتے ہیں (رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ) یہ نتیجہ ہے جذبات اور عقلی پرواز کو اوامرِ الٰہیہ کے تابع کرنے اور ان کو محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حضور میں قربان کر دینے کا: ؎

ایں راہِ طریقت نہ بپائے عقل است | خاکِ قدمِ عشق ورائے عقل است
سرے کہ فرشتہ چوں ازاں بیخبر است | اے غافل سہے عقل چہ جائے عقل است (ملا امم)

نیکی علم ہے

علمے کہ درو عمل نباشد عار است — ہر سجہ کہ بے ذکر بود زنّار است

ہر کس کہ بہ علمِ بے عمل می نازد — عالم نبود اعمیٔ مشعل دار است

([illegible] خان)

یونان کے شہرۂ آفاق مفکر سقراط کی تعلیمات کا خلاصہ پوچھا جائے تو بس یہی مشہور قول ہے، کہ "نیکی علم ہے اور بدی جہل" اس سے سقراط کا بظاہر یہی مطلب تھا کہ عملِ صالح (نیکی) علمِ صحیح کا نتیجہ ہے، اور علمِ صحیح یقین کے درجہ میں عملِ نیک سے جدا و منفک نہیں، ان میں ایک ضروری لزومی ربط پایا جاتا ہے، یہ لازم و ملزوم ہیں، سچ پوچھو تو اربابِ علم کی تعریف ہی اس طرح کی جا سکتی ہے اَلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ بِمَا یَعْلَمُوْنَ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے علم پر عمل کرتے ہیں[1]۔ ہر کتاب خواں و کتاب داں عالم نہیں قرار دیا جا سکتا، وہ عالم نہیں، متلذذ بالمسائل ہے۔ مسائلِ علمیہ کا حافظ اور ان سے لذت اندوز ہونے والا ہے۔ عوام کا یہ ظن مختل ہے کہ ہر کرمِ کتابی کو وہ عالم سمجھتے ہیں، "اعمیٔ مشعل دار" کو بینا جانتے ہیں، اور اپنے اس وہم کی تائید میں تعلیل مختل سے کام لیتے ہیں۔ اس مختصر مقالہ کا مقصود اس بنیادی غلطی کا ارتفاع اور اس کی تائید میں جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں ان کا ابطال ہے۔ ع یک تنقیہ دماغ می باید کرد۔

ذرا سقراط کے اس قول کو کہ 'نیکی علم ہے' اور وضاحت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرو، کیا علمِ صحیح عملِ صالح کے لیے ضروری نہیں؟ کیا جہازرانی کے لیے جہاز کی ساخت اور اس کے کام سے واقف ہونا ضروری نہیں؟ اسی طرح حکمرانی کے لیے حکومت کی ماہیت و مقصد و غایت کا جاننا لازمی نہیں! بالکل اسی طرح جب تک ہم یہ نہ جانیں کہ نیکی کیا ہے، جب تک کہ یہ نہ معلوم ہو کہ خصائلِ حسنہ کیا ہیں، تقویٰ کیا ہے، عفت و شجاعت کیا ہے، حکمت و

[1] رواہ الدارمی

عدالت کیا ہیں، اور ان کی ضد خصائل سیئہ کیا ہیں، کیا ہم نیک بن سکتے ہیں، تقویٰ اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں، لیکن جب یہ معلوم ہو جائے کہ نیکی کیا ہے، ہم نیک بن سکتے ہیں!

یہاں تک تو عوام کو بھی سقراط کی رائے سے اتفاق ہوگا کہ جب تک آدمی کو نیکی کا علم نہ ہو وہ نیک نہیں بن سکتا، اس معنی میں قطعاً نیکی علم ہے، لیکن سقراط فطرت انسانی کا رازدار تھا، اس کی رائے میں فطرتِ انسانی کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ شر کو خیر پر ترجیح دے، وہ قطعاً خیر ہی کا ساتھ دیگی۔ کیونکہ خیر ہی میں اس کا ذاتی فائدہ ہے، نفع ہے، بھلا ہے، خیر کے ہم سب عاشق ہیں، خیر ہی ہمارا محبوب ہے، ہم سب اسی کے پروانے ہیں، یہ ممکن ہے کہ جہل کی وجہ سے ہمیں شر خیر نظر آئے، شر کو ہم خیر سمجھنے لگیں اور اس علم باطل کی وجہ سے شر کا ساتھ دیں اور اس کو اختیار کریں، لیکن یہ ہماری فطرت کا قصور نہیں، یہ ہمارے ارادہ کا نقص نہیں، یہ ہمارے علم کا قصور ہے، جہل کی تاریکی میں ہمیں خیر کے صحیح خد و خال نظر نہیں آتے اور ہم سراب کو آب سمجھنے لگتے ہیں اور اس پر گرتے ہیں، اسی لیے "بدی جہل ہے" اور صرف جہل ہی بدی ہے، اور جہل نام ہے علم صحیح کے فقدان کا! جہل میں بھی جو علم نظر آتا ہے وہ علم صحیح نہیں، دھوکہ ہے اور اس کا عالم "عارف" نہیں "جاہل" ہے!

اگر فطرتِ انسانی کے متعلق سقراط کی یہ بات صحیح ہے تو ہمیں اس کا یہ قول ماننا ہی پڑتا ہے کہ "کوئی شخص ارادۃً بد نہیں" "کوئی شخص ارادۃً شر کو اختیار نہیں کرتا، اور جب وہ دو برائیوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے پر مجبور ہوتا ہے، تو بڑی برائی پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ جب وہ چھوٹی برائی کو چن سکتا ہے، اور ہمیں یہ بھی ماننا پڑتا ہے جہل ہی کی وجہ سے ہم شر کو اختیار کرتے ہیں، گناہ میں پڑتے ہیں، لہٰذا جہل ہی گناہ ہے، بدی ہے۔ جہل سے مراد یہاں عدم علم نہیں بلکہ سفاہت یا حماقت ہے اس لیے جاہل ایک معنی میں عالم کہلایا جا سکتا ہے، لیکن ہر معنی میں وہ احمق ضرور ہے۔ عوام جنہیں اپنی رائے میں عالم قرار دیتے ہیں وہ حقیقی معنی میں سفیہ یا احمق قطعاً ہوتے ہیں، وہ خیر کی ماہیت سے جاہل ہوتے ہیں، اپنے نفع و ضرر سے بیخبر ہوتے ہیں، وہ اشیاء کے بطون سے واقف نہیں ہوتے، وہ

مظاہر کے حسی علم میں گرفتار ہوتے ہیں، وہ اصل میں مستِ خواب ہوتے ہیں، لیکن خواب میں اپنے کو بیدار سمجھتے ہیں۔ ؎ خفتۂ دائم خویش را بیدار می بیند بخواب۔ (صائب)

جذبات سے زیادہ جہل کی مورث کوئی او شئے نہیں۔ ارسطو نے سقراط کے اس قول پر جو تنقید کی ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ ارسطو کی رائے میں انسان کے اکثر اعمال پر جذبات کی حکمرانی ہوتی ہے، ان کی محرک شہوتیں ہوتی ہیں، عقل یا علم صحیح نہیں، عمل جذبات کے تابع ہوتا ہے، اور جذبات ارسطو کے الفاظ میں "روح کا غیر عقلی حصہ ہوتے ہیں" سقراط کا عمل اس کی عقل کا تابع تھا، اس نے خیال کیا کہ ہر شخص کا عمل اسی طرح عقل کا تابع ہوتا ہے، اسی لیے اس نے نیکی کو علم قرار دیا، لیکن روحِ انسانی کے غیر عقلی حصے، جذبات اپنی قوت و شدت کے لحاظ سے مردافگن ہوتے ہیں، اور انہی کا تسلط انسان کے دل و دماغ پر ہوتا ہے، یہ عقل و حکمت سے بے بہرہ ہوتے ہیں، ان کا پیدا کردہ عمل بھی علم اور نیکی سے عاری ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انسان راہِ مستقیم کو جاننے کے باوجود بھی جذبات کے زیرِ اثر گمراہی اختیار کرتا ہے، ہاتھ میں شمع رکھنے کے باوجود چاہ میں گر جاتا ہے وہ "اعمیٰ مشعل دار ہے" "چارپائے بر و کتابے چند" کا مصداق ہے، "زبانِ سنت میں علیم باللسان" اور "جاہل بالقلب" ہوتا ہے، اس کے وجود ہی سے حافظ کی یہ مشکل پیدا ہوئی تھی:۔

مشکلے دارم ز دانشمندِ مجلس باز پرس ۔۔۔ توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

ارسطو کی اس تنقید سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نیکی محض علم ہی نہیں، ہر عالم مردِ صالح نہیں، علم کے باوجود انسان کا نیک کردار بن جانا ضروری نہیں، جذبات اس راہ کے مزاحم ہیں۔

میانِ بلبل و پروانہ فرق بسیار است ۔۔۔ کجا بہ رتبۂ کردار می رسد گفتار!

سقراط کا یہ کہنا صحیح ہے کہ علم یا بصیرت نیکی کے لیے قطعی ضروری ہے، اس کے بغیر نیکی کی راہ نہیں ملتی، لیکن ارسطو کہتا ہے کہ محض علم ہی کافی نہیں ارادہ بھی ضروری ہے، علم کا استعمال ہونا چاہیے، اس کے لیے مجاہدہ کی ضرورت ہے، مجاہدہ سے عمل آسان ہوتا ہے، عمل کی تکرار سے عادت

قائم ہوتی ہیں عمدہ عادتوں کے قیام ہی سے انسان نیک بنتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ ع

چند روز جہد کن باقی بخند!

ارسطو کی تنقید لاجواب نظر آتی ہے، لیکن سقراط کی بات پر غور کرو، شاید بالآخر تم اسی کی بات سے اتفاق کروگے، تم کہتے ہو کہ عالم بے عمل کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ محض علم نیکی نہیں جس کا دعویٰ سقراط کرتا ہے، انسان کو علم و یقین ایک بات کا ہوتا ہے اور وہ عمل اس کے خلاف کرتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا یہ علم و یقین کس پایہ کا ہے، کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جو لوگ دوسروں کو ترکِ دنیا کا سبق دیتے ہیں، اور خود سیم و غلہ جمع کرتے ہیں[1]، ترکِ دنیا کے قائل ہیں، اس پر یقین رکھتے ہیں، ان کا قلب اس کی صداقت پر گواہی دیتا ہے؟ وہ خود بھی شاید یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں اس پر یقین ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہیں یقین صرف اسی چیز کا ہے جس پر وہ عمل کر رہے ہیں، اگر انہیں روحانی اقدار کی حقیقی قیمت کا یقین ہوتا تو وہ قطعی اسی کی تلاش کرتے اور حطام دنیوی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، انسان کی فطرت ہی میں یہ داخل ہے کہ وہ اپنا بھلا چاہتا ہے، فائدہ کی تلاش کرتا ہے، اور نقصان یا ضرر سے بھاگتا ہے، میں جانتا ہوں کہ آگ پر انگلی رکھنے سے شدت کی سوزش ہوتی ہے، اس لیے میں آگ کے قریب نہیں جاتا، اگر اسی قسم کا یقین مجھے ہو جائے کہ آخرت قابلِ ترجیح ہے، کیونکہ یہی باقی رہنے والی ہے تو پھر میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ میں آخرت کی پرواہ نہ کروں اور "قحبہ مستورۂ دنیا" کی ناز برداری کرتا رہوں جیسا کہ ہم نے اوپر وضاحت کی ہے، جہل یعنی صحیح علم و یقین کے فقدان ہی سے شر کا ارتکاب عمل میں آتا ہے، اور بہر حال یہ نفسیاتی قانون صحیح ہے کہ "عمل تابع حال ہوتا ہے اور حال تابع علم و یقین" لہذا عمل ہی سے حال و یقین ظاہر ہوتے ہیں، کسی شخص کے یقین کا پتہ چلانا ہو تو اس کا عمل دیکھا جانا چاہیے نہ کہ محض قول، خود اس شخص کو اپنے یقین کی کیفیت اس کے اپنے عمل ہی سے معلوم ہوتی ہے، نفس کے دھوکوں کا حال عمل کے محاسبہ سے ظاہر ہو جاتا ہے، اور حال قابلِ اعتبار

---

[1] ترک دنیا بمردم آموزند ؛ خویشتن سیم و غلہ اندوزند۔

ہو نہ کہ قال، کردار پر تصفیہ ہوتا ہے نہ کہ محض گفتار پر ؎

قدم باید اندر طریقت نہ دم　　　کہ اصلے ندارد دمِ بے قدم

غرض یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ ہر شخص اپنے علم ویقین کے مطابق ہی عمل کر رہا ہے تو سقراط کی اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ نیکی علم صحیح کا نام ہے، علمِ صحیح قطعاً عملِ صالح پیدا کرتا ہے، انسان کو اپنے فائدہ کا علم اور اس پر یقین ہونے کے بعد اس کو اختیار کیے بغیر وہ رہ نہیں سکتا، کیونکہ اس کی فطرت ہی ایسی بنی ہے کہ وہ خیر کی طرف راغب ہوتا ہے، بشرطیکہ اس کو خیر کا علم ہو جائے اور خیر ہی کے علم کو صحیح معنی میں "علم" کہا جا سکتا ہے اور لقائے حق ہی سے دیدۂ بینا حاصل ہوتا ہے ؎

دیدہ بینا از لقائے حق شود　　　حق کجا ہمراہِ ہر احمق شود

(رومی)

اب ہم تھوڑی دیر کے لیے "حکمت یونانیاں" سے حکمت ایمانیاں کی طرف رجوع کرتے ہیں، نورِ عقل وحس کو نورِ حق سے زینت بخشتے ہیں۔

نورِ حس را نورِ حق تزئیں بود　　　معنیٔ نورٌ علیٰ نور ایں بود (رومی)

نیکی علم ہے، کیونکہ علم کی اصل "خشیۃ اللہ" ہے (خوفِ خدا ہے) اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (پ ۲۲ ع ۱۶) خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں، اس لیے ابن مسعودؓ وغیرہ نے کہا ہے کہ کفی بخشیۃ اللہ علماً وکفی بالاغترار باللہ جھلاً۔ جب علم خوفِ خدا کا نام ہے، کثرتِ روایت کا نہیں، معلومات کا ذخیرہ جمع کرنے کا نہیں (لیس العلم بکثرۃ الروایت ولکن العلم خشیۃ) تو ایسا علم قطعاً عمل کو درست کر دیتا ہے، یعنی اس سے نیکی پیدا ہوتی ہے، وانسان صالح بن جاتا ہے اور اسی معنی میں کہا جا سکتا ہے کہ نیکی علم ہے، اور عالم وہی ہے جو خدا سے ڈرتا ہے اور جاہل وہی ہے جو اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ من خشی اللہ فھو عالم ومن عصاہ فھو جاھل۔ اس بنا پر ہم ہر کتاب خواں وکتاب داں کو عالم نہیں کہہ سکتے، امام شعبیؒ اپنے

ۛلہ امام احمدؒ نے معروفؒ سے نقل کیا ہے۔

وقت کے علماء سے کہا کرتے تھے کہ تم عالم نہیں "متلذذ بالمسائل" (Intellectual Epicure) ہو۔ مسائل سے بحث میں تمہیں لذت ملتی ہے، اور یہی لذت تمہاری غایت ہے۔ عالم سے مراد عامل باللہ فی اللہ عارف باللہ ہے یعنی عالم وہ ہے جو عرفانِ حق و خوفِ خدا رکھنے کی وجہ سے اللہ ہی کے لیے عمل کرتا ہے اور عمل کا مقصود اللہ ہی کی رضا و محبت کو قرار دیتا ہے۔

اسی علم کو زبانِ سنت میں "علم نافع" کہا گیا ہے اور اس کی وضاحت کی گئی ہے، یہ علم ایک نور ہے جو عالم کے حجابات کو رفع کرتا ہے اور اس کو عرفانِ حق عطا کرتا ہے، اسی علم کی وجہ سے وہ اپنے رب کی طرف راہ یاب ہوتا ہے، اس کو اپنے سے قریب، بلکہ "اقرب" پاتا ہے، اس کو حاضر و ناظر جانتا ہے، اس یافت قرب کی وجہ سے عالم کا انس اللہ سے بڑھتا جاتا ہے، اب اس کو ذکر و دعا میں حلاوت، مناجات میں لذت، ادائے فرضِ عبودیت میں سرور و مسرت حاصل ہوتی ہے، اب اس کا مقصود حق تعالیٰ ہو جاتے ہیں، جان و مال، فرزند و زن سے وہ زیادہ عزیز و محبوب بن جاتے ہیں اور وہ انہیں مخاطب کر کے کہتا ہے:

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم ۔۔۔ خاکے شوم و زیر پائے تو زیم
مقصودِ من خستہ زکونین توی ۔۔۔ از بہر تو میرم و برائے تو زیم (سحابی استرآبادی)

جب یہ تعلق عبد میں اور اس کے رب میں پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح جان پہچان ہو جاتی ہے تو حق تعالیٰ اس کے لیے کافی ہو جاتے ہیں کفی باللہ وکیلا۔ جو کچھ وہ مانگتا ہے اس کو ملتا ہے، جو کچھ وہ چاہتا ہے اس کو دیا جاتا ہے[1] اور وہ چاہتا وہی ہے جس میں ان کی رضا ہوتی ہے۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ہر شئے کا عوض حق تعالیٰ ہیں، لیکن ان کا عوض کوئی شئے نہیں۔

---

[1] لئن سألنی لاعطینہ ولئن استعاذنی لاعیذنہ۔

لکل شیٔ اذا فارقتہ عوض ولیس للہ ان فارقت من عوض[1]

عارف رومی نے اسی مطلب کو اپنے سُریلے نغموں میں یوں ادا کیا ہے کہ جب بندہ کو اپنے بادشاہ سے انس پیدا ہو جاتا ہے تو پھر سارے درد و غم کا اس کو علاج مل جاتا ہے اور اس کی طرف رُخ کر کے وہ سارے جہان سے فارغ ہو جاتا ہے۔

آنکہ شد انسش بہ شاہ فرد خویش یافت درماں ہائے جملہ درد خویش

چوں ازاں اقبال شیریں شد دہاں سرد شد بر آدمی ملک جہاں

جس کو یہ علم نافع عطا ہوتا ہے اس کو مزید تین چیزیں دی جاتی ہیں۔ قلب خاشع، نفس قانع اور دعا مسموع۔ جب اصل علم خشیۃ اللہ ہے تو علم کے ساتھ ہی خدا کا خوف بھی عالم کے قلب میں پیدا ہو جاتا ہے، اس کا نفس دنیا سے سیر ہو جاتا ہے، وہ طالبِ دنیا نہیں رہتا، وہ طالب علو و رفعت نہیں ہوتا، وہ اپنی شہرت کا خواہاں نہیں رہتا اس کو دولت و ثروت کی ہوس نہیں رہتی، وہ ہمعصروں اور دوستوں میں بلندی کی تمنا نہیں رکھتا، اس کو مجلسوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جانے کی آرزو نہیں رہتی (امام سفیان ثوری) امام حسن رضؓ کے الفاظ میں وہ ناھد فی الدنیا، راغب فی الآخرۃ، بصیر بدینہ، مواظب علی عبادۃ ربہٖ ہوتا ہے یعنی دنیا میں زہد اختیار کرتا ہے، آخرت کی طرف راغب ہوتا ہے، اپنے دین میں بصیرت رکھتا ہے اور اپنے رب کا عبادت گزار بندہ ہوتا ہے۔ دوسری روایت میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے الذی لا یحسد من فوقہ ولا یسخر من دونہ ولا یوخذ علیٰ علم علمہ اللہ یعنی وہ اپنے سے بڑے پر حسد نہیں کرتا اور اپنے سے چھوٹے کا تمسخر نہیں کرتا اور اس علم کی وجہ سے جو اس کو اللہ نے سکھلایا ہے اس کا مواخذہ نہیں ہوتا۔ جوں جوں اس کا علم زیادہ ہوتا جاتا ہے، اللہ سے اس کا خوف، تواضع اور انکسار زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اھل العلم النافع کلما ازدادوا من ھذا العلم ازدادوا للہ تواضعاً و خشیۃً و انکساراً و ذلاً۔ (رواہ ابن عمرؓ) عالم میں خاک کی طرح تحمل،

---

[1] ہر چیز کا جو تجھ سے جاتی رہے بدلہ ہے، لیکن اگر اللہ تجھ سے جاتا رہے تو اس کا کوئی بدلہ نہیں۔

ذل وافتقار پیدا ہو جاتا ہے، کبر وفخر و رعونت کا نشان بھی باقی نہیں رہتا ؎

در خاک بیلقاں برسیدم بہ عابدے | گفتم مرا بتربیت از جہل پاک کن
گفتا برو چو خاک تحمل کن اے فقیہ | یا ہر چہ خواندہ ہمہ در زیر خاک کن

علمِ نافع کا عامل اس فقر الی اللہ کی وجہ سے سارے عالم سے غنی ہوتا ہے، وہ "غنی باللہ" نہیں، وہ "غنی عن الشیٔ" ہوتا ہے، اس کا برگ وساز قرآن عظیم ہے، اس کا قلب سوز و ساز ذوق وشوق، تسلیم و رضا سے مملو ہوتا ہے وہ سراپا صدق واخلاص و نیاز ہوتا ہے، اس کے فقر کا کچھ حال اقبال کی زبانی سنو:-

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل | یک نگاہِ راہ بین، یک زندہ دل
فقر کارِ خویش را سنجیدن است | بر دو حرفِ لاالٰہ پیچیدن است
فقر خیبر گیر با نانِ شعیر! | بستۂ فتراک او سلطان و میر
فقر ذوق وشوق وتسلیم و رضا است | ما امینیم ایں متاعِ مصطفیٰ است
فقر بر کرّوبیاں شبخوں زند | بر نوامیسِ جہاں شبخوں زند
برگ وسازِ اوست قرآن عظیم | مرد درویشے نہ گنجد در گلیم

غرض وہ علم نیکی ہے جس کی اصل خشیۃ اللہ ہے جو اپنے حامل میں قلب خاشع و نفسِ قانع پیدا کرتا ہے، اور اس کی وجہ سے دعاءِ مسموع حاصل ہوتی ہے، اور جس شخص سے یہ علمِ نافع فوت ہو جاتا ہے وہ ان آفات میں مبتلا ہو جاتا ہے جن سے پیغمبر اسلام (روحی فداہ) نے پناہ مانگی تھی یعنی یہ علم اس پر وبال وحجت ہو جاتا ہے، اپنے علم سے وہ کوئی نفع نہیں پاتا، اس کا دل اپنے رب کے لیے نہ خشوع اختیار کرتا ہے، اور نہ اس کا نفس دنیا سے سیر ہوتا ہے اور نہ اس کی دعاء سُنی جاتی ہے، یہ علم نہیں جہل ہے اور تمام بدیوں کا مبدأ، ہمیں اس عارف کی تلاش ہے جو اپنی شمع سے محفل کو روشن کر دے اور ہمارے قلب سے کانٹوں کو نکال کر

اس کو گلشن بنا دیتے ہے

عارف دل وجانِ تو معین سازد

خاکے کہ کند بجاش گلشن سازد

کامل ہمہ را زقفص بروں آرد

یک شمع ہزار شمع روشن سازد

(قادری ہندوستانی)

تعلیم کا مقصد

گر جرعۂ ز جامِ معرفت نوش شود
دیں کشمکش ہوا فراموش شود
قلبِ عارف زیرِ فلک کے گنبد
کہ دریار احباب سرپوش شود
(سحابی استرآبادی)

نزول کے اعتبار سے قرآنِ مبین کی سب سے پہلی آیت اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ سے یہ بات صاف طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ پیدا کرنے والے نے ہمیں پڑھنے اور سیکھنے ہی کے لیے بنایا ہے۔ ہمیں کان، آنکھ اور دل (یا قرآن کے الفاظ میں سمع، وبصر و فواد) مشاہدہ، تجربہ و استنباط نتائج ہی کے لیے عطا کیے گئے ہیں! عام طور پر ہمارے علم کا معروض ہماری ذات یا انفس ہے، پھر آفاق ہے اور پھر انفس و آفاق کا پیدا کرنے والا! انفس و آفاق کی نشانیوں کا جاننا حق تعالیٰ کی معرفت کے لیے ضروری ہے اور قرآن نے علم کی حقیقی غایت حق تعالیٰ ہی کے عرفان و وجدان کو قرار دیا ہے! حق تعالیٰ کے عرفان ان کی یافت و شہود سے بڑھ کر اور کیا شئے ہو سکتی ہے جس سے انسان ایک لحظہ بھی مطمئن و شادکام ہو سکتا ہو۔

کیست ز و بہتر بگوئے ہیچ کس
تا بداں دل شاد باشی یک نفس
من ز شادی خواہم مے خسروی
انچہ می خواہم من از تو ہم توی
(رومی)

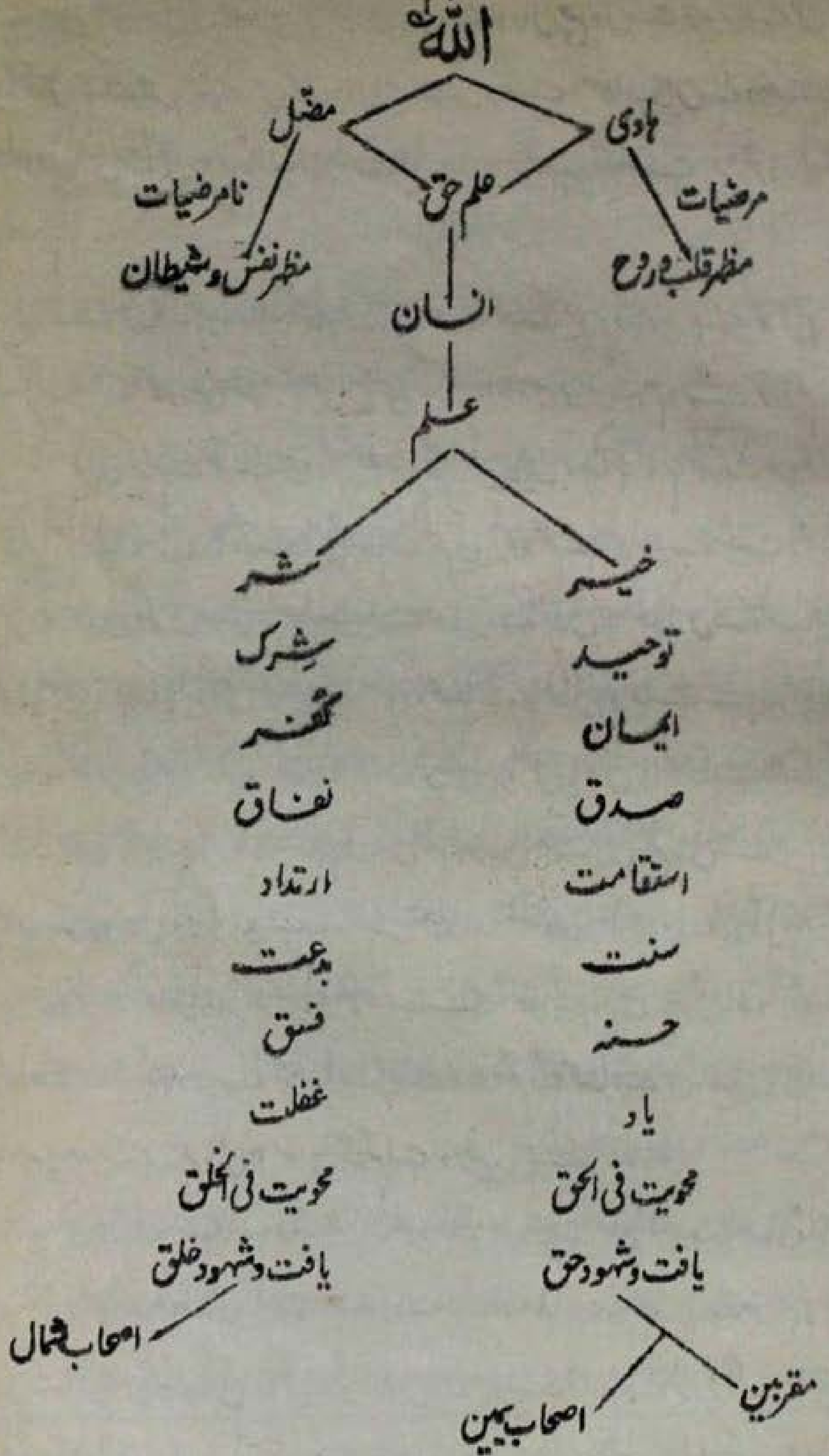
علم کا مقصدِ اولین حق تعالیٰ کا عرفان ہے، یعنی یہ جاننا ہے کہ حق تعالیٰ کن اسمائے حسنیٰ، صفاتِ علیہ و افعالِ باہرہ سے موصوف و متصف ہیں، ان کا اظہار کس طرح کائنات کی لامتناہی اشیاء اور انفس کے لاتعداد احوال و آثار میں ہو رہا ہے۔ قرآن کریم کے ارشادات کی روشنی میں عقل کو تابع وحی کر کے آفاق پر نظر ڈالی جائے تو ہر ورق "معرفتِ کردگار" کا دفتر بن جاتا ہے؛ اور ہر ذرہ اس کی وحدت کا گواہ، اور تمام عالم اسی کے جمال کا آئینہ نظر آنے لگتا ہے!

ہمہ عالم جمالِ طلعت اوست   گر کسے را کہ ایں نظر باشد! (سعدی)

ایمان کی اس نظر میں جب کائنات جلوہ گاہِ حق دکھائی دینے لگتی ہے تو نتیجے کے طور پر حق تعالیٰ کی عظمت وجلالت، ان کی خشیت ومحبت سے انسان کا قلب معمور ہو جاتا ہے اور حلاوت ولذت سے آشنا ہو جاتا ہے جو ذاتِ حق کا خاصہ ہے!

کلے طبل جان مست بیادِ تو مرا   وے پایۂ غم پست بیادِ تو مرا
لذاتِ جہاں را ہمہ دریا فگند   ذوقیکہ دہد دست بیادِ تو مرا (جامی)

اسماء وصفات وافعالِ حق کے عرفان کے بعد علم کا مقصد قرآن کی رو سے یہ جاننا ہے کہ کون سے اعمال، احوال، اقوال یا اعتقادات ہیں جو حق تعالیٰ کو محبوب وپسندیدہ ہیں اور وہ چیزیں کونسی ہیں جو ان کو پسند نہیں اور جن سے انہوں نے انسان کو روکا ہے! قرآنِ مجید نے حق تعالیٰ کی مرضیات کی تفصیل ایمان، توحید، صدق، استقامت، سنت، حسنہ، یاد، محویت فی الحق یافت وشہودِ حق کے سلسلہ میں شرح وبسط کے ساتھ کی ہے اور شرک وکفر، نفاق وارتداد، بدعت وفسق، غفلت ومحویت فی المخلوق اور یافت وشہودِ خلق کو کھول کر بیان کر دیا ہے اور "مقربین" "اصحاب یمین" اور "اصحاب شمال" کے مقام وصفات کو واضح طور پر معین کر دیا ہے۔ خیر وشر، علم ہدایت وعلمِ اضلال قطعاً حق تعالیٰ ہی عطا کرتے ہیں، خیر وشر میں امتیاز کرنا بھی سکھلاتے ہیں وھدینٰہ النجدین سے یہی مراد ہے، بدکرداری اور پرہیزگاری کا القا بھی ان ہی کی جانب سے ہوتا ہے، تاکہ کتاب وسنت کی روشنی میں بدکرداری سے گریز اور پرہیزگاری پر عمل کیا جا سکے۔ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (پ ۳۰ ع ۱۶) سے یہی مطلب ہے، حق تعالیٰ ہی کو علم کا مبدا قرار دے کر علمِ ہدایت وعلمِ اضلال کی تشریح ایک نقشہ سے کی جا سکتی ہے جو قرآنی تفصیلات کے اظہار میں "الیم فی اسم" "یا دریا بہ کوزہ" کا مصداق ہے!


اللہ
ہادی
مضل
علم حق
مرضیات
نامرضیات
مظہر قلب و روح
مظہر نفس و شیطان
انسان
علم
خیر
شر
توحید
شرک
ایمان
کفر
صدق
نفاق
استقامت
ارتداد
سنت
بدعت
حسنہ
فسق
یاد
غفلت
محویت فی الحق
محویت فی الخلق
یافت وشہود حق
یافت وشہود خلق
اصحاب شمال
مقربین
اصحاب یمین

جو شخص علم کی ان تفصیلات سے واقف ہو جاتا ہے وہ علم ہدایت پر عمل پیرا ہونے لگتا ہے وہی کرتا ہے جس میں حق تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہوتی ہے اور ان چیزوں سے گریز کرتا ہے جن کو وہ مکروہ و ناخوش رکھتے ہیں! اپنے اس مجاہدہ و ریاضت کی وجہ سے اصحابِ یمین کے درجہ سے بلند ہو کر مقربین میں شامل ہو جاتا ہے اور جنت ذات میں قیام پیدا کر لیتا ہے۔ فروحٌ و ریحانٌ و جنت نعیم!

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم | خلکے شوم و بہ زیر پائے تو زیم
مقصودِ من خستہ ز کونین توئی | از بہر تو میرم و برائے تو زیم (قائم)

قرآنِ کریم نے علم کے یہی دو مقصود قرار دیے ہیں، چنانچہ امام احمدؒ نے معروف سے نقل کیا ہے کہ اصل علم حق تعالیٰ کا ڈر ہے، یعنی سارے علم کی جڑ وہ علم ہے جو موجبِ خشیت و محبت و قربِ حق ہو اور بندہ کو حق تعالیٰ سے مانوس کرے اور ان کے شوق کا شعلہ اس کے قلب میں پیدا کرے، اور یہ جیسا کہ اوپر کہا گیا، حق تعالیٰ کے اسماء و صفات و افعال کو جاننے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ علم ہے جو حق تعالیٰ کے احکام اور اس قول یا عمل یا حال یا اعتقاد سے انسان کو واقف کرائے جو ان کو محبوب ہیں اور پسندیدہ! اس علم کو زبانِ سنت میں "علم نافع" سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس کے ازدیاد کی دعا کی گئی ہے۔ اللّٰھم انفعنی بما علمتنی و علمنی و زدنی علماً و ارزقنی علماً ینفعنی بہ (رواہ الترمذی) "حق تعالیٰ جو علم آپ نے مجھے سکھلایا ہے اس سے نفع اندوز کیجیے اور جو علم نافع ہو وہ مجھے سکھلایے اور میرے علم میں زیادتی کیجیے اور وہ علم مجھے عطا کیجیے جس سے میں نفع اندوز ہوں۔"

دوسری حدیث میں علم نافع کا سوال کیا گیا ہے اور غیر نافع سے استعاذہ:

اللّٰھم انی اسئلک علماً نافعاً و اعوذ بک من علمٍ لا ینفع اخرجہ النسائی و ابن ماجہ و عن جابر ان النبی صلعم قال سلوا اللّٰہ علماً نافعاً و تعوذوا باللّٰہ من علم لا ینفع

جس شخص کو "علم نافع" حاصل ہو گیا اس نے اس کے ثمرات کے طور پر "قلب خاشع" بھی پایا، "نفس قانع" بھی اور "دعائے مسموع" بھی! اس کا قلب اپنی وسعت کے لحاظ سے ساری کائنات میں

نہیں سما سکتا۔ کیا حباب دریا کا سرپوش ہو سکتا ہے؟

مَنْ وسع الحق فما ضاق عَنْ خَلْقٍ فکیف الامرُ یا سامِعْ[۱] (شیخ اکبرؒ)

علم کے ان ثمرات پر ایک نظر ڈالو:۔

(۱) قلبِ خاشع: علم نافع جب قلب میں اُتر جاتا ہے تو اب وہ قلب حق تعالیٰ کے لیے خاشع اور شکستہ ہو جاتا ہے اور اس کی ہیبت و جلال کے سامنے اس کی خشیت و محبت و تعظیم کے لیے سرافگندہ اور ذلیل ہو جاتا ہے! اور جوں جوں اس کا علم بڑھتا جاتا ہے، حق تعالیٰ کی معرفت بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ ان کی خشیت و محبت میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اس کا ذل و انکسار بھی روز افزوں! اسی کیفیتِ قلبی کو سعدی نے ان مشہور اشعار میں ادا کیا ہے:۔

در خاک بیلقاں برسیدم بعابدے گفتم مرا بتربیت از جہل پاک کن!

گفتا برو چو خاک تحمل کن اے فقیہ یا ہرچہ خواندہ ہمہ درزیر خاک کن! (سعدی)

علم کا ثمرہ ہی خشیۃ اللہ ہے! اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ (پ ۲۲ ع ۱۶) حق تعالیٰ سے ان کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں! اسی لیے ابن مسعودؓ وغیرہ نے کہا ہے، کفی بخشیۃ اللہ علماً وکفی بالاغترار باللہ جھلاً۔ علم کا نتیجہ خوفِ خدا، اور جہل کا نتیجہ بے خوفی اور دھوکا! علم خوفِ خدا کا نام ہے کثرت روایات کا نہیں معلومات کا ذخیرہ جمع کرنے کا نہیں، دماغ کو علومِ رسمی سے پُر کرنے کا نہیں۔ لیس العلم بکثرۃ الروایۃ ولکن العلم خشیۃ عالم وہی ہے جو خدا سے ڈرتا ہے اور جاہل وہی ہے جو اس کی نافرمانی کرتا ہے، "من خشی اللہ فھو عالم ومن عصاہ فھو جاھل"

عالم کی اس تعریف کو پیش نظر رکھ کر ہم ہر کتاب خواں اور کتاب داں کو عالم نہیں کہہ سکتے چنانچہ اسی معیار سے جانچ کر امام شعبیؒ اپنے زمانے کے علماء سے کہا کرتے تھے کہ تم عالم نہیں "مُتلذذ بالمسائل" (INTELLECTUAL EPICURE) ہو۔ تمہیں علمی مسائل سے بحث کرنے میں

---

[۱] جس میں حق سما گیا وہ خلق سے کیونکر تنگ ہو سکتا ہے اور اس کا کیا حال ہو گا اے سننے والے۔

لذت ملتی ہے اور یہی لذت تمہارا مقصود و غایت ہے اسی پر تم فدا ہو عالم درحقیقت "عامل للہ فی اللہ باللہ" ہے یعنی عالم وہ ہے جو عرفانِ حق اور خوفِ خدا رکھنے کی وجہ سے اللہ ہی کے لیے عمل کرتا ہے۔ اس کے عمل اور مجاہدہ کا مقصود اللہ ہی کی رضا و محبت ہوتی ہے! اس کا مطلوب و محبوب صرف حق تعالیٰ ہی ہوتے ہیں!

دل از غمِ کائنات برداشتہ بہ! | جز یادِ تو ہر چہ ہست بگذاشتہ بہ!
چشمے کہ نہ از نورِ تو روشن باشد | بشگافتہ و بخاک انباشتہ بہ!

(۲) نفسِ قانع: قلبِ خاشع کا لازمی نتیجہ نفسِ قانع ہے۔ جب دل میں خشوع پیدا ہو گیا، حق تعالیٰ سے ذل و افتقار کی نسبت قائم ہو گئی تو اب نفس اللہ سے راضی اور غیر اللہ سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ اب "غنی عن الاشیاء" ہو جاتا ہے! وہ جانتا ہے کہ کوئی شئے حق تعالیٰ سے برتر نہیں جس کے حصول کی وہ خواہش کر سکے، اب سب کچھ اسے حاصل ہو جاتا ہے! اسی لیے فرمایا گیا ہے۔ لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتَاکُمْ! اس کو علوئے تمکین حاصل ہو جاتی ہے، وہی مخاطب ہوتا ہے اس قول کا: اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰہُ مَعَکُمْ!

نفس ساری کائنات کو پا کر بھی حریص رہ سکتا ہے۔ ھل من مزید کا نعرہ لگا سکتا ہے! لیکن جب وہ حق تعالیٰ کو پا لیتا ہے، ان سے مانوس ہو جاتا ہے تو پھر دنیا اس کی نظر میں حقیر و ذلیل ہو جاتی ہے اور حق تعالیٰ کی عظمت و جلال سے اس کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے! اثرِ اسرائیلی میں اس کا ذکر بڑی خوبی سے آیا ہے:۔

ابن آدم طلبنی تجدنی، فان وجدتنی وجدت کل شیٔ وان فتک
فاتک کل شیٔ وانا احب الیک من کل شیٔ

ابن آدم تو مجھے طلب کر تو مجھے پائیگا۔ جب تو نے مجھے پالیا تو گویا تمام چیزیں تجھ کو مل گئیں۔ اگر تو نے مجھ کو کھو دیا تو گویا تو نے تمام چیزوں کو گم کر دیا، میں تیرے نزدیک ہر شئے سے زیادہ محبوب

پسندیدہ ہوں، اسی مفہوم کو کسی عاشق نے یوں ادا کیا ہے :۔

لِکُلِّ شَیْءٍ اِذَا فَارَقْتَہٗ عِوَضٌ ۔۔۔ وَلَیْسَ لِلّٰہِ اِنْ فَارَقْتَ مِنْ عِوَضٍ[1]

عارف رومیؒ نے اسی چیز کو اپنے سریلے نغموں میں یوں ادا کیا ہے کہ جب بندہ کو اپنے شاہِ ذیجاہ سے انس و پیار پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اس کو سارے دردوں کی دوا مل جاتی ہے اور وہ اس کی طرف اپنا رُخ پھیر کر سارے جہان سے فارغ و بے فکر ہو جاتا ہے :۔

آنکہ شد انسش بشاہِ فردِ خویش ۔۔۔ یافت درماں ہائے جملہ دردِ خویش

چوں ازاں اقبال شیریں شد دہاں ۔۔۔ سرد شد بر آدمی ملک جہاں! (رومی)

حق تعالیٰ سے مانوس ہو کر اس کا نفس دنیا سے سیر ہو جاتا ہے۔ اور دنیا کے اطوار سے بیزار ہو جاتا ہے، وہ طالبِ علو و رفعت نہیں ہوتا، وہ اپنی شہرت کا خواہاں نہیں رہتا، اس کو دولت و ثروت کی ہوس نہیں رہتی، وہ ہمعصروں اور دوستوں میں بلندی کی تمنا نہیں کرتا، اس کو لوگوں کی نگاہوں میں عظمت حاصل کرنے کی آرزو نہیں رہتی، اور مجلسوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جانے کی خواہش نہیں رہتی (امام سفیان ثوری) امام حسن کے الفاظ میں الزاھد فی الدنیا الراغب فی الاٰخرۃ، البصیر بدینہ، المواظب علیٰ عبادۃ ربہ ہو جاتا ہے' یعنی دنیا میں زہد اختیار کرتا ہے، آخرت کی طرف مائل ہوتا ہے، اپنے دین میں بصیرت رکھتا ہے، اور اپنے رب کا عبادت گذار بندہ بن جاتا ہے" وہ اپنے بڑے پر حسد نہیں کرتا اور اپنے سے چھوٹے کا مذاق نہیں اڑاتا۔ جوں جوں اس کا علم بڑھتا جاتا ہے حق تعالیٰ کا خوف بڑھتا جاتا ہے، تواضع و انکسار میں زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ "اھل العلم النافع کلما ازدادوا من ھذا ازدادوا للہ تواضعاً و خشیۃ وانکساراً و ذلاً" (ابن عمر)

وہ حق تعالیٰ ہی کے لیے زندہ رہتا ہے، مال و گنج کے لیے نہیں، وہ حق تعالیٰ ہی کے لیے جان دیتا ہے، خوف و رنج سے نہیں مرتا۔

---

[1] ہر چیز کا جو تجھ سے جاتی رہے بدلہ ہے لیکن اگر اللہ تجھ سے جاتا رہے تو اس کا کوئی بدل نہیں۔

هر کجا امرِ قدم را مسلکیست — زندگی و مردگی پیشش یکیست

بہرِ یزداں می زید نے بہرِ گنج — بہرِ یزداں می مرد نز خوف و رنج

ہست ایمانش برائے خواہِ او — نے برائے جنت و اشجار و جو!

ترکِ کفرش ہم برائے حق بود — نے ز بیمِ آنکہ در آتش رود

ایں چنیں آمد ز وصل آں خوی او — بے ریاضت نے بجستجوئے او

آنگہاں خندد کہ او بیند رضا — ہمچو حلوائے شکر او را قضا (رومیؒ)

(ص) دعائے مسموع:- جب قلب میں خشیت پیدا ہو گئی اور وہ حق تعالیٰ کی محبت سے منور ہو گیا اور دنیا سے شکم سیر ہو گیا تو اب وہ حق تعالیٰ کی نظر میں محبوب ہو جاتا ہے، اب اس کو ذکر و دعا میں حلاوت، مناجات میں لذت، ادائے فرضِ عبودیت میں سرور و مسرت حاصل ہونے لگتی ہے۔ اب وہ اپنے رب سے جو کچھ مانگتا ہے، اس کو دیا جاتا ہے، جو دعا کرتا ہے قبول کی جاتی ہے۔ چنانچہ حدیثِ قدسی میں صاف وعدہ کیا گیا ہے:-

لا یزالُ عبدی یتقربُ اِلَیَّ بِالنوافل حتیٰ احبَّہُ الیٰ قولہ لِئن سألنی لأُعطینہ ولان استعاذنی لأعیذنہ (وفی روایۃ) ولئن دعانی اجبتہٗ۔ (رواہ البخاری)

جب بندہ کو حق تعالیٰ سے انس و تقرب حاصل ہو جاتا ہے تو اب اس کی دعا مسموع ہوتی ہے، اس کا سوال پورا کیا جاتا ہے اور وہ حق تعالیٰ کی پرورش میں آجاتا ہے، وہ اس کے ولی ہو جاتے ہیں۔ اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ کو وصیت فرمائی تھی کہ:-

---

لہ پوری حدیث کا ترجمہ یہ ہے: ہمیشہ میرا بندہ نزدیک ہوتا ہے مجھ سے بذریعہ نوافل کے تا آنکہ دوست رکھتا ہوں میں اس کو تو ہوتا ہوں میں شنوائی اس کی جو سنتا ہے وہ اس سے، اور بینائی اس کی جو دیکھتا ہے اس سے اور ہاتھ اس کا جو پکڑتا ہے اس سے اور پیر اس کا جو چلتا ہے اس سے، اور اگر سوال کرے مجھ سے تو دیتا ہوں میں اس کو، اور اگر پناہ مانگے مجھ سے تو البتہ پناہ دیتا ہوں میں اس کو (اور ایک روایۃ میں یہ بھی ہے کہ) اگر وہ دعا کرے مجھ سے تو البتہ میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔ (بخاری)

"یاغلام! احفظ اللّٰہ یحفظک، احفظ اللّٰہ تجدہ امامک، تعرف اللّٰہ فی الرخاء یعرفک اللّٰہ فی الشدۃ" یعنی اے لڑکے تو حق کو نگاہ رکھ (اس طرح کہ اوامر و نواہی کو بجا لا اور قضا، قدر کو مان) تو اللّٰہ تجھ کو اپنی حفاظت میں رکھیگا، تو اللّٰہ کو نگاہ رکھ (مراقبہ علم و حضور و معیت کے ساتھ) تو اس کو اپنے سامنے پائیگا (وہ تجھ کو دنیا و آخرت دونوں کی آفتوں سے محفوظ رکھیگا) تو اللّٰہ کی یاد آرام و چین کی حالت میں کر وہ تجھ کو سختی کی حالت میں یاد کریگا (تیری دعا کو قبول کریگا اور تیری مصیبت کو دور کریگا!) اسی لیے تو عارف رومیؒ نے کہا تھا:-

زندگی بے دوست جاں فرسودن است — مرگِ حاضر غائب از حق بودن است

عمر و مرگ ایں ہر دو با حق خوش بود! — بے خدا آبِ حیات آتش بود! (رومیؒ)

جب علمِ نافع نے ہمیں قلبِ خاشع، نفسِ قانع، دعائے مسموع کی نعمتوں سے بہرہ یاب کردیا تو اب اس میں حق تعالیٰ ہی میں مشغولیت حاصل ہو جاتی ہے، تمام عالم سے بخود فانی ہو کر باقی بحق ہو جاتے ہیں، ماسوی اللّٰہ سے قلب کا تخلیہ ہو جاتا ہے اور بافت و شہودِ حق ہی ہمارا عمل ہو جاتا ہے، یعنی ہم مخلوقات کو چھوڑ کر خالق میں "معلومات" کو ترک کر کے "عالم" میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے علمِ نافع کا ثمرہ اور اس کا انجام!

چوں بہ مطلوبت رسیدی اے ملیح — شد طلب گاری علم اکنوں قبیح

چوں شدی بر بامہائے آسماں — سرد باشد جستجوئے نردباں (رومیؒ)

نسأل اللّٰہ علماً نافعاً و نعوذ بہ من علم لا ینفع و من قلب لا تخشع و من نفس لا تشبع و من دعاء لا یسمع، اللّٰھم انا نعوذ بک من ھٰؤلاء الاربع

انسانِ کاملؒ

دی شیخ باچراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست!

زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رستم دستانم آرزوست!

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست! (رومیؒ)

ان اشعار میں عارفِ روم نے دیو جانس کلبی کے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ ایک روز وہ دن کے وقت ہاتھ میں چراغ لے کر کسی گم شدہ شئے کی نہایت توجہ اور انہماک کے ساتھ تلاش کر رہا تھا! لوگوں نے یہ نظارہ دیکھ کر پوچھا کہ "اجی آخر ڈھونڈ ھتے کیا ہو؟" کہا کہ 'انسان' کو ڈھونڈھ رہا ہوں! اسی حکیم کا ذکر ہے کہ ایک روز وہ اونچے مقام پر چڑھ کر پکارنے لگا کہ "لوگو! ادھر آؤ!" جب چند لوگ اس کے قریب پہنچے تو اُس نے انہیں اپنے سونٹے سے مار بھگایا اور کہا کہ "میں نے تو انسان کو بُلایا تھا تم تو بول و براز ہو!"

گویا دیو جانس کی نظر میں انسانِ کامل اور اس 'انسان نما' صورت میں وہی فرق ہے جو کسی شخص میں اور اس کے بول و براز میں ہو سکتا ہے! دیو جانس اور اس کے متبعین نے انسانِ کامل کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی زیادہ تفصیل تو ان کے ہاں نہیں ملتی البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ انسانِ کامل کی زندگی کا مقصود ذاتیت اور لذت پرستی نہیں بلکہ حق طلبی و حق رسی ہے جس کو وہ اپنی زبان میں "نیکی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ نیکی سے ان کی مراد خواہشات سے قلب کا کامل تخلیہ ہے! جب انسان کا قلب تمام نفسانی خواہشات سے فارغ ہو جاتا ہے، لذتوں کی تمنا اور آرزو اس کے دل سے نکل جاتی ہے، مال و دولت، جاہ و عزت کی طلب بالکل جاتی رہتی ہے تو وہ کمال

ؒ یہ مقالہ نشرگاہ حیدرآباد دکن سے نشر کیا گیا۔

کے اس زینہ تک پہنچ جاتا ہے جو انسان کے عروج کا آخری زینہ ہے! کلبیہ کا نعرہ تھا۔

خرنیستی از آب و علف دست بدار، سگ نیستی از جیفہ دنیا بگذر!

قلب لذت کی خواہش سے آزاد ہو جائے، لذت کے مؤیدات جاہ و شہرت، مال و دولت سے مستغنی ہو جائے۔ اتنی بات تو صاف ہے، لیکن قلب کے اس تخلیہ کے بعد اس کا تحلیہ کس چیز سے ہو؟ کلبیہ کا جواب ہے نیکی سے! نیکی سے کیا مراد ہے؟ اس کا ایجابی تضمن کیا ہے؟ ارشاد ہوتا ہے کہ نیکی سے مراد "خواہشاتِ نفسانیہ سے قلب کا تزکیہ!!" اس دور سے کلبیہ نہیں نکلتے اور خود نیکی یا کمال کا کوئی ایجابی تضمن ہیں ان سے معلوم نہیں ہوتا یا پھر فلسفہ کی تاریخ میں یہ محفوظ نہیں کیا گیا۔

اب ہم اس تلاش میں یونان کے اس فلسفی کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کی "نگاہ زلزلہ عالم افکار" ہے، جو یونان کا سب سے بڑا مفکر ہے، ہماری مراد افلاطون سے ہے۔ یونان کے مفکرین میں سب سے پہلے افلاطون ہی نے روحِ انسانی کی تشفی بخش نفسیات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ روحِ انسانی کی تین ملکات میں تقسیم کرتا ہے جن میں سے ایک کی فطرت عقلی ہے اور دو کی غیر عقلی۔ سب سے ادنیٰ ملکات جو روح کا غیر شریف اور دنی حصہ ہیں، وہ احساسات، خواہشات اور اشتہاآت ہیں۔ ان کی فطرت غیر عقلی ہے۔ ان میں نہ کوئی نظم ہوتا ہے نہ ترتیب، ان کا نہ کوئی اصول ہوتا ہے نہ قاعدہ! ضروری ہے کہ ان پر ایک اعلیٰ ملکہ کی حکمرانی ہو، قہرمانی ہو، جو ان کو حدِ اعتدال میں رکھے، عفت و پاکبازی کے اصول کے تحت ان پر حکومت کرے! یہ اعلیٰ ملکہ عقل کا ہے جو اپنی فطرت کے لحاظ سے شریف ہے جو حکمت کا مقام ہے! جس طرح خواہشات اور اشتہاآت کا کام عقل کی فرمانبرداری و اطاعت پذیری ہے اسی طرح عقل کا فطری و الٰہی حق حکمرانی و قہرمانی ہے۔ عقل جذبات و خواہشات پر حکمرانی کے لیے بنائی گئی ہے! ان دو ملکات کے درمیان روح کا تیسرا ملکہ ہے جس کو ہم اپنی زبان میں ارادہ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ احساسات و اشتہاآت کی طرح دنی و رذیل نہیں، فطرۃً

مائل بہ شر نہیں۔ یہ خلقاً شریف ملکہ ہے اور جب اس کی صحیح رہبری کی جاتی ہے تو یہ اعلیٰ کمالات کے حصول کا ایک قوی ذریعہ بن جاتا ہے لیکن چونکہ یہ بذات خود غیر عقلی ہے اور کورانہ جذبہ کی شکل اختیار کرسکتا ہے، لہٰذا اس کا مقام عقل سے فروتر ہے۔ یہ عقل کا خادم ہے جس کو جذبات واشتہاآت کو مطیع اور رام کرنے کے کام پر لگایا جاسکتا ہے! افلاطون ادنیٰ ملکات کا مقام جگر کو قرار دیتا ہے، عقل کا سر کو، اور ارادہ کا گردن سے نیچے کے حصّہ کو۔ اس مقام کی وجہ سے وہ جذبات وخواہشات کو روک سکتا ہے اور عقل کی ہدایت ورہبری حاصل کرسکتا ہے۔

افلاطون کی رائے میں یہ تینوں ملکات حقیقی معنی میں ایک دوسرے سے جُدا وعلیحدہ ہیں اگر فطرتِ انسانی کو کامل وحدت قرار دیا جائے تو پھر اس امر کی توجیہ کسی طرح نہیں کی جاسکتی کہ کیوں عقل کو اکثر دفعہ جذبات کے خلاف اپنی پوری قوت سے جنگ کرنی پڑتی ہے۔ سچ پوچھو تو عقل ہی روح ہے اور حواس بدن کے محض وظائف ہیں۔ تاہم یہ نہ خیال کیا جائے کہ ان کے درمیان کوئی ربط وتعلق نہیں۔ ایسا نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ادنیٰ ملکات اعلیٰ ملکات کی خدمت واطاعت کے لیے ہیں، جسم روح کی خدمت گزاری کے لیے ہے۔ اس ربط وتعلق کو افلاطون نے ایک مشہور مثال کے ذریعہ واضح کیا ہے جو رتھ بان اور پردار گھوڑوں کی مثال کہلاتی ہے۔ ان دو گھوڑوں میں سے ایک شریف ہے اور دوسرا رذیل، اس لیے ان دو کو ایک ساتھ قابو میں رکھنا نہایت مشکل کام ہے۔ شریف گھوڑا ارادہ کی تعبیر ہے اور رذیل جذبات وخواہشات کی، رتھ بان عقل ہے۔ شریف عنصر کا رُخ آسمان کی جانب ہوتا ہے، اس کا رجحان ومیلان علو ورفعت کی طرف ہے، وہ جمال وکمال کا دلدادہ ہے، لیکن جسم اس کو زمین کی طرف کھینچتا ہے، زمین کی لذتوں اور شہوتوں پر وہ جان دیتا ہے، ہر اچھی چیز کا تعلق شکم ہی سے قرار دیتا ہے یا پھر ساری کائنات کا محور ومرکز آلۂ تناسل کو سمجھتا ہے، اور اسی کا شیفتہ وربودہ ہے۔ اب رتھ بان یا عقلِ قہرماں کا کام ہے کہ اپنے ان دونوں گھوڑوں کو قابو میں رکھے،

ادنیٰ و رذیل کو اعلیٰ و شریف کے تابع کر دے، ان کا رُخ علو و رفعت کی جانب پھیر دے، تیجہ کے طور پر رُوح میں عدالت کی صفت پیدا ہوتی ہے جو اس کا کمال ہے، یعنی رُوح کا مکمل اس کے مختلف ملکات یا حصوں کا ایک خاص ربط و تعلق ہو جس میں ہر ملکہ یا حصہ اپنی فطرت و ماہیت کے لحاظ سے اپنے صحیح مقام پر اپنے خاص فرائض کی ادائی میں مصروف ہو جاتا ہے اور وضع الشئی فی محلہٖ، کے اصول کی تعمیل و تکمیل ہو جاتی ہے! فرد عقلمند و حکیم اس وقت سمجھا جاتا ہے جب عقل رُوح کے دوسرے ملکات پر حکومت کرتی ہے اور جانتی ہے کہ ان کی فلاح و بہبود کس چیز میں مضمر ہے۔ فرد میں شجاعت کی صفت کا اس وقت ظہور ہوتا ہے جب ارادہ، لذت و الم، کرب و طرب میں عقل کی ہدایت پر عمل کرتا ہے کہ کس چیز سے خوف کیا جائے اور کس چیز سے نہیں۔ اس میں عفت کی صفت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب ارادہ اور جذبات و شہوات عقل کے حکم و اقتدار کا اتباع کرنے لگتے ہیں۔ جب عقل، ارادے اور شہوتوں میں توافق و ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے یعنی ہر ایک اپنا مناسب فرض ادا کرنے لگتا ہے تو فرد میں عدالت کی صفت کا ظہور ہوتا ہے، امہات فضائل یہی چار ہیں: حکمت و شجاعت، عفت و عدالت۔

اب انسانِ کامل کی رُوح میں کامل توافق، ہم آہنگی و ربط پایا جاتا ہے، جس میں اعلیٰ کا ادنیٰ پر کامل اقتدار ہوتا ہے، جس کی وجہ سے حکمت، شجاعت، عفت و عدالت کی صفات حسنہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ متجلی ہوتی ہیں، اور یہی صفات جملہ فضائل کا مبدا و منبع ہیں، تمام محاسن کا ان ہی سے ظہور ہوتا ہے! ان کا حامل انسانِ کامل ہے، اپنی قیمت کے لحاظ سے "دارائے دوجہان" ہے! گو "کشتگانِ شہوت" کی نظر میں حقیر و صغیر ہی کیوں نہ ہو ؎

پیشِ خلقاں خوار و زار و ریش خند — پیشِ حق محبوب و مطلوب و پسند! (رومی)

انسان جسم و رُوح پر مشتمل ہے، جسم عناصرِ کثیرہ سے مرکب ہے اور رُوح میں کئی ملکات پائے جاتے ہیں، اس طرح انسان ایک کثرت ہے لیکن جب جسم کو رُوح کا تابع کر دیا جاتا ہے اور رُوح کے مختلف ملکات عقل کے منقاد ہو جاتے ہیں تو اب انسان میں ایک وحدت پیدا ہو جاتی ہے ایسی

وحدت جس کی تکوین مختلف عناصر سے ہوئی ہے اور جو اپنا ظہور کثرت میں کرتی ہے۔ اسی لیے افلاطون کہتا ہے کہ کمال توافق، ہم آہنگی یا وحدت کا نام ہے اور مردِ کامل وہ مطرب (Musician) ہے جو گویا مختلف آوازوں کی ترتیب سے ایک دلفریب نغمہ پیدا کرتا ہے۔ یہ دلفریب نغمہ توحید کا نتیجہ ہے! چونکہ حق تعالیٰ واحد ہیں لہذا کمال یا فضیلتِ عدالت افلاطون کے الفاظ میں تشبہ باللہ[1] ہے۔

اس وحدت یا کمال کا لازمی، ضروری قطعی نتیجہ مسرت ہے۔ روحِ انسانی کی فطری خوبی یہی کمال یا فضیلت ہے اور اس کا فطری نتیجہ مسرت ہے۔ انسانِ کامل ہمیشہ مسرور و شاداں ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ لکد کوبِ جہان سے بالکلیہ محفوظ نہیں ہوتا: اس کے دوست و احباب اس کے ساتھ بے شرمی کا برتاؤ کر سکتے ہیں، وہ گورا نہ نفرت کا شکار ہو سکتا ہے، اس کو کشاں کشاں زندان میں جھونکا جا سکتا ہے، اور تازیانہ کی سزا دی جا سکتی ہے، وہ اپنے مصائب کا انجام سولی پر پا سکتا ہے، تاہم " عدالت کے سوا ہر چیز کو کھو کر وہ مسرور و شاداں ہو سکتا ہے! اس کی روح نغمۂ الٰہی کی گونج سے ہمیشہ فرح و انبساط، ذوق و مستی کی حالت میں ہوتی ہے، وہ اغیار سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

کیست زو بہتر بگو اے ہیچ کس — تابداں دل شاد باشی یک نفس

من نہ شادی خواہم و نے خسروی — انچہ می خواہم من از تو ہم توی (رومی)

افلاطون کا یہ بیان حکمتِ ایمانی کی نظر میں اسی وقت کامل مانا جائیگا جب عقل کو بھی شرع کے تحت کر دیا جائے:

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول (اقبال)

---

[1] Being made like unto God

اِمام غزالی کا فلسفۂ مذہب

کس را پسِ پردۂ قضا راہ نشد — وز سرِ قدر ہیچ کس آگاہ نہ نشد
ہر کس ز سرِ قیاس چیزے گفتند — معلوم نگشت و قصہ کوتاہ نہ نشد (غزالیؒ)

میری تحقیق کی رو سے (اور مجھے اپنے عجز کا اعتراف ہے)" فلسفہ عقل و استدلال کے ذریعہ کسی شئے کی آخری و انتہائی حقیقت کو دریافت کرنے کی کوشش کا نام ہے اور فلسفہ اپنی موزوں ترین شکل میں تمام موجودات کی انتہائی ماہیت کو دریافت کرنے کی سعی کے سوا کچھ نہیں"

اس کے برخلاف سائنس کا سارا تعلق عالمِ مظاہر سے ہے، سائنس واقعاتِ تجربیہ کا سادہ سے سادہ الفاظ میں کامل و متوافق بیان ہے۔ عالمِ سائنس۔ مظاہر عالم کے ایک مجموعہ کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ متعلقہ واقعات کو جن کی اس کو تحقیق کرنی ہی جمع کرتا ہے، پھر ان کی تعریف و تحدید کرتا ہے، پھر ان کی تحلیل و ترکیب کی طرف توجہ کرتا ہے، پھر ان کا اصطفاف کرتا ہے پھر پھر ان شرائط یا علل کا مطالعہ کرتا ہے جن کے تحت یہ وقوع پذیر ہو رہے ہیں، ان کی یکسانیتِ عمل کا تعین کرتا ہے، یعنی ان کے قوانینِ عمل کو دریافت کرتا ہے اور آخر میں ان کو ایک مربوط و مرتب مقالہ کی صورت میں پیش کر دیتا ہے اور یہاں پر اس کا کام عالم سائنس کی حیثیت سے ختم ہو جاتا ہے، یعنی اُس نے واقعاتِ تجربیہ یا مظاہر کا سادہ الفاظ میں کامل و منضبط بیان پیش کر دیا، ان کے طرزِ وقوع و طریقۂ عمل کو سمجھا دیا! غرض عالمِ سائنس کا کام اس عالمِ شہادت سے ہے۔ اس کی نگاہ واقعات اور مظاہر کی جانب لگی رہتی ہے، اس کی توجہ تجربات کی طرف ہوتی ہے۔ اشیاء کے باہمی ربط کو وہ دریافت کرتا ہے، ان کے پیش کرنے میں وہ حزم و احتیاط سے

ل یہ مقالہ نشرگاہ حیدرآباد دکن سے نشر کیا گیا۔

کام لیتا ہے اور اس طرح وہ ان قوانین وعلل کو معلوم کر لیتا ہے جن کے تحت عالمِ شہادت کے واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ اس علم سے اس کو قوت حاصل ہوتی ہے اور کائنات کی تسخیر میں وہ کامیاب ہوتا ہے!

عالمِ سائنس کے برخلاف فلسفی کو عالمِ غیب کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ مظاہر کے ماورا پہنچ کر حقائق اشیاء کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے، حقائق کے انتہائی علوم پر مطلع ہونا چاہتا ہے، اُس حقیقت کی ماہیت سے واقف ہونا چاہتا ہے جو انتہائی و آخری حقیقت ہے جو اشیاء کا باطن ہے، جو باوجود اشیاء ہی شدت ظہور کے غیب الغیب ہے، جس کا علم انسان کے حواس وقیاس وادراک وفہم وعقل کے لیے مستور ہے۔

اس غیب کے علم کی طلب انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اس کی جستجو وطلب ہی نے اس کو حیوان سے ممتاز کر رکھا ہے۔ اس کے تمام علوم وفنون، حکمت وفلسفہ اسی غیب کے یقین اور اس کی پیہم جستجو کا نتیجہ ہیں! اسی غیب کی یافت کی تڑپ میں وہ تن کی پرورش کو بھی ایک حقیر و ذلیل عمل قرار دیتا رہا ہے!

لیکن جن غیبوں تک انسان اب تک پہنچ سکا ہے وہ صحیح معنی میں غیب نہیں بلکہ ہمارے عالَمِ شہادت ہی کے ذرا مخفی اور دور افتادہ گوشے ہیں جن کو محض اضافی یا اعتباری غیوب کہا جا سکتا ہے! غالبؔ نے اس حقیقت کو کس خوبی سے ادا کیا ہے:

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود   ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

باقی اصلی اور حقیقی غیب یا "غیب الغیب" تک انسانی عقل اور ذرائع علم کی رسائی کبھی بھی نہیں ہو سکتی! قُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ (پ ۱۱ ع ۱۷) یعنی غیب کا علم صرف اللہ ہی کو ہے کہہ کر قرآن اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے اور انسان سے اس علم کی قطعی نفی کر رہا ہے۔

تاریخِ فلسفہ پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ میں ادعائی نظامات کے پیش ہونے کے بعد جب غیب کے کلی ویقینی علم کا فلسفیوں نے دعویٰ کیا تو ارتیابیت اور لاادریت نے ان کے ان بلند بانگ دعووں کی شدت سے تردید شروع کر دی اور انسانی علم

کو عالمِ شہادت ہی تک محدود کر دیا۔ ہیوم نے فلسفۂ جدید میں نہایت قوت کے ساتھ یہ واضح کر دیا کہ انسان کا سارا علم مظاہر ہی کی حد تک محدود ہے، کیونکہ اس کا دار و مدار ارتسامات یا ان کی نقل "تصورات" پر ہے، لہذا محسوس ہی کو ہم 'موجود' کہہ سکتے ہیں اور 'غائب' کا ہمیں کوئی علم نہیں ہو سکتا۔ ہیوم کی ارتیابیت نے کانٹ کو اس کے خوابِ ادعائیت سے جگایا اور جاگنے کے بعد اس کی تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا کہ حقائق اشیاء کا علم نہ صرف یہ کہ اب تک انسان کو حاصل نہیں ہوا بلکہ عقل و استدلال کی راہ سے ہمیشہ کے لیے ناممکن الحصول ہے۔ حقائقِ اشیاء کو کانٹ کی اصطلاح میں 'بواطن' (Noumena) کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور انسانی علم اس کے مقابلہ میں 'ظواہر' (Phenomena) یا قرآن کی اصطلاح میں "عالمِ شہادت" تک محدود ہے!

تاریخِ فلسفہ میں غزالی ہی وہ اولوالعزم اور جلیل القدر فلسفی ہیں جنہوں نے وجداناً ان حقائق کو پیشِ نظر رکھ کر عقلِ نظری کو علمِ وحی کے تابع کر دیا اور مشکوٰۃِ نبوی سے اخذِ نور کر کے کائنات کے متعلق وہ نظریہ پیش کیا جو گو "ماوراءِ عقل" (Supra-rational) ضرور ہے لیکن قطعاً خلافِ عقل (Contra-rational) نہیں، جس سے واقف ہو کر انسان اس صداقت کا قائل ہو جاتا ہے:

هرچند عقلِ کل شدهٔ بے جنوں مباش
با هر کمال اندکے آشفتگی خوش است

غزالی عقل و ایمان (جن کو جنونِ الٰہی، سے تعبیر کیا جاتا ہے) حکمت و شریعت 'علمِ استدلالی' و 'قبولِ ایمانی' کے وجدانات سے استفادہ کر کے ہمیں اس حقیقت الحقائق سے مانوس کر دیتے ہیں جن کے یافت و حصول کی تڑپ فطرتِ انسانی میں روزِ آفرینش ہی سے موجود ہے۔ اسی لیے مجھ کو ان کا فلسفہ سب سے زیادہ پسند ہے۔ ہم اس مختصر تحریر میں ان کی اسی 'یافت' کے چند روشن پہلوؤں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کر رہے ہیں۔

غزالی نے اہلِ عقل کی توجہ اس روشن حقیقت کی طرف منعطف کی کہ جوہرِ انسانی

اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے بالکل سادہ پیدا کیا گیا ہے اور اس کو حق تعالیٰ کے لاتعداد عالموں کی ابتدا میں کچھ خبر نہیں ہوتی۔ اس کو عالم کی خبر ادراک کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ اس کا ہر ادراک اس غرض کے لیے پیدا کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ وہ موجودات کے کسی خاص عالم کا علم حاصل کرے۔ سب سے اوّل انسان میں قوتِ لامسہ پیدا ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ موجودات کے بہت سے عوالم کا ادراک کرنے لگتا ہے۔ مثلاً گرمی، سردی، خشکی، تری، سختی، نرمی، مگر یہ قوت رنگ اور آوازوں کے ادراک سے بالکل قاصر ہے۔ "ہنگامۂ رنگ وصوت" اس کے لیے قطعاً معدوم ہوتا ہے! لامسہ کے بعد انسان میں قوتِ باصرہ پیدا ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ رنگ اور شکلوں سے واقف ہوتا ہے، عالم کی رنگینیوں کا مشاہدہ کرتا ہے! پھر قوتِ سامعہ بیدار ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ آوازوں اور نغموں کو سنتا ہے اور کیف اندوز ہوتا ہے پھر انسان میں قوتِ ذائقہ پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ مختلف لذتوں سے بہرہ یاب ہوتا ہے!

اب وہ عالمِ محسوسات کے دائرہ سے آگے قدم اٹھاتا ہے اور سات سال کی عمر کے قریب اس میں قوتِ تمیز پیدا ہوتی ہے! یہ حالت اس کے 'اطوارِ وجود' میں سے ایک طور ہے اور اس حالت میں وہ ایسے امور کا ادراک کرنے لگتا ہے جو عالمِ محسوسات سے ماوراء ہوتے ہیں! پھر وہ ترقی کرتا ہے اور اس حالت پر فائز ہوتا ہے جس میں اس کے لیے عقل پیدا کی جاتی ہے اب وہ واجب ومحال، ممکن وناممکن، جائز وناجائز کا ادراک کرنے لگتا ہے جن کا شعور اس کو پہلی حالتوں میں حاصل نہ تھا!

غزالی بتلاتے ہیں کہ عقل کی سرحد کے ماوراء ایک اور درجہ بھی ہے جس میں انسان کی دوسری آنکھ کھلتی ہے، جس کے ذریعہ وہ غیب کی چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور ایسے امور کا ادراک کرنے لگتا ہے جن کے ادراک سے عقل ایسی ہی قاصر ہے جیسے قوتِ تمیز ادراکِ معقولات سے اور قوتِ حس مدرکاتِ تمیز سے! اسی درجہ کا نام نبوت ہے!

بعض لوگ اس درجہ کے منکر ہیں، لیکن ان کا یہ انکار عین جہالت ہے اور اس انکار کی اس کے سوا کوئی وجہ نہیں کہ وہ خود اس حالت پر فائز نہیں ہوئے اور چونکہ ان کے حق میں یہ حالت کبھی موجود نہیں ہوئی اس لیے وہ گمان کرتے ہیں کہ یہ حالت فی نفسہ موجود نہیں، عدمِ علم سے وہ عدمِ وجود کا استنباط کرتے ہیں! اگر اندھے کو متواتر روایت کے ذریعہ رنگوں اور شکلوں کا علم نہ ہوتا اور اوّل مرتبہ ان امور کا اس کے سامنے ذکر کیا جاتا تو وہ ان کو ہرگز نہیں سمجھتا اور ان کا کبھی اقرار نہ کرتا!

اہلِ عقل کا نبوت کے درجہ سے انکار ایک معنی میں جائز ہے۔ غزالی خود صراحت کرتے ہیں کہ "تصدیق تو ہمیشہ سمجھنے کے بعد ہوتی ہے" بغیر سمجھنے کے کسی چیز کی تصدیق سخت دشوار ہے۔ اس لیے وہ نبوت کی خاصیت کا ایک نمونہ خود انسان کے تجرباتِ زندگی ہی میں پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسے روشن نمونے اور صاف مثال کے بعد انکار کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی، ذرا اس نمونہ پر غور کرو۔ یہ نمونہ خواب ہے۔ دیکھو خواب میں انسان کو بعض دفعہ ہونے والے واقعات کا صریحاً علم ہو جاتا ہے یا تمثیل کی صورت میں ان کا انکشاف ہوتا ہے جو تعبیر کے ذریعہ سمجھ میں آجاتے ہیں (Veridical Dreams) اس بات کا اگر انسان کو خود تجربہ نہ ہوا ہوتا اور اس سے یہ کہا جاتا کہ بعض وقت آدمی مردہ کی مانند بے ہوش ہو جاتا ہے، اس کی قوتِ حس، اس کی شنوائی و بینائی زائل ہو جاتی ہے اور غفلت و ذہول کی اس حالت میں اس کو غیب کا ادراک ہوتا ہے، وہ ہونے والے واقعات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ تو یہ سن کر انسان اس کے ماننے سے قطعاً انکار کرتا ہے، اس کو محال قرار دیتا ہے اور اس پر یوں دلیل قائم کرتا ہے کہ آلاتِ ادراک تو قوائے حسّی ہی ہیں، جس شخص کو ان آلات کی موجودگی کی حالت میں ایسے واقعات کا ادراک نہیں ہو سکتا تو پھر ان قویٰ کے معطل و زائل ہو جانے کے بعد کس طرح علم ہو سکتا ہے؟ مگر اس قسم کے قیاس کی تردید کیا وجود اور مشاہدہ سے نہیں ہو رہی ہے؟ جس طرح عقل کے ذریعہ انسان کو وہ نظر حاصل ہوتی ہے جو معقولات و تصورات کا مشاہدہ کرتی ہے جن کے ادراک سے حواس بالکل قاصر ہیں، بالکل اسی طرح نبوت سے

مراد ایک ایسی حالت ہے جسکی وجہ سے ایسی نورانی نظر حاصل ہو جاتی ہو کہ اس کے ذریعہ امورِ غیب اور وہ امور جن کا عقل قطعاً ادراک نہیں کر سکتی ظاہر ہونے لگتے ہیں، لہذا

بند احکامِ عقل میں رہنا یہ بھی ایک نوع کی حماقت ہے (درد)

ان فلسفیوں کو جو عقلیت کے پرستار ہیں اور عقل کے سوا علم و عرفان کے کسی اور ملکہ اور قوت کے قائل نہیں، نبوت کے درجہ کی خبر دے کر، اس کے واضح اور اجاگر نمونہ کو خود ان کے تجربہ میں مبتلا کر اور یہ ثابت کر کے کہ حقائقِ ایمان کی یافت میں عقل کی آنکھ اتنی ہی معتبر ہے جتنی کہ مادر زاد اندھے کی آنکھ رنگوں کے ادراک میں، غزالی ارکان وحدودِ شرعی کی حقیقت کو مشکوٰۃِ نبوی سے اخذ کر کے فلسفیانہ طریقہ پر اس کی جو تفہیم کرتے ہیں وہ بڑی دلچسپ ہے:

زیں شہد یک انگشت بسائم بلبت از لذّت اگر محو نگردی تف کن

فرماتے ہیں کہ انسان دو چیزوں سے بنایا گیا ہے: جسم اور قلب۔ قلب سے مراد حقیقتِ روحِ انسانی ہے جو عرفانِ الٰہی کا محل ہے، نہ وہ گوشت و خون کا ٹکڑا جس میں مردے اور چارپائے بھی شریک ہیں، اور یہی وہ چیز ہے جس کے لیے جسم ایک آلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جسم کی صحت جسم کے لیے باعثِ سعادت ہے اور اس کا مرض اس کے لیے باعثِ ہلاکت۔ اسی طرح قلب کے لیے بھی صحت و عافیت کی ایک حالت ہوتی ہے اور مرض و تکلیف کی ایک کیفیت، جیسا کہ قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے کہ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ (ان کے دلوں میں بیماری ہے)۔ اللہ کا نہ جاننا زہر مہلک ہے اور خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کر کے احکامِ الٰہی کو ترک کرنا اور معصیت میں مبتلا ہونا قلب کا سخت روگ ہے۔ اللہ کی معرفت اس کے لیے زندگی بخش تریاق ہے اور خواہشاتِ نفسانی کی مخالفت اور احکام و اوامرِ الٰہی کی متابعت اس کے لیے دوائے شافی ہے۔ جس طرح بدن کا علاج دوا کے استعمال ہی سے ہو سکتا ہے اسی طرح قلب کے امراض کا معالجہ بھی دواؤں کے استعمال ہی سے ممکن ہے۔ جس طرح حصولِ صحتِ جسمانی میں دواؤں کی تاثیر

کو عقلاء اپنی بضاعت عقل سے نہیں سمجھ سکتے بلکہ اس میں ان کو اطباء کی تقلید واجب ہے۔ اسی طرح انبیاء نے امراضِ قلبی کے علاج کے لیے جو عبادتیں خاص حد و مقداریں مقرر کی ہیں ان کی وجہ تاثیر کا سمجھنا بھی عقلاء کی بضاعتِ عقل کے لیے ممکن نہیں، ان کو انبیاء کی تقلید واجب ہے۔ انبیاء نے ان خواص کو نورِ نبوت سے معلوم کیا ہے نہ کہ بضاعتِ عقل سے۔ نیز جس طرح دوائیں نوع اور مقدار سے مرکب ہوتی ہیں کہ ایک دوا دوسری دوا سے وزن و مقدار میں مضاعف استعمال کی جاتی ہے اور ان کی مقدار کا اختلاف حکمت سے خالی نہیں ہوتا، اسی طرح عبادات بھی جو دوائیں ہیں امراضِ قلوب کی مختلف نوع و مقدار کے افعال سے مرکب ہوتی ہیں، مثلاً سجدہ رکوع سے دوچند ہوتا ہے، نمازِ فجر مقدار میں نمازِ عصر سے نصف ہوتی ہے، یہ مقداریں اسرار سے خالی نہیں اور یہ اسرار ان خواص میں سے ہیں جن سے نورِ نبوت کے سوا کسی اور کو آگاہی نہیں ہوتی، جو شخص طریق عقل سے ان امور کی حکمت کو جاننا چاہتا ہے یا ان کے متعلق یہ خیال کرتا ہے کہ یہ محض اتفاقی طور پر مذکور ہوئے ہیں اور ان میں کوئی ایسا راز نہیں جو بطریق خاصیت موجب حکم ہوا ہو، وہ نہایت احمق اور جاہل ہے!

غرض انبیاء امراضِ قلوب کے طبیب ہوتے ہیں جن کے احکام کی تعمیل شفائے قلبی کے طالبوں کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ شفائے بدنی کے جویا کے لیے امراضِ جسمانی کے طبیبوں کی ہدایتیں۔ اور عقل کا فائدہ صاف ظاہر ہے، اسی کے ذریعہ ہمیں اس نکتہ کا علم ہوتا ہے! وہ نبوت کی تصدیق کرتی ہے اور خود کو ان امور کے ادراک سے عاجز پاتی ہے جن کو نورِ نبوت روشن اور منکشف پاتا ہے! عقل ہمارا ہاتھ پکڑ کر اسی طرح نبوت کے حوالہ کر دیتی ہے جس طرح اندھوں کو راہبر اور متحیر مریضوں کو طبیبِ شفیق کے حوالہ کر دیا جاتا ہے۔ عقل کی رسائی اور اس کی پرواز بس یہیں تک ہے، اس سے آگے وہ قدم نہیں بڑھا سکتی! اب طبیب جو کچھ سمجھائے سمجھ لینا چاہیے، اور اس کی ہدایتوں پر کار بند ہونا چاہیے! اسی مفہوم کو حضرتِ اقبال نے اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے:

خرد سے راہرو روشن بصر ہے | خرد کیا ہے؟ چراغِ رہگزر ہے!
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا | چراغِ رہگزر کو کیا خبر ہے؟ (بالِ جبریل)

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور | چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے (〃)

جب عقل جذبات اور شہوات کے اثر سے بہک کر نورِ نبوت کا انکار کرتی ہے اور خود غیب کے دائرہ میں قدم زن ہوتی ہے تو اب اس کے ارشاداتِ عالیہ کی قیمت "ان ستی کے انڈوں" سے بھی گری ہوئی ہوتی ہے جو کبھی کبھی مرغی بغیر مرغ کے دینے لگتی ہے اور اس قسم کی عقل والے کی باتیں سن کر ہم کہہ اٹھتے ہیں ع

ماکیاں کز زورِ مستی خایہ گیرد بے خروس

یہ ہیں غزالی کی یافت کے چند روشن پہلو! وقت کی تنگ دامانی ہمیں مزید تفصیل کی اجازت نہیں دیتی ورنہ

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی!

تصحیحِ فکر[۱]

اے برادر تو ہمیں اندیشۂ	مابقیٰ تو استخوان و ریشۂ
گر گل است اندیشۂ تو گلشنی	ور بود خارے تو ہمہ گلخنی (رومیؒ)

افکار و خیالات ہی سے مقاصد و غایات کا تعین ہوتا ہے۔ مقاصد کردار، افعال و اعمال میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، افعال ہی کی تکرار سے عادت قائم ہوتی ہے، عادات کی تنظیم و ترتیب سے سیرت تشکیل پاتی ہے اور سیرت ہی ہماری قسمت کا تعین کرتی ہے، جیسی سیرت ویسی قسمت، لہٰذا جیسے خیالات ویسی کائنات۔ اَنَا عِندَ ظَنِّ عَبدِی بِی۔

یہ قانونِ ذہن کے دائرہ میں وہی صداقت و اہمیت رکھتا ہے جو قانونِ تجاذب دائرۂ فطرت میں، قطعی و یقینی، جب سیرت اور قسمت کی تشکیل و تعین میں افکار و خیالات ہی کی کارفرمائی ہے تو ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لئے اپنے افکار و خیالات کی اصلاح اُس کا اپنا نہایت اہم فریضہ ہے۔ قوم سازی اور فرد کی رُوح کی تکمیل اصلاحِ خیال پر منحصر ہے۔ ع

یک تغیرِ دماغ می باید کرد

مقاصد و غایات کا دائرہ ذہنِ انسانی ہے، انسان کا کوئی فعل مصلحت و غایت سے خالی نہیں ہوتا، اب مقاصد کا تعین غور و فکر، سوچ اور بچار پر منحصر ہے۔ فکر ہی کائنات کی سب سے زیادہ عظیم الشان قوت ہے، اور یہی ان دنوں انسان میں سب سے زیادہ غیر تربیت یافتہ قوت ہے۔ اس کی تربیت ہی کے متعلق مجھے یہاں کچھ کہنا ہے۔

---

[۱] یہ مقالہ "بزمِ فلسفہ" کی کرسی نشینی کے موقع پر سنایا گیا جو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے شعبۂ فلسفہ کی بزمِ مباحثہ ہے، اور "معارف" اپریل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔

فرض کیجئے کہ آپ کو ایک باغ لگانا ہے اس کے لئے آپ کو چند قوانین پر عمل کرنا ہوگا، جن کو باغبانی کے قوانین سے تعبیر کیا جاتا ہے، سب سے پہلی چیز تو یہ دریافت کرنی ہے کہ باغ لگایا کہاں جائے، پھر اس جگہ کو مسطح اور خس و خاشاک سے پاک کرنا ہوگا، یہ چیز سب سے زیادہ اہم ہے، پھر ہمیں پھولوں یا ترکاریوں کے بیج کا انتخاب کرنا چاہیئے، اور اس عمدگی سے تیار کی ہوئی زمین میں اُنھیں بونا چاہیئے۔ ہمیں اس امر کا بھی خیال ہے کہ بیج عمدہ ہیں، ناقص نہیں، پھر موسم گرما میں ان بیجوں کو پانی دینا پڑتا ہے، تاکہ شدتِ تمازت اُنھیں جلا نہ ڈالے۔ اب ہمیں انتظار کرنا پڑتا ہے کہ وقتِ مقررہ گذر جائے اور بالآخر گُلِ تر رونمائی کرے، اگر بے صبری سے ہم بیجوں کو کھود کر دیکھنا چاہیں کہ یہ جل تو نہیں گئے، تو پھر ان بیجوں کو نشو و نما کا موقع نہیں ملے گا۔ بعض دفعہ ہمیں کچھ زیادہ دن انتظار کرنا پڑتا ہے، لیکن اگر ہم نے زمین کو خس و خاشاک سے اچھی طرح پاک کیا ہے، بیجوں کے انتخاب میں غلطی نہیں کی، آبیاری کی ہے، تو ہمیں یقین ہے کہ ایک دن زندگی، دامنِ زمین چیر کر پودوں کی شکل میں جلوہ افروز ہوگی، اسی زمانہ میں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ باد و باراں، آفتاب و حرارت بیجوں کے نشو و نما کے لئے ضروری ہے، طوفان تک انھیں نقصان نہیں پہنچا سکتے، عناصر ان کے دشمن نہیں، ساری کائنات اور کائنات کی ساری قوتیں ان کے ساتھ اشتراکِ عمل کر رہی ہیں!

فرض کرو کہ انتظار کی مدت بحمد اللہ گذر گئی، باریک بیجوں نے خوش رنگ و دل فریب لالہ و یاسمن کی شکل اختیار کی، فطرت کا زبردست لیکن مانوس معجزہ ہماری آنکھوں کے سامنے پیش ہوا، شروع ہی سے ہم جانتے ہیں، اور یہ علم مرتبۂ یقین تک پہنچا ہے کہ جس پھول کا بیج ہم نے بویا ہے وہی پھول والا پودا رونما ہوتا ہے، اور ہزاروں باریکیوں کے ساتھ اپنے اندر ان تمام چیزوں کا اعادہ کرتا ہے جو اُس پودے میں پائی جاتی ہیں جس کا یہ بیج ہے، کیا اس بیج کو اصلی پھول کی نہ بھولنے والی صورت یاد رہتی ہے؟

پھول کی غایتِ تخلیق سے تو ہم واقف نہیں، لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ یہ ہمارے

دل کا سرور، آنکھوں کا نور ہے، کسی کے پاکیزہ الفاظ میں ہم اس کو "ربیع قلبی" "نورِ بصری" "جلاءِ حزنی" "ذہابِ ہمی" کہہ سکتے ہیں!

باغبانی کے یہ قواعد تو آپ سب جانتے ہی ہیں، کوئی بات نئی نہیں، لیکن میری دانست میں نئی بات جو آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ بالکل انہی قواعد و قوانین کے استعمال و پابندی سے آپ دُنیا کی تمام حسین و خوشگوار چیزوں کو حاصل کر سکتے ہیں جو زندگی کے بیج میں مستور ہے، وہی ہم میں سے ہر ایک میں موجود ہے۔ ان چیزوں کے حصول کے لئے ہمیں زندگی کی ویسی ہی خدمت کرنی پڑتی ہے جیسی کہ ان پھولوں کے بیجوں کی ہم نے کی تھی۔

دلفریب پھولوں کے لئے آپ نے خارج (عالمِ اکبر) میں باغ لگایا تھا، شادمانی و مسرت کے حصول کے لئے آپ کو باطن (عالمِ اصغر) میں باغ کے لئے زمین تیار کرنی ہے، شاید آپ کو علم نہیں کہ اس کا محلِ وقوع ٹھیک کہاں ہے؟ یہ باغ آپ کو اپنے "میدانِ فکر" میں لگانا ہے، کیا آپ کو یہ معلوم ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کے ہاں ایک عظیم الشان میدانِ فکر موجود ہے جس کی وُسعت کو ارض و سما نہیں پا سکتے، صرف ہمارا دل ہی اس کو سما سکتا ہے، افسوس ہے کہ یہ میدان خس و خاشاک سے پٹا پڑا ہے، یہ جانتے ہو کہ یہ خس و خاشاک کیا ہے؟ وہی سلبی افکار و خیالات جن کو مختصر طور پر شر انگیز، غلط خیالات کہنا کافی ہوگا، واقفانِ راز کا اصرار ہے کہ یہی ہمارے تمام مصائب و آفات کا سرچشمہ ہیں، ان سے ذہن و قلب کو پاک و صاف کرنا چاہیئے۔ اس راز کو سمجھنے کے لئے اس نفسیاتی قانون پر غور کرو، جس کا ہم نے ابتدا ہی میں ذکر کیا ہے، افکار و خیالات ہی سے ہم زندگی کے مقاصد کا تعین کرتے ہیں، اب یہ مقاصد ہی محرک بن کر ہمیں عمل پر آمادہ کرتے ہیں، اعمال کی تکرار، عاداتِ راسخہ کے قیام کا باعث ہوتی ہے، اور سیرت سوائے اِن عاداتِ راسخہ کے منظم مجموعہ کے کوئی اور چیز نہیں اور ہماری سیرت ہی ہماری قسمت کا دُوسرا نام ہے! سلبی خیالات فاسد مقاصد کا

تعیّن کرتے ہیں، انہی سے تو شر کا صدور ہوتا ہے، شر کا ارتکاب عادت بن کر سیرت بد کی تشکیل کرتا ہے، اب میکانکی طور پر بغیر غور و فکر کے شر ہی کا صدور ہونے لگتا ہے، اور شر کے نتائج و ثمرات سے ہم سب واقف ہیں، درد و رنج، غم و الم، حزن و یاس۔

میدانِ فکر کا سلبی خیالات کے خس و خاشاک سے پاک ہونا ضروری ہے، اور نیک خیالات کی تخم ریزی لازمی، سلبی خیالات کو دور کرنے کا طریقہ ان سے جنگ کرنا نہیں، ان کا زور مرد افگن ہوتا ہے، جب ہم ان سے مقابلہ کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہماری ساری توجہ ان ہی کی طرف لگی ہوتی ہے، آبِ حیات (یا چشمۂ حیات) کا بہاؤ توجہ کی طرف ہوتا ہے، بالفاظِ دیگر، اگر ہم کسی گناہ یا شر کی جانب توجہ کریں، اس کے استیصال کی خاطر ہی، تو زندگی کی تمام قوتیں اس کی جانب رخ کرتی ہیں، اس طرح اس کی طاقت میں اور اضافہ ہوتا ہے، مثلاً اگر ہمیں بے خوابی کا مرض ہے، تو ہم جس قدر اس کے متعلق فکر کریں گے اور اس کو دور کرنا چاہیں گے، بالفاظِ دیگر اس کا مقابلہ کریں گے، اسی قدر یہ تکلیف زیادہ ہوتی جائے گی، اس کے برخلاف اگر ہم اس کو بھول جائیں تو ہم ٹھنڈی نیند سو جائیں گے، اسی طرح شر کے مقابلہ سے اس کی طرف توجہ ہوتی ہے، اور توجہ سے اس کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔

شر کا مقابلہ خیر سے کرنا چاہیئے، ظلمت کا مقابلہ نور سے۔ ظلمت کو دور کرنا ہو تو نور کو داخل کرنا چاہیئے۔ ظلمت کا مقابلہ ظلمت سے کرنا "ظلمات فوق ظلمات" کا مصداق بنتا ہے۔[۱]

اگر تمہیں نفرت کو دور کرنا ہو تو محبت کا تصور کرو، خوف کو دور کرنا ہو تو شجاعت و ہمت پر نظر جماؤ۔ خود غرضی کے بجائے ایثارِ نفس کا خیال رکھو، اسی طرح تمہیں غصہ کے بجائے حلم، بیماری کے بجائے صحت، کج خلقی کے بجائے خوش خلقی، شکایت کے بجائے صبر و شکر، قلق کی جبہ سائی

---

[۱] احادیث میں خطرات و وساوس کو دور کرنے کے لئے بعض اذکار یا مطلق ذکر کی ترغیب دی گئی ہے۔ اوپر جو علاج پیش کر رہے ہیں اس کا استنباط ان ہی احادیث سے کیا گیا ہے، جو عجیب الاثر نفسیاتی طریقہ ہے۔

کے بجائے رازقِ مطلق کا خیال اپنے ذہن میں جمانا چاہیئے، تمہارا معروضِ فکر جو ہوگا، رفتہ رفتہ وہی تم بھی بن جاؤ گے، یہی معنی ہیں جامی سامی رح کے اس قولِ بلیغ کے ؎

گر در دلِ تو گُل گذرد گل باشی   ور بلبلِ بے قرار بلبل باشی

تو جزوی و حق کل است گر روزے چند   اندیشۂ کل پیشہ کُنی کُل باشی

اس فکر کے ایک دوسرے اعتبار پر غور کرو، دُنیا میں وہی چیز بری ہے جس کو ہم برا سمجھتے ہیں، اگر ہم اس کو برا نہ سمجھیں تو ممکن ہے کہ وہ ہمارے جسم کو آزار پہنچائے، لیکن وہ ہمارے قلب کو چھو نہیں سکتی، یاد رکھو دُنیا میں ہر چیز کی قیمت رائے پر منحصر ہے، اور رائے تمہارے اختیار میں ہے، جب چاہو رائے کو ترک کر دو، پھر اس ملاح کی طرح جس نے اپنے جہاز کو سمندری پہاڑیوں سے بچا نکالا ہو تمھیں ہر طرف سکون نظر آئے گا۔ اگر تم اپنی رائے کو ترک کر دو، تو پھر یہ شکایت باقی نہ رہے گی، کہ ہائے مجھے نقصان پہنچا، اس شکایت کو ترک کر دو کہ ہائے مجھے نقصان پہنچا تو نقصان خود باقی نہ رہے گا، اسی لئے کہا گیا ہے کہ "عقلمند آدمی کی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ کسی خوش قسمتی کا محتاج نہیں"۔

خیالات کا ماحول پر اثر نا قابلِ انکار ہے، خیالات کی پختگی اور قوتِ انسان کی روح کو سخت جسمانی تکلیف میں بھی مطمئن اور قوی رکھ سکتی ہے، ارادہ نتیجہ ہے توجہ کا، یعنی خیال و فکر کا، جن خیالات کا اظہار انسان عمل میں کرنا چاہتا ہے، اُن ہی پر توجہ کو مرکوز کرتا ہے، ان ہی کو ذہن میں دُہراتا ہے، اُلٹتا پلٹتا ہے، ان ہی سے اس کے ذہن کی فضا مملو ہوتی ہے اور یہی خیالات عالمِ آثار میں عمل کی صورت اختیار کرتے ہیں، خیال حقیقت ہے عمل اس کا ظہور ہے۔ ولیم جیمس نے سچ کہا ہے " زندگی کا ڈرامہ ایک ذہنی ڈرامہ ہے ساری مشکل ذہنی مشکل ہے"۔

میدانِ فکر کو خس و خاشاک سے پاک کر کے نیک خیالات کی تخم ریزی کرو۔ باغ کے بیجوں کی طرح خیالات کے انتخاب میں بھی حزم و احتیاط ضروری ہے اور جس طرح بیج کو پودے کی

شکل میں نمایاں ہوتے کچھ عرصہ لگا تھا، اور تمہیں انتظار کرنا پڑا تھا اسی طرح خیالات کو قلب میں تغیر پیدا کرنے اور ہر نیک عمل میں ظاہر ہوتے دیر لگتی ہے، تمہیں پست ہمت نہ ہونا چاہیئے اور نہ رنجیدہ۔ اگر تم نے اپنا کام قاعدے کے موافق کیا ہے، خس و خاشاک کو صاف کیا ہے، نیک خیالات کے بونے میں احتیاط برتی ہے، تو شادمانی و مسرت، طمانیت و بردِ قلبی، سرور و کیف وہ گلہائے شاداب ہیں جو نتیجہ کے طور پر تمہیں حاصل ہوں گے۔

ان حقائق سے واقف ہونے کی وجہ سے عقلمند جانتا ہے، کہ دنیا میں اس کا کوئی دشمن ہے تو خود اس کا نفس ہے، اَعدیٰ عدوِّک نفسک التی بین جنبیک (البیہقی من حدیث ابن عباسؓ) اس لئے نہ وہ کسی پر ملامت کرتا ہے اور نہ کسی کی مذمت، بردِ قلبی کے ساتھ محاسبۂ نفس کرتا ہے، صبر و سکون کے ساتھ اپنا اخلاقی فرض ادا کرتا ہے، صرف یہی نہیں کرتا بلکہ کسی مزید مرض میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرتا ہے، وہ اپنے خیالات پر نظر رکھتا ہے، قلب کا دربان بن جاتا ہے، بد یا سلبی خیال کو داخل ہونے نہیں دیتا، داخل ہو جائے تو فوراً نیک یا ایجابی خیال کو اس کی جگہ لے آتا ہے، اپنے افعال کو بے عیب بناتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ حال نتیجہ ہے ماضی کا، قسمت نتیجہ ہے خیالات کا!

کامل گوید جہان تمام داہل است — ناقص گوید کہ کوتہ است و سہل است
شطرنج ہماں عرصہ ہماں رخت ہماں — ایں بردن و باختن زعلم جہل است

(سحابی استرآبادی)

احساس

جانا بقمار خانۂ رندے چند اند   با مردم کم عیار کم پیوند ند
رندے چند اند کس نداند چند اند   بر نسیہ و نقد ہر دو عالم خندند

(محمود)

اس صداقت سے انکار مشکل ہے کہ 'احساس' فکر سے زیادہ عظیم قوت ہے! جب حالتِ اضطراب میں ہم دعا کے لئے ہاتھ اُٹھاتے ہیں، تو دُعا کے الفاظ (افکار) نہیں' بلکہ وہ شدید احساس جو اُن افکار کے پیچھے ہوتا ہے' زندگی میں 'تغیر' پیدا کرتا ہے! اُن جذبات و احساسات ہی کی قوت کے بل پر ہم چیخ اُٹھتے ہیں۔

کونین را چو نعلین انداختیم و رفتیم!
دیوانگانِ شاہیم رِندِ برہنہ پائیم!

افکار کے ساتھ جب تک جذبۂ و احساس کی آمیزش نہیں ہوتی، افکار و تعقّلات میں قوت نہیں پیدا ہوتی، وہ بے جان ہوتے ہیں! ان میں گرمی ان ہی جذبات کی 'آتشِ درونی' سے پیدا ہوتی ہے! مجھے اس صداقت کا احساس ابتدا میں ایک بیوہ سے گفتگو میں ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا "باوجود بے سروسامانی کے میں کبھی فقر و قلت میں مبتلا نہیں ہوئی" اور اس کی وجہ اس نے یہی بتلائی کہ وہ ہمیشہ یہی محسوس کرتی تھی، کہ وہ غنی ہے! یعنی اس کا ہمیشہ یہ یقین رہا، کہ "حق تعالےٰ کے ہوتے ہوئے کیا غم، کیا کم!" ایک غنیِ مطلق کی معیّت کا اِدراک اُس کے قلب کو غنا و بے نیازی سے بھر چکا تھا۔ اور اسی احساس نے فقر و اِفلاس کو

اس سے دُور رکھا تھا!

حضرت بلال رضؓ سے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:-

لَا تَخْشَ مِنْ ذِی الْعَرْشِ اِقْلَالًا

یعنی خدائے قدیر سے قلت و فقر کے بارے میں ڈرو مت! اگر ہم اس علمِ صحیح کے بعد قلب سے خوف کو دُور کر لیں اور خود کو غنی محسوس کرنے لگیں تو ہماری تمام ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں اور اتنا بچ رہتا ہے، کہ ہم اِنفاق بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر ہمارے قلب میں فقر کا خوف جاگزیں ہو جائے، تو پھر ہر اچھی چیز ہم سے بھاگنے لگتی ہے! اگُلِ تر بھی خارِ خشک ہو جاتا ہے۔

یہی حال صحت کا بھی ہے۔ باوجود بیمار ہونے کے اگر ہم خود کو تندرست محسوس کریں، باطنی طور پر، تو بہت جلد ہم تندرست ہو جاتے ہیں! باوجود بیمار ہونے کے تندرست کس طرح محسوس کریں؟ جواب یہ ہے کہ اگر ہم واقعی بیمار ہیں اور صحت قطعاً ٹوٹ گئی ہے تو ہمیں آرام لینا چاہیئے اور دُوسروں کو اجازت دینی چاہیئے کہ ہمارا علاج کریں، لیکن اگر ہماری صحت محض خراب ہے تو تندرست محسوس کرنا تندرست ہونے کی حتمی تدبیر ہے! یہاں بھی یہ احساس کہ حق تعالےٰ "قوی" ہیں اور "سلام" ہیں اور وہ ہمارے ساتھ ہیں، قریب ہیں، اقرب ہیں محیط ہیں، ہمارے ظاہر و باطن، اوّل و آخر ہیں، ہمارے جسم و جان کو صحیح و تندرست رکھنے کے لئے کافی ہے، لیکن محض جاننا کافی نہیں، اس کا تحقُّق ضروری ہے۔ وہ احساس اور وجدان کی چیز ہے۔

تعقُّل علیحدہ چیز ہے اور وجدانِ قلب علیحدہ۔ تعقّل یا عقلی علم "عقیلہ" ہے روک ہے، مانع و حائل ہے، اسی لئے عرفانِ حق کے لئے ہمیں محض عقلی علم کو ترک

کرنا پڑتا ہے۔ جب یہ علم ترک کر دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا آخری نشان بھی باقی نہیں رہتا، اور اس کی کامل نفی ہو جاتی ہے تو ہمیں سب کچھ مل جاتا ہے اور ہم چیخ اُٹھتے ہیں:

از کنارِ خویش یابم ہر دمے من بوئے یار
چوں نہ گیرم خویشتن را ہر شبے اندر کنار

(رومی)

صداقتِ مطلقہ کی یافت اُس وقت ہوتی ہے جب ہم تعقل کی سرحد عبور کر جاتے ہیں جب ہم علمِ اکتسابی سے دست بردار ہو جاتے ہیں تو ہمیں وہ دولت مل جاتی ہے جو ہمیشہ سے ہم ہی میں موجود تھی! جب ہم 'فکر' چھوڑ دیتے ہیں تو ہم 'سکینت' کے سمندر میں تیرنے لگتے ہیں حضور و شہودِ حق، وجداناً و احساناً نصیبِ جان ہو جاتا ہے! دولتِ قرب و وصال ہمیں حاصل ہو جاتی ہے۔

موج دریائے ہوس اینجا غبار سینہ است
گر شود ایں آب ساکن تختۂ آئینہ است

(درد)

تعقل و تفکر کے ذریعہ حق تعالیٰ کو پانے کی جب تک کوشش کی جاتی ہے وجدانِ قلبی پر ایک غلافِ شدید و غلیظ پڑ جاتا ہے یہ علم کا "حجابِ اکبر" ہے یہ حق کی یافت میں سب سے بڑا حجاب ہے۔ جب ہم قلب کی سمت کو حق کی طرف کر دیتے ہیں، تو حجاب اُٹھ جاتا ہے۔ "آگاہی و حضور" باطن قلب کی اسی کیفیت و نگرانی کا نام ہے جو ذوق و شوق، سرور و انشراح، جذب و مستی سے معمور ہوتا ہے! باطن کی یہی حالت فیض بے کیف بلا مزاحمتِ نظراتِ غیر و خیالاتِ ماسوئی بلکہ از اشیارِ اعتبارات صفاتیہ و اسمائیہ وہ مقام ہے جہاں کی بشارت "الذین یومنون بالغیب" سے دی گئی ہے جس کو

متاخرین سلسلۂ نقشبندیہ نے "کمالاتِ نبوت" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے!

اب ہمیں کل میں اپنا صحیح مقام معلوم ہو جاتا ہے! سیاراتِ سماوی کی طرح ہم اپنے محور پر گردش کرنے لگتے ہیں. کامل توازن و توافق کے ساتھ! ہماری زندگی بے ساختہ و بے تکلف ہو جاتی ہے جس میں ہر چیز اپنے صحیح وقت پر اور صحیح طریقہ پر وقوع پذیر ہوتی ہے. ہمیں کامل سکینت و طمانیت نصیب ہوتی ہے اور ہمیں "فی جَنبِ اللّٰہِ" ہوتے کا احساس ہونے لگتا ہے، ذاتِ قیوم کا آسرا مل جاتا ہے اور ہم ساکن ہو جاتے ہیں یا رحمتِ حق کے سمندر میں تیرنے لگتے ہیں، اور ہر جانب وجہ اللہ کا شہود ہونے لگتا ہے! ہر شے کو اپنے صحیح مقام پر ہر واقعہ کو اپنے صحیح وقت پر وقوع پذیر ہوتا پاتے ہیں.

اس دولت کا حصول تعقل یا تفکر سے ممکن نہیں، یہ ماورائے طورِ عقل ہے، عقل شاید درِ حق تک رہبری کر سکتی ہے، اس کے بعد ہمیں وجدان و احساس کی مدد سے آگے قدم بڑھانا پڑتا ہے. قرب و وصال کی نعمت کا اندازہ فکر و تعقل کے ذریعہ ممکن نہیں یہ صرف احساس و وجدان سے کیا جا سکتا ہے. "مَن ذَاقَ وَجَدَ"، جس نے چکھا پایا اسی کی پرورش ضروری ہے جو تعقل و استدلال سے بالکل مختلف چیز ہے.

جوں جوں اس راہ میں قدم آگے بڑھتے جاتے ہیں صداقت سادہ معلوم ہونے لگتی ہے! حق تعالیٰ کے عرفان کے لئے ہمیں زیادہ تر اس علم نظری کو ترک کرنا پڑتا ہے جو ہم نے ان کے متعلق حاصل کیا تھا، یہاں تک کہ ہر عقلی علم کی نفی ہو جائے. جب اس طرح ہر شے کی نفی ہو جاتی ہے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں سب کچھ مل گیا! جوہر جاں نذر کر کے ہم جاناں کو پاتے ہیں! ؎

لعل تو چوں حاصل است جوہرِ جاں گو مباش

عقل کے بتلائے ہوئے وہ تمام پیچیدہ نظریات، رموز و اسرار جو ہم نے سیکھے تھے وہ سب

"گومباش" کے حکم میں آجاتے ہیں۔ جب ہمیں حق کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے تو پھر حق کے متعلق سارے نظریوں کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی! اب جس چیز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے وہ صرف حضور و شہودِ حق ہے! اسی "نسبتِ باطن" کی تقویت ہے! "حضور و شہودِ ذاتِ حق علی الدوام بلا ملاحظۂ اعتبارے از اعتباراتِ کونیہ و مسرور و ملتذ بودنِ باطن بہ ایں حالت و جذب و کشیدگی دائمی الی اللہ علی نہج مجہول الکیفیت" اس طرح کائنات کی قدیم گتھی حل ہو جاتی ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات سے توصّلِ تام حاصل ہو جاتا ہے، نظری و عقلی طور پر نہیں بلکہ عملی و واقعی تجربہ کی بنا پر!

ہر روز ہم اس "مراقبہ" کے لیے وقت نکال سکتے ہیں۔ ہم خدا کی عقلی تعریف کرنے کی کوشش نہیں کرتے، کیونکہ خدا تمام تعریفات سے ماوراء ہے۔ سُبحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوْنَ۔ ہم خدا کو عقل سے جاننے کی خواہش نہیں کرتے، ہم قلب کی گہرائیوں میں اُس کو پاتے ہیں یا انفس کی گہرائیوں میں اس کی سکینت کا احساس کرتے ہیں!
جب ہم مُراقب ہوتے ہیں تو حق تعالیٰ کو ہم اپنے پاس ہی پاتے ہیں۔ اِنّہٗ سُبحَانَہٗ تَعَالیٰ ھُوَ الاَقرَبُ مِن حَبلِ الوَرِیدِ فِی الوُجُودِ کَذٰلِکَ فِی الوُجدَانِ۔

تجدنی فی سواد اللیل عبدی
قریبًا منک فاطلبنی تجدنی

"رات کی تاریکی میں اے بندے تو مجھے اپنے قریب پائے گا، مجھے ڈھونڈھ مجھے پائے گا ضرور!"

مرا اندر شبِ تاریک یابی
ز جانِ خویش ہم نزدیک یابی
مرا نزدیکِ خود پیوستہ می داں
طلبی دانی دگر دانی بیابی

یا پھر جب ہم "مراقبہ" میں خاموش بیٹھتے ہیں ___ خاموش، اشخاص و تعینات سے نظرِ قلب کو ہٹا کر ماسویٰ سے قلب کا تخلیہ کر کے، حق سبحانہ تعالیٰ کی ذات کی طرف توجہ بے جہت لگا کر تو ہمیں "توحیدِ محمدی" و توحیدِ مطلق کی حالت نصیب ہوتی ہے اور مبداِ فیاض سے فیوض و برکات کی بارش ہونے لگتی ہے! ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ہمارا مادّی جسم تحلیل ہو رہا ہے اور ہم روح مجرّد بن رہے ہیں! تمام مذاہبِ حقہ کا یہی مقصود ہے۔ مادہ سے روح کی طرف عروج، زمانی و حادث سے سرمدی و لا زمانی کی طرف صعود! اسم۔ رسم سے گذر کر، نام و نشان سے چھوٹ کر قبلہ توجہ تنزیہ مطلق و غیب صرف کو قرار دینا علو ہمت اسی کا نام ہے اور بلند ہمتی حق تعالےٰ کی نظر میں محبوب ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ مَعَالِیَ الْھِمَمِ! کیا خوب کہا ہے کسی نے:

آں لقمہ کہ در دہاں نہ گنجد طلبم

کیونکہ مقصود 'وصول' ہے نہ کہ 'حصول'، اور مطلوب 'قرب' ہے نہ کہ 'ادراک'

گر شتم نا بد ایں عنقا بدامم
تنیدہ تہائے دامش را غلامم
کسے را گرچہ برگِ ایں سفر نیست
بہ از سودائے او چیزے دگر نیست

دونوں صورتوں میں، خواہ ہم وصول ہو کے قائل ہوں یا حصول کے، قرب کے قائل ہوں یا ادراک کے، اکابرِ وجودیہ کے پیرو ہوں یا اکابرِ شہودیہ کے، صورتِ حال ماورائے طورِ عقل ہے، وجدانِ قلبی کے دائرہ کی چیز ہے اور ہر وقت قلب کا نیاز و شکستگی کے ساتھ ذاتِ الٰہی کی طرف متوجہ رہنا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ توجہ الی اللہ بے مزاحمتِ خواطر ملکہ بن جائے اور یہی صوفیہ کی اصطلاح میں "حضور" کہلاتا

ہے ذکر کا مقصود یہی حضور ہے!

زندگی کا اصل مجاہدہ یا کوشش یہی ہے، اس کے ساتھ کشش کی امید لگی رہے!

در کریم سے مایوس کون پلٹتا ہے

عاشق کہ شد یار بحالش نظر نہ کرد

اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

طالب حق کا کام ادائے فرائض وسنن موکدہ کے بعد ذکر و مراقبہ کے سوا کچھ نہیں یہاں تک کہ حضور کا ملکہ حاصل ہو جائے اور اس کے نتیجہ کے طور پر "فنائے نفس" اور تہذیب اخلاق سے وہ مشرف ہو جاتا ہے اور "اخلاق اللہ" سے متخلق!

"فنائے نفس" اصطلاح سلوک ہے جس کا مفہوم "حالت اطمینان" ہے ورنہ نفس ناطقہ ہرگز فنا نہیں ہو سکتا۔ شریعت کی اصطلاح میں یہی حالت "اطمان نفس" کہلاتی ہے اور "نفس مطمئنہ" اپنے رب سے راضی و مرضی ہوتا ہے، وہی عبد کامل ہے اور دخول جنت کی اسی کو بشارت دی گئی

یٰاَیَّتُہَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (عم، ع ۱۴)

اے نفس مطمئنہ اپنے پروردگار کی طرف چل، اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش، پھر تو میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔"

خوب سمجھ لو، کہ تمام سیر وسلوک کا حاصل، زندگی کا مقصود، ماسوی اللہ کی گرفتاری سے دل کا آزاد ہو جانا ہے، دوام حضور وشہود کا میسر ہونا ہے، تاکہ اس کے نتیجہ کے طور پر صبر بر بلا، رضا بقضا، تحمل مکروہات کی قوت قلب کو حاصل ہو جائے اور مشتہیات نفسیہ سے وہ رک جائے۔ جب یہ دولت حاصل ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیئے، کہ تمام مقامات و مراتب

حاصل ہو گئے۔ اب ہم اپنی زندگی طمانیت و سکینت سے بسر کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

جدائی مبادا مرا از خدا
دگر ہر چہ پیش آیدم شائدم

(پہلوان محمود)

قانونِ تجاذب

اور تعمیرِ سیرت

بدمی کنی و نیک طمع می داری | ہم بد باشد سزائے بد کرداری
با آنکہ خداوند کریم است و رحیم | گندم ندہد بار چو جو می کاری (رومی)

قانونِ تجاذب :(LAW OF ATTRACTION) ذہنی یا روحانی زندگی کا ایک ضروری کلی اور عالمگیر قانون ہے، نہ اس کی ضد قابلِ تصور ہے اور نہ اس کا کوئی استثنار ہے۔ کون شبہ کرسکتا ہے کہ جن طبائع میں مماثلث پائی جاتی ہے وہ ایک انجذابی قوت کے زیرِ اثر ایک دوسرے پر غیر شعوری طور پر مائل ہوتی ہیں اسی لیے تو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کسی شخص کی سیرت کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو دیکھو اس کی صحبت کیسی ہے، قانون کی صداقت کا تو ہر کوئی قائل ہے لیکن ہمیں یہاں اس کے بعض تضمنات کو ذرا کھول کر بیان کرنا ہے۔

ہشدار کہ راہ خود بخود گم نہ کنی

فکر کی دنیا میں اس قانون کی سرگرمی پر غور کرو! ایجابی اور نیک خیالات مماثل خیالات کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں اور ان کے درمیان ائتلاف یا وابستگی ہوتی ہے، اسی طرح بد، سلبی اور شر انگیز افکار باہم وابستہ ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو پیدا کرتے ہیں، اپنی طرف کھینچتے ہیں، قوت پہنچاتے ہیں، تمہارے ذہن میں ایک خیال آتا ہے، اب اس کو تھوڑی دیر روکے رکھو، اس پر تخیل کی تعمیری قوتوں کو مرکوز کرو، مماثل خیالات کا خطور شروع ہو جائیگا۔ رفتہ رفتہ ان میں زیادتی ہو جائیگی اور بالآخر ان کا ہجوم ہونے لگیگا اور تمہارے ذہن کی فضا

اُن سے مملو ہو جائیگی، جن لوگوں نے اپنے ذہن کی تربیت میں کوشش کی ہے اور اپنے افکار وخیالات پر قابو پیدا کر لیا ہے وہ اس قانون کو تعمیری طریقہ سے استعمال کرتے ہیں، اور دنیا سے اپنی قوتِ فکری کا لوہا منواتے ہیں!

دیکھو مصنف کسی خاص موضوع پر قلم اُٹھانا چاہتا ہے، ایک مرکزی خیال اس کے قلب پر چھایا ہوا ہے، وہ رات دن اسی میں غرق ہوتا ہے، سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے اس کا ذہن اسی میں مصروف ہوتا ہے، ناگہاں افکار وتصورات کا تسلسل شروع ہو جاتا ہے، اور نامعلوم وناقابلِ علم منبع سے خیالات کا چشمہ اُبلنے لگتا ہے اور جب تک یہ حالت نہ ہو مصنف لکھنے کی کوشش نہیں کرتا!

اسی طرح مقرر اپنی تقریر کی تیاری کے لیے اپنے موضوع پر ذہن کی سرچ لائٹ ڈالتا ہے، انہماک کے ساتھ اس پر غور کرتا ہے، قانونِ تجاذب کا غیر مرئی عمل مماثل تصورات کا ذخیرہ بہت جلد فراہم کر دیتا ہے، ان میں ترتیب بھی پیدا ہو جاتی ہے اور نظام بھی، یہ سب مبدءِ نامعلوم سے پیدا ہوتے ہیں، اور مقرر کا ذہن ان کی قیام گاہ ہوتا ہے! یاد رکھو کہ مفکر تصورات کا خالق نہیں حامل ہوتا ہے وہ تصورات کو پیدا نہیں کرتا، وہ محض قانون کی پیروی کرتا ہے، اور نتیجہ کے طور پر اس کو خیالات وافکار کا تحفہ عطا کیا جاتا ہے، یہ عطا ہر شخص کی استعداد کے مطابق ہوتی ہے۔

قانون کے مضمون وتعبیر سے واقف ہونے کے بعد حصولِ مسرت اور تزکیہ نفس یا سیرت سازی کی خاطر اس کا استعمال کرو، اس کی توضیح میں ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں، لیکن ہم دو ایک مثالوں پر یہاں اکتفا کرینگے، فرض کرو کہ بیماری کا وہم تمہارے دل میں پیدا ہوا، اب بجائے اس کے کہ تم اس کو قبول کر لو اور اس کے متعلق فکر کرنے لگو، اور ذہن کو مماثل وسوسوں اور وہموں کا آماج گاہ بنا لو تمہیں چاہیے کہ اس وہم کی نفی کرو اور وہ اس طرح کہ مبدءِ علم کی طرف فوراً متوجہ ہو جاؤ، یعنی حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور آہستگی سے لیکن

پورے اعتماد و اذعان کے ساتھ کہو،

حَصَّنْتُ نَفْسِیْ بِالْحَیِّ الْقَیُّوْمِ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ اَبَدًا وَّ دَفَعْتُ عَنْهَا السُّوْءَ بِاَلْفِ اَلْفِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔[1]

یا یوں کہو "میں حق تعالیٰ کی حفاظت میں ہوں اور تمام بیماریوں اور آفتوں سے محفوظ و مامون" ان الفاظ کو پکار کر کہنے کی ضرورت نہیں محض ذہنی طور پر یہ کہے جا سکتے ہیں، جو شخص اس طرح سلبی خیالات کو ذہن میں اُترنے اور اپنی جگہ بنانے سے روکتا ہے، اور قانونِ تجاذب کو اجازت نہیں دیتا کہ اپنے عمل سے ان سلبی، فاسد اور تباہ کن تصورات کی تعداد میں اضافہ کرے اور قلب کو خوف و ہراس سے بھر دے، بلکہ اس کے برخلاف اپنی حقیقت کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے اور وہاں سے ایجابی اور قوت بخش تصورات کو اخذ کرتا ہے جو قانونِ تجاذب کے عمل سے ہر آن زیادہ ہوتے جاتے ہیں، ہر دم نئی طاقت حاصل کرتے جاتے ہیں، قلب کو قوی کرتے ہیں، سیرت کی تعمیر کرتے ہیں، اور وفورِ قوت کی وجہ سے عمل میں نمایاں ہوتے ہیں، صحت کو درست کرتے ہیں، ماحول کو خوش گوار طریقہ سے بدل دیتے ہیں، موافقِ مرام نتائج پیدا کرتے ہیں اور اس طرح قسمت ہی کو بدل دیتے ہیں، یاد رکھو بیماری کی اصلی علت ذہنی ہوتی ہے، کیونکہ اگر ہم جراثیم کے نظریے کو بھی مان لیں تو بھی یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جراثیم کا اثر اس قلب پر نہیں ہوتا جو ایجابی (POSITIVE) ہوتا ہے یعنی جو خود کو سلبی خیالات کا بازی گاہ نہیں بناتا، جو ہر دم وساوس اور ہواجس کی نفی کرتا ہے، اور ان کی بجائے ایجابی اور حیات بخش اور نیک خیالات کا اثبات کرتا رہتا ہے اور ان کے مبدء یعنی اپنی حقیقت کو کسی آن فراموش نہیں کرتا، ایسا قلب بیماری کا آسانی کے ساتھ شکار کیسے ہو سکتا ہے؟ بیماری طبیعت کی

---

[1] میں نے اپنے نفس کو محفوظ کیا اُس ذات پاک کی مدد سے جو حی اور قیوم ہے اور جو کبھی نہیں مرتی اور اپنے نفس سے بُرائی کو دور کیا، اسی کی حول و قوت سے۔ یہ حدیث کے الفاظ ہیں ضروری نہیں کہ ان ہی کا استعمال کیا جائے، ان کے بجائے کوئی اور موزوں الفاظ استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

کمزوری سے پیدا ہوتی ہے، طبیعت اگر قوی ہو تو سرے سے بیماری کا وجود ہی ناممکن ہے، یہ کوئی ایجابی چیز نہیں بلکہ سلبی صفت ہے، قدرت کا نہ ہونا ہی عجز ہے، قوت کا نہ ہونا ہی بیماری ہے، سلبی خیالات منفی افکار قوت کو سلب کرتے ہیں، قلب کو کمزور کرتے ہیں، اعضا کو مضمحل کرتے ہیں، اعصاب میں تناؤ پیدا کرتے ہیں، اور اسی لیے ان کو ایجابی و ثبوتی تصورات سے بدل دینا چاہیے ایجابی افکار کا مبدء حق تعالیٰ ہیں، جوں ہی ہم نے ان کی طرف اپنا رُخ کیا، گویا ہم ظلمت سے نکل کر روشنی میں آگئے، اب روشنی کی کرنیں آہستہ آہستہ ہمارے جسم میں داخل ہوتی ہیں، ان سے مردہ اعصاب جاگ اٹھتے ہیں، مضمحل اعضا میں توانائی آتی ہے، قلب و جگر تازہ دم ہو جاتے ہیں، کھوئی ہوئی صحت پوری قوت کے ساتھ عود کر آتی ہے صحت کے حصول کے لیے اور اس کے قیام و بقا کے لیے اس قطعی و حتمی نسخے کو یاد رکھو اور ہمیشہ اس کو استعمال کرتے رہو۔

قانونِ تجاذب کے استعمال کی ایک اور مثال پر غور کرو، تم پر کسی نے زیادتی کی ہے، تمہارے ساتھ غیر منصفانہ برتاؤ کیا گیا ہے، تمہیں غصہ آتا ہے، رنج ہوتا ہے، اضطراب ہوتا ہے، اور تم اس نقصان پر ذہن کی ساری قوتوں کو مرکوز کر دیتے ہو، نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ سب سے پہلے حمائل خیالات کا ہجوم قلب پر ہونے لگتا ہے، یہ تاریک، اندوہ خیز، زہریلے خیالات جو قانونِ تجاذب کے عمل سے پیدا ہو رہے ہیں اپنے منحوس سایہ سے تمہاری ذہنیت کو مسموم کر دیتے ہیں، تمہاری سیرت فنا ہو جاتی ہے، تمہاری صحت ٹوٹنے لگتی ہے، اور ممکن ہے کہ بالآخر تمہارا دماغ بھی متاثر ہو جائے اور اس میں فتور آنے لگے، آتشِ انتقام کا سوختہ فاتر دماغ اگر انتقام پر اتر آئے تو اس کے نتائج اور اثرات عموماً مسرت و طمانیتِ قلب کے لیے مفید نہیں ثابت ہوتے۔

مرغ پر نارستہ چوں پراں شود | لقمۂ ہر گربہ دراں شود (معنوی)

اب اگر تم دَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (پ ۲۲ ع ۳)[1] پر عمل کرتے ہوئے اس کو معاف کیے دیتے ہو اور اپنے خیالات کی رو کو بدل دیتے ہو، سلبی خیالات کی بجائے ایجابی افکار کے قبول کرنے کے

---

[1] چھوڑ دے ان کا ستانا اور بھروسہ کر اللہ پر۔

لیے تیار ہو جاتے ہو تو تمہیں ان تمام شر انگیز و فتنہ خیز خارجی عناصر سے نجات مل جاتی ہے، اور اب تجاذب کا قانون تمام اچھی چیزوں کے رخ کو تمہاری طرف پھیر دیتا ہے، اب تم کو حقیقی معنی میں حریت نصیب ہوتی ہے، طمانیت حاصل ہوتی ہے مسرت میسر ہوتی ہے، کیونکہ تم نے سینہ کو کینہ سے پاک کیا، غضب سے پاک کیا، ان منفی جذبات کے دور ہو جانے سے تمہارے قلب سے ظلمت دور ہوئی، نور کا دخول ہوا اور تمہاری ہستی کا ہر ذرہ اس نور سے جگمگا اٹھا، اسی لیے تو کسی عارف نے کہا ہے :-

عالم تمام یک گل بے خار می شود　　　دل را اگر ز کینہ مصفا کنند کسے

ہر فعل کا اثر، ہر حرکت کا ردِ عمل، ہر علت کا معلول قطعی ہوتا ہے، یہ قانون کلی اور ضروری ہے، اب کینہ و غضب کے جذبات کا لازمی و جبری نتیجہ غم و حزن کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے اسی طرح عفو و احسان و رحمت، کرم، صبر و شکر کا قطعی و ضروری نتیجہ مسرت و طمانیت، تعاون و الفت، فلاح وغیرہ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے! علیت کے اس کلی عالمگیر، وجوبی و لزومی قانون پر یقین ہو جائے تو اَحْسِنْ اِلٰی مَنْ اَسَآءَ[۱] والے حکم پر عمل کرتے ہوئے ہمیں کوئی تکلف نہیں ہوتا اور ہم اپنے اس عقیدہ کا اظہار کسی شاعر تام المعرفت کے سریلے نغموں میں یوں کرتے ہیں :

ہر کسو در راہِ من خارے نہد من گل نہم!　　　او سزائے خار یابد من جزائے گل برم

یہ سن کر اور ہاں کر بھی تم ذرا جھلا کر کہتے ہو، کیا یہ میرے بس کی بات ہے، میں بہر حال بشر ہوں اور فطرۃً مائل بہ شر ہوں، فطرۃً ظلوم ہوں، جہول ہوں، ظلمت و جہل میری ماہیت میں داخل ہیں، ان صفاتِ عدمیہ کو مجھ سے دور کیسے کیا جا سکتا ہے، ان کی وجہ سے آفت و مصیبت میں مبتلا ہوتا رہتا ہوں لیکن سچ پوچھو تو حال یہ ہے ؎

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں　　　پھر وہی زندگی ہماری ہے! (غالبؔ)

---

[۱] جس نے تمہارے ساتھ برائی کی ہے اس کے ساتھ بھلائی کرو۔

تم ایک حد تک ٹھیک کہتے ہو آؤ ہم تمہیں ایک نفسیاتی طریقہ بتلائیں جس کے استعمال سے تمہیں غایت کے حصول میں آسانی ہوگی۔

جس شخص سے تمہیں نقصان پہنچا ہے، اور جس کے خیال سے تمہارے بدن میں سوزش ہوتی ہو اور جس کو معاف کرنا تم ممکن نہیں سمجھتے اس کو معاف کرنے کے لیے تمہیں چاہیے کہ کچھ دن اس صداقت پر غور کرو۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ	اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی
فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا	ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں سے ہے اور بہت سے
عَنْ كَثِيْرٍ (پ ۲۵ ع ۵)	تو اللہ درگزر ہی کر دیتا ہے۔

نیز انما هی اعمالکم ترد علیکم (الحدیث) یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو تم پر لوٹائے جاتے ہیں

ذرا سوچو اصل میں تمہارا کوئی دشمن نہیں سوائے تمہارے نفس کے یہ سب کچھ اسی کا کمایا ہوا ہے، اور اسی کے عین کا تقاضا یداك کسبتا و فوك نفخ [1]۔ دوسرے کو اپنے افعال کا ذمہ دار قرار دینا تمہاری عقل کی کجی اور جذبات کی خامی کی دلیل ہے، جوں جوں تم اس صداقت پر غور کرتے جاؤ گے تم پر واقعات کھلتے جائینگے، اور ہر آفت، ہر مصیبت کی علت تم اپنی ہی کسی حماقت کو پاؤ گے! اگر سلسلہ تفکر کو چند روز جاری رکھو گے تو حقیقت اس قدر مبرہن ہو جائیگی کہ بے اختیار چیخ اٹھو گے کہ غلطی میری تھی کسی دوسرے کی نہیں اور حق تعالیٰ کی طرف ظلم کی نسبت تو کسی طرح نہیں کی جا سکتی۔ اِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ [2]

ہر چہ ہست از قامتِ ناسازئ اندامِ ماست ورنہ تشریفِ تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

اس اصول کی صداقت کے وجدان میں کھل جانے کے بعد تم اپنے دشمن کو بھی معاف کرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔

---

[1] تیرے ہاتھوں نے کمایا ہے اور تیرے ہی منہ نے پھونکا ہے۔

[2] بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

اگر تم جذباتی انسان ہو عقل سے کافی حصہ تمہیں نہیں ملا ہے اور مذکورہ بالا اصول تمہاری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا تو تمہیں یہ دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے :-

جس شخص کو تمہیں معاف کرنا ہے اس کی شبیہ اپنے تخیل کی مدد سے اپنی نظروں کے سامنے لے آؤ اور اب اس کو مخاطب کر کے کہو "میں تمہیں (نام شخص) حسبۃً للہ پوری طرح معاف کرتا ہوں، دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ تمہیں اپنی نعمتوں سے سرفراز کریں اور تمہیں نورانی کر دیں، آمین"

اگر تم یہ عمل چند روز مسلسل و خلوص دل کے ساتھ کرتے رہو تو کچھ دن بعد تمہیں یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ تمہارے لیے اس شخص کو معاف کر دینا زیادہ مشکل تو نہیں، اپنے اس مجاہدے سے اگر تم نے حسنِ خُلق حاصل کر لیا کہ خلق کی طرف سے جفا کے باوجود ان سے وفا کی، رحمت و شفقت کو اپنا شعار بنایا، اور ان کے لیے بخشش و عفو کی دعا کی، تو اب حقیقی مسرت، طمانیت، سکون، بردِ قلبی، محبت، وہ انعامات ہیں جو حق تعالیٰ کی جانب سے تم کو عطا کیے جائیں گے، اور وہ تمہیں بطریقِ اجتبا اپنی جانب کھینچ لینگے۔

راہ بسیار است مردم را بسوئے حق ولے

راہ نزدیکش دل مردم بدست آوردن است

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ، لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ

(پ ۲۳ ع ۶)

؎ بیشک یہی ہو بڑی مراد ملنی، ایسی چیزوں کے واسطے چاہیے محنت کریں محنت کرنے والے۔

قرآن اور سیرت سازی[1]

شہ نیست کسے کہ تختِ طلب دارد | تا آنکہ نہ شاہانہ مزاجے دارد
یعنی کہ خرد بس پیشِ اربابِ شعور | سلطاں نشود اگرچہ تاجے دارد (درد)

دنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت شئے، سب سے زیادہ گراں قدر اور عزیز شئے، پاک سیرت ہی، زندگی تربیت گاہ ہے، حق تعالیٰ مُربی و معلم ہیں، واقعات وحادثات وہ آلات وادوات ہیں جن کے ذریعہ وہ ہماری سیرت کی تکمیل کر رہے ہیں، دنیا کی "روح ساز" وادی میں کبھی غم کے مضراب سے اور کبھی خوشی کے تاروں سے سیرت ہی کے خفتہ نغمے بیدار کیے جاتے ہیں، زندگی کی غایت ہی یہ نظر آتی ہے کہ سیرت کو سنوارا جائے، پختہ کیا جائے، کامل بنایا جائے، کیوں؟ اس لیے کہ سیرت ہی پر دنیوی کامیابی کا انحصار ہے، سیرت ہی پر فوزِ آخرت کا مدار ہے، دین و دنیا کی اصلاح سیرت ہی کی اصلاح سے ہو سکتی ہے، سیرت ہی پر جسمانی اور روحانی صحت مبنی ہوتی ہے، اور بردِ قلبی اور طمانیتِ خاطر پاک سیرت ہی کا نتیجہ ہے! بنی آدم کا "اکرام" سیرت ہی کی پاکی کی وجہ سے ہوتا ہے، جو انسان پاک سیرت نہیں وہ صورۃً گو انسان ہے، لیکن حقیقۃً وہ حیوان ہے، یا دیو ہے یا غول ہے، "شیاطین الانس" میں اس کا شمار ہے، وہ دنیا، دین اور آخرت کی حقیقی اقدار سے محروم ہے!

سیرت، علمائے نفسیات کی باریک بیں اور دوررس نگاہ میں ان تیقنات، عادات، میلانات کا مجموعہ ہے جو فرد کے کردار کی رہنمائی کرتا ہے، اس کو دوسروں سے متمیز کرتا ہے، اور اس کی وحدتِ کردار کا باعث ہے، ہر فرد دوسرے فرد سے متمیز ہوتا ہے، صورت اور

---

[1] یہ مقالہ معارف میں مارچ ۱۹۳۲ء میں اول مرتبہ شائع ہوا۔

سیرت میں، صورت کی غیریت تو حقیقی واقعی ہوتی ہے، یہ رفع نہیں کی جاسکتی، اور نہ کوئی اس کو رفع کرنا چاہتا ہے، لیکن سیرت میں ایک قسم کی مماثلت ہوسکتی ہے، یہ مماثلت عینیت نہیں انفرادیت ناقابلِ انکار ہے، باوجود مماثلت کے انفرادیت موجود ہوتی ہے، اور اس انفرادیت کا مبدأ، اور اس کے وہ اقتضاءات وقابلیات ہیں، جو اپنا ظہور عادات وافعال میں کرتے ہیں اور اس تمام مجموعہ کو ہم نفسیات کی اصطلاح میں سیرت سے تعبیر کرتے ہیں، سیرت افعال میں وحدت پیدا کرتی ہے، اور سیرت کے کامل علم کے بعد بڑی حد تک فرد کے افعال کی پیشین گوئی ممکن ہوجاتی ہے۔

سیرت کی تحلیل میں ہمیں اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ یہ عادات کی تنظیم کا نام ہے عادت کی تشکیل افعال کی تکرار سے ہوتی ہے، افعال کا صدور بظاہر محرکات پر مبنی ہوتا ہے، لیکن محرکات کا ماخذ ومنبع وہ تیقنات واذعانات ہوتے ہیں، جو انسان زندگی کے تجربات ماحول کے اثرات، تعلیم اور دوسرے ذرائع سے حاصل کرتا ہے۔ علم یقین عمل وعادات یہ وہ اہم عناصر ہیں، جن میں سیرت کی تحلیل کی جاسکتی ہے، سیرت سازی کے طریقے کو جاننے کے لیے ہمیں ان ہی عناصر کی تحقیق کرنی ہوگی۔

(۱) علم ویقین: العلم نکتۃٌ، سیرت سازی کے لیے صرف ایک نکتہ کا وجدانی اجمالی علم کافی ہے، پھر عقلی طور پر اس کی تفصیل وتوضیح میں دفاتر رنگے جاسکتے ہیں ؎

دل گفت مرا علم لدنی ہوس است　　　تعلیم کن گرت بدیں دسترس است
گفتم کہ الف، دگر گفتم ہیچ　　　در خانہ اگر کس است یک حرف بس است

(شیخ عزیزالدین محمود الکاشی)

وہ وجدانی علم، علم لدنی، حق تعالیٰ کی الوہیت کا اقرار ہے، اسی اقرار کی مضبوط چٹان پر سیرت کی مشید عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے، اس اقرار کے تضمنات پر غور کرو، جب میں ایمان و اذعان کی شاہانہ قوت سے حق تعالیٰ کے الٰہ ہونے کا اقرار کرتا ہوں تو سب سے پہلے میں یہ ان

رہا ہوں کہ حق تعالیٰ ہی معبود ہیں، وہی عبادت یا پرستش کے قابل ہیں، عبادت کیا ہے، یہ غایتِ تذلل کا نام ہے، اظہارِ ذلت کا نام ہے، میرا یہ سر اگر جھک سکتا ہے تو بس میرے خالق، میرے مولیٰ، میرے مالک و حاکم ہی کے سامنے جھک سکتا ہے، اور غیر کے سامنے ہرگز نہیں جھک سکتا! اظہارِ ذلت کی وجہ کیا ہے؟ میں فقیر ہوں محتاج ہوں، میرا معبود غنی کر قوت و اقتدار سے متصف ہے، علم و حکمت سے موصوف ہے، رب ہے، پالنے والا ہے، مستعان ہے، مدد کرنے والا ہے، استعانت ہی کی خاطر میں اس کے سامنے اظہارِ ذلت کرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ سارا عالم فقیر ہے، اور میرا معبود ہی صرف غنی و حمید ہے، میں اس کا فقیر ہو کر سارے عالم سے غنی ہوں، میرا یہ احساس کہ میں اس شہنشاہ کا دریوزہ گر ہوں، جس کے دریوزہ گر سارے شاہ و گدا ہیں، مجھے سارے عالم سے بے نیاز کر دیتا ہے اور میں کفیٰ باللہ وکیلا کہہ کر عبادت و استعانت کے نقطۂ نظر سے ماسوی اللہ سے کٹ جاتا ہوں، اور فقر و ذلت یا بندگی کی نسبت اللہ ہی سے جوڑ لیتا ہوں، اب کائنات کی بڑی سے بڑی قوت بھی میرے لیے امید و کا مرکز بن سکتی ہے، اور نہ خوف و ہراس کا سبب، ان سب کا فقر، ان سب کی ذلت و مجبوری، بیچارگی و بے بسی میری نظروں میں اتنی ہی آشکارا و ہویدا ہو جاتی ہے جتنی کہ خود میری بیکسی و مجبوری، ہم سب عبد ہیں، کوئی چیز اصالۃً ہماری نہیں، فقر ہماری ذاتی صفت ہے، امانۃً چند روز کے لیے چند چیزیں ہم کو دی جاتی ہیں، نادانی سے ہم ان کو اپنی سمجھتے ہیں، حقیقی مالک کو بھول جاتے ہیں، انہی کی محبت میں فریفتہ ہو جاتے ہیں، حقیقی اقتدار سے غافل ہو جاتے ہیں، ناگہاں یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے، اور یہ ساری محبوب و مرغوب چیزیں موت ہم سے چھین لیتی ہے، اور پھر اپنے اصلی فقر و ذلت کے ساتھ ہم نادم و پشیمان اس جہان سے رخصت ہو جاتے ہیں تاکہ اپنے اعمال کے اثرات کو، اپنے افعال کے نتائج کو، اپنے کردار کے اثمار و عواقب کو جو اس دنیا میں بھی اپنی موجودگی کا مختلف رنگوں میں ہمیں احساس بخش رہے تھے، زیادہ نمایاں، زیادہ واضح اور اجاگر طریقے سے دیکھیں، اور حسرت و ندامت کی آگ میں جلیں۔

سیرت کی تعمیر اسی اساسی یقین پر ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ ہی معبود ہیں، جن کے آگے پیغمبر اسر جو سارے جہان کے مقابلہ میں معزز و مفتخر، بلند و بالا ہے، فقیرانہ شان سے جھک رہا ہے اور حیات و علم، رزق و فراخی، صحت و عزت، ہدایت و رشد کی استدعا کر رہا ہے، اور غیر متزلزل یقین کے ساتھ کر رہا ہے کہ حواس کی آنکھ چاہے جو تماشا دکھلائے، اور وہم چاہے جو مانے اور منوائے، یہ ساری نعمتیں حق تعالیٰ ہی دے سکتے ہیں، اور دیتے ہیں، ان کے سوا نہ کسی میں حول و قوت ہے اور نہ فعل و اثر وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ! صورتوں سے جو ہم نے امیدیں باندھ رکھی ہیں، صورتوں کو جو ہم نے خوف کی چیزیں سمجھ رکھی ہیں، صورتوں کے سامنے جو ہم ذلت کا اظہار کر رہے ہیں، اور صورتوں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں، اور ان کو رب بنا رکھا ہے، یہ کس قدر عظیم الشان دھوکا ہے، اس کے ضرر و اضلال کا پہلو کس قدر قوی ہے، عزتِ نفس کی خونریزی کو دیکھو، اپنی ذلت و رسوائی کو دیکھو، اس کذب و افتراء کے نتائج پر غور کرو، فقیروں کے در پر سوال کرنے سے بھی کچھ ملا ہے، اس غریب کے ہاں کیا رکھا ہے، جو دوسروں کو دے، امیدوں کا خون ہونا لازمی ہے، حسرت و حرمان قطعی، جو بیچارہ اپنے درد دکھ کو دفع نہ کر سکتا ہو، وہ تمہارے درد و غم کا کیا علاج کر سکتا ہے، وہ تمہارا مولیٰ و رب کیسے ہو سکتا ہے، ہائے تم نے حقیقت کو چھوڑ کر سایہ کا تعاقب شروع کر دیا ہے، بیدار کو چھوڑ کر مدہوش سے التجا کر رہے ہو، زندے کو چھوڑ کر مردے سے لپٹے ہوئے ہو! تمہارے وہم نے تمہیں کس التباس میں مبتلا کر رکھا ہے!

بقولِ دشمن پیمانِ دوست بشکستی ببیں کہ از کہ بریدی و باکہ پیوستی!

معبود و مستعان صرف حق تعالیٰ ہی ہیں، ذل و افتقار کی نسبت ان ہی سے ہمیں جوڑنا چاہیے، وہی ہماری امیدوں کے مرکز ہیں، ان ہی کی ناراضی سے ہمیں خوف کرنا چاہیے، اور چوب و سنگ یا گوشت و پوست کے جھوٹے خداؤں سے بندگی کی نسبت قطعاً توڑ لینی چاہیے، ان سے نفع و ضرر کی توقع قطعاً چھوڑ دینی چاہیے۔

تاچند گہ از چوب گہ از سنگ تراشی بگذر از خدائے کہ بصد رنگ تراشی

حق تعالیٰ کی معبودیت و ربوبیت پر یہ یقین، یہ ایمان سیرت کا سنگِ بنیاد ہے، اسی یقین کی پرورش ہونی چاہیے، الٰہ باطلہ کی نفی، الٰہِ حق کا اثبات قلب کی گہرائیوں میں متمکن ہو جائے تحت الشعور نفس میں جاگزیں ہو، رگوں میں خون کی طرح دوڑ جائے، علم الیقین کے مرتبہ سے گزر کر حق الیقین کے درجہ تک پہنچ جائے، متحقق ہو جائے تو پھر ایسی شخصیت کی تخلیق ہوتی ہے، جس کا مقابلہ کائنات کی کوئی قوت نہیں کر سکتی، وہ بفحوائے تخلقوا باخلاق اللہ خلقِ الٰہی سے مزین ہوتا ہے، تمام صفاتِ رذیلہ سے پاک اور تمام اوصافِ حمیدہ سے آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے، کامل عبد ہوتا ہے، جس سے بہتر جس سے زیادہ مقدس دنیا میں کوئی شے نہیں ہوتی،

توحیدِ معبودیت کی رو سے حق تعالیٰ ہی مالک و حاکم قرار پاتے ہیں اور مستحق عبادت ٹھہرتے ہیں، ہمارا سر حقیقی مالک و حاکم ہی کے سامنے جھکتا ہے جس کے آگے ساری کائنات سرنگوں ہے، طوعاً و کرہاً اور توحیدِ ربوبیت کی رو سے حقیقی فاعل حق تعالیٰ ہی قرار پاتے ہیں وہی خالق ہیں، وہی نافع و ضار ہیں، وہی زندہ کرتے ہیں اور مارتے ہیں، ہمارا ہاتھ ان ہی کے آگے دراز ہوتا ہے، اور انہی سے ہم مدد و اعانت کے لیے درخواست کرتے ہیں! غنی کی فقیری ہمیں ساری کائنات سے بے نیاز اور غنی کر دیتی ہے!

دیکھو توحیدِ معبودیت و ربوبیت کا سبق دے کر عرب کے امّی معلم (فداہ ابی و امی) نے اپنے متبعین کو صفاتِ رذیلہ سے کس طرح پاک اور صفات حمیدہ سے کس طرح مزین کر دیا تھا، صفاتِ رذیلہ جن سے تمام علمائے اخلاق قلوب کا تزکیہ چاہتے ہیں، اس رباعی میں یوں ادا کیے گئے ہیں:۔

خواہی کہ دلت شود صاف چو آئینہ دہ چیز بروں کن از درونِ سینہ
حرص و حسد و بخل و حرام و غیبت کذب و غضب و کبر و ریا و کینہ

دیکھو ان صفاتِ قبیحہ سے قلب کا تزکیہ سقراط کے "طنزیات" افلاطون کے "مکالمات" ارسطو کی "اخلاقیات" اور جدید فلسفیوں کے عالمانہ "خطبات" کے بغیر پڑھے اور سمجھے صرف لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے مختصر جملہ کو ماننے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے کس آسانی سے ہو جاتا ہے۔

جب تک انسان دولت کو اپنی ملک سمجھتا ہے، خود ہی کو اس کا مالک جانتا ہے، نہ حرص کا اس کے قلب سے تسلط اُٹھ سکتا ہے اور نہ بخل و حسد کا، جوں ہی اس نے سچے دل سے توحید فی الآثار کا اقرار کیا، اور یہ مان لیا کہ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَمَا بَیْنَہُمَا، اللہ ہی کے لیے ہے سارے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے، تو اس نے اپنی مالکیت و حاکمیت کی نفی کی اور حق تعالیٰ کی مالکیت و حاکمیت کا اثبات کیا حقیقی مالک و حاکم و متصرف حق تعالیٰ کو جانا، اور اپنی ذات کو محض "امین" سمجھا، اب اس کی سمجھ میں یہ بھی آ گیا کہ حقیقی مالک ہی کو تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے، امین امانت کے شرائط کے تحت ہی تصرف کا اختیار رکھتا ہے، اب اگر دولت پر جو اس وقت اس کی امانت میں ہے، کوئی آفت آ جاتی ہے تو وہ بحیثیت امین اس کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے، اگر بچ نہ سکے تو جانتا ہے کہ مالکِ حقیقی امانت کا استرداد چاہتا ہے، اور بخوشی وہ اپنی امانت حوالہ کر دیتا ہے، اس طرح نہ اس کے جانے کا اس کو رنج ہوتا ہے، اور نہ اس کے آنے کی خوشی، اور اس کا قلب ان اختلال پیدا کرنے والے تاثرات سے پاک اور آزاد رہتا ہے، اور وہ ع:

یک دل دلے بس است یک دوست ترا

کہہ کر حق تعالیٰ ہی کو اپنا محبوب قرار دیتا ہے، اور ایک دم رنج و غم، پریشانی و پشیمانی کے تمام احساسات و جذبات سے حقیقی معنی میں نجات حاصل کر لیتا ہے، ایسے ہی خوش قسمت کی ذہنیت کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا تاکہ تم غم نہ کھاؤ اس پر جو ہاتھ سے جاتا رہا اور شیخی نہ کرو

بِمَآ اٰتٰکُمْ (پ ۲۷ ع ۱۹) اس پر جو تم کو اس نے دیا۔

ان اصول کو سمجھ لینے کے بعد غور کرو کہ وہ شخص حریص کیسے ہو سکتا ہے، جو مال و دولت کا حقیقی مالک حق تعالیٰ کو سمجھتا ہے، اور ان احمقوں کو جو اپنی ذات کو مالک سمجھ رہے ہیں، مخاطب کر کے کہتا ہے:۔

گماں مبر کہ زر و سیم دادہ اند ترا ودیعتے است کہ داری بدست روزے چند

چہ سود گر بشوی غرہ بر متاعِ کسے چو موش بر سرِ دکاں رو شاخرسند

حرص کے ساتھ بخل و حسد کی بھی جڑیں کٹ جاتی ہیں، جب مال و دولت ودیعت و امانت ہیں اور وہ بھی چند روزہ امانت، موت کے وقت یہ ہم سے واپس لے لی جاتی ہیں، اور دوسروں کے حوالہ کی جاتی ہیں، تو پھر اس علم کے بعد ہماری ذہنیت اس چوہیا کی طرح کیسے رہ سکتی ہے جو بنیے کی دکان کی ساری چیزوں کو اپنی سمجھتی ہے اور اپنے ہی کو مالک و متصرف جان کر بخل و حرص کا شکار بنتی ہے، غیر کے مال میں بخل بے معنی ہے، بخل ہوتا ہے اپنے مال میں؛ مال اپنا نہیں، پھر بخل کیسا؟ حرص کی بنیاد ہی اس خیال پر قائم ہے کہ مالک ہم ہیں، حقدار ہم ہیں، ہم کو نہیں مل رہا ہے، دوسروں کو مل رہا ہے، ہم کو کیوں نہ ملے! جب مال میرا ہے نہ تیرا بلکہ مالکِ حقیقی کا تو حسد کس پر؟ حسد و حرص اور ان کے لازمی نتائج، ہم و غم، درد و حزن رنج والم نتیجہ ہیں خیانت فی الامانت کا، یعنی شرک کا، جوں ہی شرک کی جڑیں قلب سے لاالٰہ الا اللہ کے ذریعہ اکھاڑ کر پھینک دی گئیں، اور اس کی بجائے توحید جلوہ افروز ہو گئی انسان ان تباہ کن جذبات کے چنگل سے نجات پا جاتا ہے، حقیقی آزادی کا لطف اٹھاتا ہے، سکون و بردِ قلبی کی دولت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

کبر و فخر و عجب کی اس قلب میں گنجائش ہی کہاں جو اپنے کو حاکم نہیں محکوم، مالک نہیں مملوک، رب نہیں مربوب، مولیٰ نہیں عبد سمجھتا ہو، اپنی محکومیت و مملوکیت کا یقین جو موحِّد کے دل کی گہرائیوں میں جاگزین ہے، فخر و غرور کے جذبات کو پیدا ہونے نہیں دیتا۔

اس کی عضویت اس زہر کو قبول کرنے کی صلاحیت یا استعداد ہی نہیں رکھتی۔

اب توحید فی الربوبیت کے قیام کے آثار پر غور کرو، جب تم نے فاعل حقیقی حق تعالیٰ کو مان لیا، لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللہِ کے قائل ہو گئے، نافع وضار فی الحقیقت انہی کو سمجھنے لگے، تو خوف وحزن سے تم نے رستگاری حاصل کر لی، غیر کو نافع وضار قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تم کو اس سے نفع پہنچنے کی اُمید ہوتی ہے، اور اس اُمید کی شکست حزن وغم کو ضروری طور پر پیدا کرتی ہے، اس سے ضرر کا اندیشہ تمہارے سینہ کو خوف سے بھر دیتا ہے، جونہی تم نے وہم کے اس بت کو توڑا، اور حق تعالیٰ کی اس تنبیہ کو یاد کیا، کہ

وَلَاتَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللہِ مَالَایَنْفَعُكَ وَلَایَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیْنَ ٥ (پ ۱۶۶)

اللہ کے سوا کسی کو مت پکار، ایسے کو کہ نہ بھلا کرے تیرا اور نہ بُرا، پھر اگر تو ایسا کرے، تو تو ہو جائیگا ظالموں میں۔

غیر اللہ کی ربوبیت تمہارے قلب سے فنا ہو گئی، نفع کی اُمید، ضرر کا خوف تمہارے سینہ سے جاتا رہا، اور حزن وخوف سے تم نے ہمیشہ کے لیے نجات پالی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَاخَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ! (پ ۲۶ ع ۲)

مقرر جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہی، پھر ثابت قدم رہے تو نہ ڈر ہو اُن پر اور نہ وہ غمگین ہونگے۔

ربوبیت پر جہاں تم نے استقامت پیدا کر لی کہ دنیا اور زندگی کے متعلق تمہارا سارا نقطۂ نظر بدل گیا، نقطۂ نظر کا بدلنا تھا، کہ زمین وآسمان بدل گئے ؎

چو برخیزد خیال از چشم احول | زمین وآسماں گردد مبدّل

ایک وہم تھا خیال تھا جس نے تمہیں خوف وحزن کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا، اب تم نے اس خیال کی تصحیح کی، ذہنی صحت تمہیں حاصل ہوئی، نور کی طرف تم نے اپنا منہ کر لیا،

اور تمہاری رُوح اپنے خالق و حاکم کو مخاطب کر کے چیخ اٹھی۔

اَللّٰھُمَّ اَسْلَمْتُ نَفْسِیْ اِلَیْکَ وَ
وَجَّھْتُ وَجْھِیْ اِلَیْکَ وَفَوَّضْتُ اَمْرِیْ
اِلَیْکَ وَاَلْجَأْتُ ظَھْرِیْ اِلَیْکَ رَغْبَةً
وَّرَھْبَةً اِلَیْکَ لَامَلْجَأَ وَلَامَنْجَأَ مِنْکَ
اِلَّا اِلَیْکَ [١]

اے اللہ میں نے اپنی جان تیرے سپرد کی اور اپنا
منہ تیری طرف کیا اپنے کام تیرے حوالے کیے
اپنی پیٹھ تیرے سامنے جھکائی تیرے فضل کی امید
میں اور تیری ناراضی سے ڈر کر، میری پناہ اور نجات
کا مرکز تو ہی ہے۔

اس اقرارِ ربوبیت کے ساتھ ہی تم نے اپنے قلب میں طمانیت و راحت محسوس کی، اعتماد و یقین نے خفتہ قوتوں کو جگایا، سارا عالم تمہیں نفع و ضرر سے خالی، تمہارے ساتھ تعاون عمل کے لیے تیار، تمہارا رفیق و خادم نظر آنے لگا! زندگی کے راستہ میں تمہارے قدم بیباک انداز میں اُٹھنے لگے، تمہارا سینہ کینہ سے پاک ہوگیا، کیونکہ تمہارا یہ وہم دور ہوگیا کہ سوائے حق تعالیٰ کے ضرر اور نقصان پہنچانے والا درحقیقت دوسرا کوئی ہوسکتا ہے، حواس کی آنکھ جس کو دشمنِ بے رحم دیکھ رہی تھی، ایمان کی آنکھ اس کو حق تعالیٰ کا فرستادہ بتلا رہی ہے اور سعدیؒ کے پُر اثر الفاظ میں کہہ رہی ہے

چوں دشمنِ بے رحم فرستادۂ اوست
بد عہدم اگر نہ دارم این دشمن دوست

اسی وقت غیظ و غضب سے بھی تمہارا نفس پاک ہوگیا، دوست پر غضب کیسا؟ اس یقین کے بعد کہ ہر آفت ہر مصیبت سیرت کے کسی نقص کو رفع کرنے آتی ہے، معلّم حقیقی کی طرف سے تنبیہ ہے جو ہمیں اپنے نقائص و ذمائم کی طرف متوجہ کرتی ہے، ان کی اصلاح کا موقع دیتی ہے، ہم کو ظلمت سے نکالتی اور نور کی طرف ہمارا رُخ پھیر دیتی ہے، حق تعالیٰ سے جوڑتی اور نفس و شیطان سے توڑتی ہے، ہاں پھر اس یقین و اذعان کے بعد ہمارا سینہ غیظ و غضب کا محل کیسے بن سکتا ہے؟

[١] یہ اس حدیث کے الفاظ ہیں جو صحاح ستہ میں موجود ہے۔ رواہ الجماعۃ عن البراء بن عازب، رسول اللہ سوتے وقت آخری چیز یہ پڑھتے تھے۔

ریا جو خلق کے لیے اپنے اعمال کی تزئین ہے، اسی وقت ممکن ہے، جب خلق کو نافع و ضار سمجھا جائے، خلق سے توقعات وابستہ ہوں، یا ضرر کا اندیشہ ہو، اس وہم کے دور ہو جانے کے ساتھ ہی ریاکاری اور تصنع و نمائش کی جڑیں کٹ جاتی ہیں، عمل صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے جاری ہو جاتا ہے، حور و قصور کے لیے نہیں رہتا، کیونکہ یہ بھی مخلوق ہیں، اور مخلوق سے نہ راحت ہے اور نہ سرور و عزت اور نہ یہ مقصود بالذات۔

کذب یا دروغ بافی کا محرک یا تو نفع کا حصول ہوتا ہے یا ضرر کے دفع کا خیال؛ یا پھر خود بینی و خودستائی، کبر و فخر، عجب و ریا، ہم نے اوپر دیکھا کہ ربوبیتِ حق ان صفاتِ ذمیمہ کا استیصال کس خوبی سے کر سکتی ہے، اسی لیے موحّد کا قلب صداقت کا خزینہ ہوتا ہے، وہ وعدوں کا پکا، قول کا سچا ہوتا ہے وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا[1] کا مصداق۔

اسی طرح غیبت شرک فی الربوبیت کا نتیجہ ہے، غیبت کی وجہ یا تو عداوت ہوتی ہے جس کا محرک نقصان و ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے، یا حسد یا محض کذب سے حاصل ہونے والی شیطانی لذت، ربوبیت کا صحیح علم اور اس پر یقین ان تمام ذمائم کی بے خطا دوا ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر ثابت کیا، غیر اللہ کو حقیقی نافع و ضار قرار دے کر عداوت و بغض و حسد میں مبتلا ہوں، اور غیبت نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے، خود آفریدہ التباس کو صحتِ علمی نے دفع کر دیا اور ان ذمائم کی گرفت سے قلب کو نجات ملی۔

غرض تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب یعنی سیرت سازی کے لیے سب سے پہلے شرک فی المعبودیت اور شرک فی الربوبیت کی بیخ کنی ضروری ہے، لا کی شمشیر سے مالکیت، حاکمیت اور ربوبیت ذواتِ خلق سے کاٹ دی جاتی ہے، اور الا سے اس کا اثبات ذاتِ حق میں کیا جاتا ہے، اور اس طرح اخلاقِ الٰہیہ سے آراستہ ہونے کی قابلیت اور استعداد پیدا کی جاتی ہے، اب مجاہدہ اور عمل اس مقصود کے حصول کے لیے ضروری ہیں اس کی توضیح

---

[1] پورا کرنے والے اپنے اقرار کو جب عہد کریں۔

میں چند مقامات کا پیشِ نظر رہنا لازمی ہے۔

ابتدا میں ہم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ علم ہی سے عمل پیدا ہوتا ہے لیکن علم سے مراد محض نظری علم نہیں لینا چاہیے، جو کانوں کی راہ سے داخل ہوتا ہے لیکن قلب میں جاگزین نہیں ہوتا، اس لیے عمل کی صورت میں نمایاں ہونے کی قوت نہیں رکھتا اور اس لیے منفعت بخش نہیں ہوتا[1]۔ علم سے مراد ہماری مراد وہ یقین و اذعان ہے جو قلب کی گہرائیوں میں اپنا مسکن بناتا ہے، خون کی طرح تمام رگوں میں دوڑتا ہے، دماغ پر کامل تسلط رکھتا ہے، اور لازماً عمل کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، ایسا یقین تفکر و تدبر یا مراقبہ سے پیدا ہوتا ہے، اسی لیے تفکر کو عبادت سے افضل قرار دیا گیا ہے[2]، تفکر و مراقبہ سے علم راسخ ہوتا ہے[3]، مضبوط ہوتا ہے، تلوین جاتی ہے، تمکین رونما ہوتی ہے اور راسخ عقیدہ ہی عملاً اپنا خارج میں ظہور کرتا ہے۔ جب عمل کی تکرار ہوتی ہے، تو عادت پیدا ہو جاتی ہے، جو فطرتِ ثانیہ کہلاتی ہے، اب عمل کے لیے فکر و غور کی ضرورت باقی نہیں رہتی، غیر شعوری نفس عمل کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے، مضائقت رفع ہو جاتی ہے، سہولت پیدا ہو جاتی ہے سیرت قائم ہو جاتی ہے، اسی لیے کہا گیا ہے ؏

چند روز جہد کن باقی بخند

اب ہمیں سیرت سازی کے دوسرے اہم عنصر مجاہدہ یا عمل و عادت کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

(۲) **مُجَاهِدَہ**: پاک سیرت جس طرح بغیر صحیح علم اور عقیدہ کے ممکن نہیں، اسی طرح بغیر عملِ صالح اور مجاہدہ کے اس کی تمام خوبیوں کا نمایاں ہونا بھی ممکن نہیں

---

[1] لیے علم سے استعاذہ کیا گیا ہے۔ اعوذ بک من علم لا ینفع و من قلب لا یخشع۔

[2] تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ سبعین سنۃ (الدیلمی و روی ابو الشیخ من حدیث ابو ہریرۃ)

[3] قل انما اعظکم بواحدۃ ان تقوموا للہ مثنیٰ و فرادیٰ ثم تتفکروا، (پ ۲۲۔ ع ۱۲) سے تفکر کا حکم صاف طور پر سمجھ میں آتا ہے۔

اسی لیے فرمایا گیا۔ جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ[1] اور صحیح عقیدہ مجاہد ہی کی چشمِ بصیرت فروز کے سامنے نیکیوں کی تمام راہیں کھول دیجاتی ہیں۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔[2] اب ہمیں مجاہدہ کی ماہیت اور اس کے طریقوں کو سمجھ لینا چاہیے۔

ذرا اپنے ذہن کے نہاں خانہ کو تو دیکھو کہ کیا یہ ایک لحظہ خیالات، تصورات، خواطر اور وساوس سے خالی بھی رہتا ہے؟ علم کا ایک دریا ہے کہ امڈا چلا آرہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک لامتناہی مبدا سے نکل رہا ہے، اس کی ماہیت و نوعیت پر غور کرو تو ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ یا تو ہدایتی علم ہے یا اضلالی۔ اس کی آمد کسی طریقہ سے روکی نہیں جا سکتی، کونسی قوت اس کو روک سکتی ہے؟ کسی خیال کو محض ارادہ کی قوت سے پیدا نہ ہونے دینا بشری طاقت سے باہر ہے، خیالات آزادی کے ساتھ ایک نامعلوم منبع سے ظہور کرتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان نہ ان کے پیدا کرنے پر قادر ہے اور نہ ان کے فنا کرنے پر! لیکن انسان کو اتنی طاقت دی گئی ہے کہ اپنی توجہ اضلالی علم کی طرف سے ہٹا کر ہدایتی علم کی طرف مبذول کر دے، یا نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ سلبی خیالات کو ایجابی خیالات میں بدل دے، یہی مجاہدہ کی ماہیت ہے، ذہن میں سلبی یا اضلالی خیال غیر اختیاری و اضطراری طور پر پیدا ہو رہا ہے، اب یہ میرے اختیار میں ہے کہ میں اس خیال کو گلے سے لگاؤں، پیار کروں، قلب کے میدان میں تخت پر بٹھا دوں، اور اس کو معزز مہمان کی طرح عزت و وقار سے بٹھا دوں، یا یہ کہ اس کے ذہن کے دروازہ سے سر نکالتے ہی اس کے مقابل ہدایتی یا ایجابی خیال کو اس کی سرکوبی کے لیے لے آؤں، اور نور کی قوت کو ظلمت کی طاقت سے لڑا دوں، ظاہر ہے کہ نور و ظلمت کے مقابلہ میں نور ہی کامیاب ہوگا، کیونکہ ظلمت نور ہی کے غیاب کا

---

[1] مجاہدہ کرو اللہ کے واسطے جیسا کہ چاہیے اس کے واسطے مجاہدہ کرنا (پ ۱۷ ع ۱۰)

[2] جنھوں نے ہمارے واسطے مجاہدہ کیا ہم ان کو اپنی راہیں سجھا دینگے (پ ۲۱ ع ۲)

تو نام ہے، نور ہی کے عدم سے ظلمت پیدا ہوتی ہے، جہاں نور ہو وہاں ظلمت کیسے چھا سکتی ہے! مجاہدہ حق تعالیٰ ہی کی حول وقوت سے اضلالی علم کے بجائے ہدایتی علم پر عمل کرنے کا نام ہے، اضلالی خیالات کے ذہن میں خطور کرتے ہی مجاہد کی روح "خیر کے مبدء" کی طرف استعانت کے لیے متوجہ ہو جاتی ہے، استعاذہ کرتی ہے، پناہ مانگتی ہے، اپنی محدود قوت پر بھروسہ نہیں کرتی اپنی بیچارگی سے واقف ہوتی ہے، لامتناہی قوت کے آستان پر تیزی کے ساتھ پہنچ جاتی ہے، اور چیخ اٹھتی ہے:-

"سبحان ذی الملك والملكوت سبحان ذی العزة والجبروت سبحان الحق

الذی لا یموت اعوذ بعفوك من عقابك واعوذ برضاك من سخطك و

اعوذ بك منك جل وجهك[1]"

اور یہ لامتناہی عزت وجبروت، یہ لامحدود ملک وملکوت والا آقا ہم سے دور نہیں، وہ جو بالذات ہے جہاں میں موجود ہر جگہ" ہمارے پاس ہی تو ہے، رگِ جان سے زیادہ قریب ہے، بلا از نزدیک تر، وہ الغیاث' کی اس پکار پر شانِ رحمت کے ساتھ متوجہ ہو جاتا ہے، اور اس کی تجلی کے ساتھ ہی قلب کے ضرر و اضلال سے پوری حفاظت ہو جاتی ہے! یا نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ سلبی خیال کی جگہ ایجابی خیال لے لیتا ہے، اور شر کا صدور ہی نہیں ہونے پاتا۔

نفسیات کے اس مسلّمہ قانون کو یاد کرو، جس پر اس مقالہ کی بنیاد قائم ہے، کہ افکار ہی سے اعمال کا صدور ہوتا ہے، اعمال ہی کی تکرار سے عادت کا قیام ممکن ہے، اور عادات کی تنظیم و ترتیب سے سیرت کی تشکیل ہوتی ہے، مجاہدہ سلبی یا بد یا اضلالی خیالات کا گویا دروازہ ہی پر مقابلہ ہے جوں ہی ان خیالات نے کتم عدم سے سر نکالا، ان کے مقابل کے ایجابی یا نیک یا ہدایتی خیالات نے ان سے ٹکر لی، اپنی محدود کمزور قوت سے ان کا مقابلہ نہیں کیا، بلکہ نامتناہی قوت وجبروت کے مبدئ سے اخذِ فیض کیا۔ اور اس طرح بے پناہ

---

[1] یہ اس حدیث کے الفاظ ہیں جس کو حاکم نے حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے۔

طاقت کے ساتھ ان پر ضرب لگادی اور ان کا قلع قمع کر دیا جب عمل ہی کا صدور اس طرح روک دیا گیا، اور ابتدا ہی میں روک دیا گیا، تو تکرار کی نوبت ہی کہاں، عادت کا قیام کس طرح ممکن اور سیرتِ بد کی تشکیل کا کیا ذکر، یاد رکھو کہ فاسد خیالات کو قوت اس وقت ملتی ہے جب وہ تخیل کے دروازے سے خانۂ قلب میں داخل ہو جاتے ہیں، اور یہ داخل اسی وقت ہو سکتے ہیں، جب دربانِ قلب غفلت کی نیند سو رہا ہو، چوکس نہ ہو، ہوشیار اور خبردار نہ ہو، یا پھر اپنی حول و قوت سے ان کا مقابلہ کرنا چاہے! اس صورت میں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا زور مرد افگن ہے، ان سے مقابلہ بچوں کا کھیل نہیں، یہ بڑے سے بڑے پہلوان کو آسانی سے پچھاڑ سکتے ہیں، ان کے داؤں پیچ سے بہادر سے بہادر بھی پناہ مانگتے ہیں، ان سے مقابلہ کی ایک ہی صورت ہے، ان کے ورود کے وقت ہی انہیں پچھاڑ اجائے، سنبھلنے کا موقع نہ دیا جائے اور حق تعالیٰ کے حول وقوت سے ان کا سامنا کیا جائے اَللّٰھُمَّ اَعِذْنِی مِنْ شَرِّ نَفْسِی[1] کی فریاد فوراً بلند ہو، اعوذ بک منک کی چیخ فوراً نکلے، پھر شکست ناممکن ہے، کامیابی قطعی ہے، حق تعالیٰ کی پناہ میں آکر مغلوبیت کیا معنی رکھتی ہے، ناکامی کیا چیز ہے، ان کی معیت کے ساتھ ہی بلندی نصیب ہوتی ہے اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ[2] کا وعدہ پورا ہو جاتا ہے۔

یہی نفسیاتی الہیاتی طریقہ بدعادات کی شکست میں بھی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے، بدعادت سے مراد کوئی عادت ہے، جو ہمارے اختیار و تصرف میں نہیں، بدعادت کی غلامی تباہ کن نتائج پیدا کرتی ہے، بدعادت کا غلام دنیا میں نہ کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ بر دِ قلبی اس کو نصیب ہو سکتی ہے، چونکہ افعال ہی کی تکرار سے عادت بنتی ہے، اور افعال کا محرک ہمیشہ خیال یا تصور ہوتا ہے، لہٰذا بدعادت کی شکست خیال کی تبدیلی پر

[1] اے اللہ میرے نفس کے شر سے مجھ کو پناہ دے۔

[2] تم ہی رہو گے غالب اور اللہ تمہارے ساتھ ہیں (پ ۲۶ ع ۸)

منحصر ہے، عادت کے قائم ہو جانے پر فعل کے ارتکاب کی ایک طبعی خواہش ہوتی ہے، لیکن ساتھ ہی اس خواہش کی تکمیل کا خیال پیدا ہوتا ہے، ممکن ہے کہ خواہش پر ہمارا قابو نہ ہو، لیکن خیال ہمارے تصرف میں آسکتا ہے، اگر خیال کا صحیح طریقہ سے مقابلہ کر لیا جائے تو خواہش بھی مغلوب ہو جاتی ہے، مثال کے طور پر شرابی کی حالت پر غور کرو۔ اس کو شراب کی خواہش ہوتی ہے اور یہ خواہش یہ خیال پیدا کرتی ہے کہ چل کر پینا چاہیے، خیال کا کامیابی سے مقابلہ کرنے پر خواہش کے اشتداد میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ کا مقابلہ دوسرے دفعہ کے مقابلہ کو آسان تر بناتا ہے، اور مجموعی نتیجہ حیرت خیز ہوتا ہے، یہی معنی ہیں اس قول کے کہ "خدا ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں"

بہر طور بُری عادتوں کے آہنی پنجہ سے رہائی اسی وقت ممکن ہے کہ خیال کے پیدا ہوتے ہی اس کا مقابلہ کیا جائے اور اسی طریقہ سے مقابلہ کیا جائے جس کا اوپر ذکر ہوا، اگر اس کے باوجود ہمیں ناکامی کی صورت دیکھنی پڑے، تو ہمیں مایوس اور نا اُمید نہیں ہونا چاہیے، مجاہد کے نزدیک یاس کفر ہے گناہ کے ارتکاب کے بعد یا عادتِ بد کا پھر ایک مرتبہ (باوجود عزم بلیغ کے کہ ایسا نہ ہوگا) شکار بننے کے بعد جو ندامت اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے، جو حزن و ملال کہ وہ محسوس کرتا ہے، وہ اس کے ارادوں کو مضبوط کرنے میں غیر محسوس طریقہ پر مفید ہوتے ہیں اور وہ وقت بہت جلد آپہنچتا ہے، جب وہ محض اسی طریقہ پر عمل پیرا ہو کر فاتحانہ شان سے اپنی خود ساختہ بیڑیوں کو توڑ کر ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاتا ہے، عارف رومی نے مجاہدہ کے اس اعتبار کو اپنے خاص انداز میں بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے؟

اندریں رہ می تراش و می خراش | تا دمِ آخر دمے فارغ مباش
تا دمِ آخر دمے آخر بود | کہ عنایت با تو صاحب سر بود
دوست دارد دوست ایں آشفتگی | کوششِ بیہودہ بہ از خفتگی!
کارکے کن تو و کاہل مباش | اندک اندک خاک چہ را می تراش

چوں زچاہے می کنی ہر روز خاک — عاقبت اندر رسی در آبِ پاک
چوں نشینی بر سرِ کوئے کسے! — عاقبت بینی تو ہم روئے کسے

بہرحال مجاہد ہمت سے کام لیتا ہے، حق تعالیٰ نے اس کو جو اختیار دے رکھا ہے، اس کو استعمال کرتا ہے، اور عزم راسخ رکھتا ہے کہ جب تک گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آئے قلب کا تزکیہ، روح کا تجلیہ نہ ہو جائے، وہ دم نہ لیگا، اور حقِ مجاہدہ ادا کریگا، ولولہ انگیز طریقہ سے ہر قدم پر وہ گنگناتا جاتا ہے۔

دست از طلب ندارم تا کارِ من برآید
یا تن رسد بجاناں یا جان ز تن برآید

کامیابی وفتحمندی اس مجاہد کے ہاتھ چومتی ہے کَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ کا وعدہ اس سے متعلق ہے! ہدایت کے راستے کھل جاتے ہیں لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا کا قول پورا ہوتا ہے۔

مجاہدہ بیوی بچوں کا چھوڑنا، راتوں میں کم سونا، فاقہ پر فاقہ کرنا، حقوقِ نفس کو تلف کرنے کا نام نہیں، مجاہدہ "حقوقِ نفس" کا ادا اور غیر شرعی "حظوظِ نفس" کا ترک کرنا ہے، مجاہدہ قلب کا تصفیہ ہے، روح کا تجلیہ ہے، اس کا بہترین طریقہ خیالاتِ فاسدہ کا دماغ سے تخلیہ ہے، جو شخص اپنے قلب و دماغ میں فاسد خیالات کے بجائے پاک خیالات کو سلبی افکار کے بجائے ایجابی افکار کو جگہ دیتا ہے، وہ اعمالِ سیئہ کا دروازہ بند کر دیتا ہے، اس کے لیے امتثالِ مامور، اجتنابِ محظور، اور رضا بہ مقدور آسان ہو جاتے ہیں، جو عارفِ اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے الفاظ میں دین کا خلاصہ ہیں[1]!

ایجابی خیالات میں سب سے زیادہ ایجابی خیال حق تعالیٰ کا خیال ہے، جو سرچشمہ ہیں تمام محامد و محاسن کا، تمام خوبیوں اور نیکیوں کا، جو مبدء ہیں طمانیت و سرور کا، علاوہ

---

[1] فتوح الغیب مقالۂ اول۔

بلندی کا، قوت وعزت کا، اگر تم اپنے قلب کو تمام سلبی خیالات سے خالی کر کے حق تعالیٰ کے خیال کو اس میں جمانے کی کوشش کروگے تو چند روز میں پاؤگے کہ یہ تمام صفات مقید پیمانہ میں تم میں خود ظاہر ہو رہی ہیں، نفسیات کا یہ عام قانون ہے کہ آدمی جس چیز کے خیال اور دھن میں رہتا ہے، رفتہ رفتہ اسی کی خو بو اس میں پیدا ہونے لگتی ہے، یا نفسیاتی زبان میں یوں کہو کہ اس کا جو معروضِ فکر ہوتا ہے وہی وہ بھی بن جاتا ہے! اس قانون کو جان کر اور مان کر تم ہرگز سلبی خیالات پر فکر و توجہ کو زیادہ مرکوز نہ کروگے، ایجابی خیالات ہی کو جمانے اور بسانے کی کوشش کروگے، اب ہم عارف روم کے الفاظ میں پوچھتے ہیں کہ حق تعالیٰ سے بہتر کوئی اور چیز ہو سکتی ہے، جس سے تم ایک لحظہ کے لیے حقیقی معنی میں خوش رہ سکتے ہو۔

کیست زو بہتر بگو اے ہیچ کس　　　تا بداں دلشاد باشی یک نفس؟

اگر تمہیں چشم بصیرت ملی ہے، اور تم عارف روم کے ساتھ اتفاق کرتے ہو تو پھر کیا حق تعالیٰ کی دھن سے بہتر اور کسی کی دھن ہو سکتی ہے؟ اب دن کا زیادہ حصہ اسی دھن میں گزارو، گفتار کو چھوڑ کر اسی کار بزرگ میں لگ جاؤ، رفتہ رفتہ جامی سامی نے جو کہا تھا، اس کا تم کو تحقق ہونے لگیگا۔

گر در دلِ تو گل گزرد گل باشی　　　در بلبلِ بے قرار بلبل باشی

تو جزوی و حق کل است اگر روزی چند　　　اندیشۂ کل پیشہ کنی کل باشی

جو چیز تم کو خود تجربہ سے معلوم ہو جائیگی اس کا ذکر ہم کیا کریں، لیکن تحریص کے لیے اتنا کہنا کافی ہے، کہ تم پر سرور اور فرح کے دروازے کھل جائیں گے، اطمینانِ قلب، جو دنیا کی کسی چیز سے حاصل نہیں ہو سکتا ہے وہ نقد دم ہوگا اور اس آیۂ کریمہ کا اپنی ذات کو مصداق پاؤگے۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي　　　اے وہ جی جس نے چین پکڑ لیا پھر چل اپنے

اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً فَادۡخُلِیۡ رب کی طرف تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی

فِیۡ عِبٰدِیۡ وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ ۔ پھر شامل ہو میرے بندوں میں اور داخل ہو میری

(پ ۳۰ ع ۱۴) بہشت میں۔

نفسِ مطمئنہ کا حصول، رضائے الٰہی کا تحقق، جنت ذات میں دخول، یہ نتائج ہیں اس مجاہدہ کی تکمیل کے! جو لذت کہ حق تعالیٰ کی یاد میں ہے، جو مستی اس کی یافت و شہود سے حاصل ہوتی ہے، اس کے مقابلہ میں "لذاتِ جہاں" ہیچ ہیں، جامی اس ذوق و مستی کو اس والہانہ انداز سے ادا فرماتے ہیں:۔

کلے بلبلِ جاں مست بیادِ تو مرا ۔ وے پایۂ غم پست بیادِ تو مرا

لذاتِ جہاں را ہمہ در پا فگند ۔ ذوقیکہ دہد دست بیادِ تو مرا

حق تعالیٰ کی یاد کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس کا ذکر زبان پر جاری رہے، فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ ذِکۡرًا کَثِیۡرًا ۔ پر عمل ہو، اٹھتے بیٹھتے یہی مشغلہ ہو، اس سے مقصود رضا، و قرب الٰہی ہو جب تمہاری توجہ ذکر کی وجہ سے خرافاتِ دنیوی سے ہٹ کر ایک نکتہ پر مرکوز ہو گی، تو خود بخود فاسد، سلبی، پریشان کن خیالات و وساوس کا دروازہ بند ہو جائیگا، اور جونہی خیالات کی یہ پراگندگی موقوف ہوئی ایک روحانی کیف و طمانیت سے تمہارا قلب مملو ہو جائیگا اَلَا بِذِکۡرِ اللّٰہِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ کے یہی معنی ہیں، ذکر کا قیام مشق اور مجاہدہ سے آہستہ آہستہ ہوتا جاتا ہے، اور ذہول و غفلت کا ارتفاع ہو جاتا ہے۔ اس دولت کے حاصل ہو جانے کے بعد تم تمام چیزوں سے غنی ہو جاتے ہو، نہ کسی چیز کے حصول سے تمہیں لذت ہوتی ہے اور نہ کسی چیز کے ضائع ہونے سے رنج! لِکَیۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ وَ لَا تَفۡرَحُوۡا بِمَاۤ اٰتٰکُمۡ کے مصداق ہونے لگتے ہو، اللہ کو رکھ کر تمہیں کسی چیز کی خواہش نہیں رہتی، تم عارفِ روم کے الفاظ میں کہنے لگتے ہو:۔

روزہا گر رفت گو رو باک نیست ۔ تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

یاد کے قائم کرنے کا ایک اور آسان گر ہم تمہیں بتلاتے ہیں، یہ تو تم مانتے ہو کہ ہر شئے کے خالق حق تعالیٰ ہیں، شئے ان کی مخلوق ہے، ہمارا رات دن سابقہ ان ہی اشیاء سے ہوتا ہے، یہی ہمارے دل اور دماغ میں بسی ہوئی ہیں، انہی کی محبت سے ہمارے قلوب بھرے ہوئے ہیں، چونکہ یہ فانی اور گریزپا ہیں، ان کا زوال اور ان کی فناپذیری ہمارے غم و حزن کا باعث ہوتی ہے، اب قانونِ ایتلاف ذہنی کی رو سے یہ ممکن ہے کہ مخلوق کو دیکھ کر خالق کی طرف ذہن منتقل ہو جائے، تم یہی کوشش کرتے رہو کہ شئے کو دیکھ کر تمہارا خیال شئے کے خالق کی طرف جائے، اس طرح تمہیں ہر طرف حق تعالیٰ ہی کا جلوہ نظر آئیگا، اور اینما تولوا فثم وجہ اللہ کے معنی کا ابتدائی فہم حاصل ہونے لگے گا۔ شئی کی سلبی جہت سے توجہ ہٹ کر جہتِ حق کی طرف مرکوز ہو جائیگی۔ اور اس طرح یاد قائم ہونے لگیگی، تمہارا معروضِ فکر اب شئے نہیں حق ہوگا، اور ان تمام انوار سے تمہارا قلب معمور ہونے لگیگا جو وجہ اللہ کی طرف رخ کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔

اس طریقہ سے تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائیگا کہ سعادت و مسرت کا سرچشمہ خود ہمارا قلب ہے، حق تعالیٰ کی جلوہ گاہ خود ہمارا قلب ہے، آفاق میں حق تعالیٰ ظاہر ہیں ہر شئے کے ساتھ جہتِ حق موجود ہے، صحیح علم کے استعمال سے وہم اور التباس دور ہوا اور نظر کی اصلاح ہوئی، نقطۂ نظر بدلا، معلوم ہوا کہ انفس و آفاق میں حق تعالیٰ نہاں و عیاں ہیں، انہی سے تعلق قائم کرنا، انہی کی یاد کا جمانا تمام مسرتوں اور سعادتوں کا حاصل کرنا ہے، ان سے غفلت اور ذہول اور خلق میں استغراق اور فنائیت تمام بلاؤں اور آفتوں میں گرفتار ہونا ہے مَن یُعرِض عَن ذِکرِ رَبِّہٖ یَسلُکہُ عَذَابًا صَعَدًا جو کوئی اپنے رب کی یاد سے منہ موڑتا ہے، چڑھتے عذاب میں ڈال دیا جاتا ہی رپ ۲۹ ع ۱۱)

اسی مفہوم کو رومی کے دلنشین الفاظ میں یاد رکھو:۔

گر گریزی بر امید راحتے	ہم ازانجا پیشت آید آفتے

ہیچ کنجے بے دد وبے دام نیست　　　جز بخلوت گاہِ حق آرام نیست

حق تعالیٰ کو چھوڑ کر خلق میں محویت، خواہ بظاہر وہ کیسی ہی دلفریب اور دل کش نظر کیوں نہ آئے نور کو چھوڑ کر ظلمت میں گرفتار ہونا ہے، اور ظلمت سے ضیق، غم وحزن و خوف کے سوا اور کیا حاصل ہوتا ہے، ظلمت میں چیزیں اپنے صحیح خد وخال میں کہاں نظر آتی ہیں، کسی شے کا حسن وجمال تاریکی میں کیا دکھائی دیگا! پھر تمہاری نظر میں اشیا کی یہ دلفریبی تمہارے نفس کا دھوکہ ہے، التباس ہے، تمہارا واہمہ بھی تو خلاق ہے کیسی کیسی دلربا صورتیں یہ تمہاری خوشی کے لیے پیدا کرتا ہے، ان سے تمہیں بھی لذت حاصل ہوتی ہے، تھوڑی ہی دیر بعد غم کا سایہ تمہارے قلب پر چھا جاتا ہے، ابھی اعتماد ہوتا ہے ذرا دیر بعد خوف کا زبردست حملہ ہوتا ہے، اور تم کانپ اُٹھتے ہو، تمہاری طبیعت میں استقلال نہیں، استحکام نہیں، تمہاری کوئی پناہ گاہ نہیں! اگر تم اپنی غفلت سے جاگ اُٹھو، اگر تمہاری چشمِ بصیرت کھل جائے، اور نور اور صداقت کی دنیا نظر آنے لگے، تو تمہیں اشیاء ویسی ہی دکھائی دینے لگینگی جیسی کہ وہ ہیں، اب تم کو حیاتِ طیبہ نصیب ہوگی۔ طمانیت وبردِ قلبی حاصل ہوگی، خوف وحزن زائل ہو جائیگا، استقلال واستحکام عطا ہوگا، اور حق تعالیٰ کے اس وعدہ کا ایفاء ہوگا:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (پ ۱۴ ع ۱۹)　　جس نے نیک کام کیا، مرد ہو یا عورت، اور وہ ایمان پر ہے تو ہم اس کو زندگی دینگے ایک اچھی زندگی

یادِ حق کو قائم کرنے، تمہارا رخ ظلمت سے نور کی طرف پھیرنے، مجاہدہ کے راستہ کو آسان کرنے، خلق سے توڑنے اور حق سے جوڑنے میں نیکوں کی صحبت عجیب وغریب اثر رکھتی ہے صحبت کا اثر نفسیات کا ایک مسلّمہ اصول [1] ہے، ہر فرد میں بے سوچے سمجھے ہر قسم کے قضایا کو قبول کرنے

[1] ومثل جليس الصالح كمثل صاحب المسك ان لم يصبك منه شئ اصابك من ريحه ومثل جليس السوء كمثل صاحب الكير ان لم يصبك من سواده اصابك من دخانه (ابو داؤد ونسائی عن انس رض)

نیک ہم نشین کی مثال مشک والے کی سی ہو اگر تجھے اس سے کچھ نہ ملے تو خوشبو تو ضرور پہنچیگی اور بُرے ہمنشین کی مثال لوہار کی بھٹی کی سی ہے، اگر اس کی سیاہی تجھ کو نہ لگے تو دھواں تو ضرور پہنچیگا۔

کی استعداد یا صلاحیت پائی جاتی ہے، جب یہ قضایا خود اپنے ذہن کے اندر سے وصول ہوتے ہیں، تو اس کو جدید نفسیات کی اصطلاح میں "خود ایعازی" (AUTO SUGGESTION) کہا جاتا ہے۔ اور جب کسی خارجی ذریعہ سے حاصل ہوں تو "غیر ایعازی" (HETERO-SUGGSTION) کہا جاتا ہے، رات دن ہم خود ایعازی اور غیر ایعازی کے اثر کے تحت خیالات کو قبول کر رہے ہیں، اور ان کو جزوِ ذہن بنا رہے ہیں، اگر سلبی یا اضلالی افکار غیر ایعازی قوت کی وجہ سے ہمارے قلب میں جگہ پا رہے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم بُری صحبت میں ہیں، اور ان کے تیقنات وافعال کی نقل کر رہے ہیں، اور اضطراری طور پر ان سے متاثر ہو رہے ہیں، ان کے سمّی اثرات سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم صحبتِ ناجنس سے قطعی احتراز کریں ۔

زاحمقاں بگریز چوں عیسیٰ گریخت

صحبتِ احمق بسے خونہا بریخت

سلبی اثرات سے اس طرح بچ کر ایجابی اور ہدایتی علم کے لیے نیکوں کی صحبت کی تلاش کرنی چاہیئے، اہل اللہ کی زبان سے حاصل کیا ہوا علم اپنے اندر خاص اثر و قوت رکھتا ہے، وہ قلب کی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے، یقین و اذعان کی شکل اختیار کر لیتا ہے، علمِ حق کو شیخ اکبر محی الدین عربیؒ نے علم "اذواق" قرار دیا ہے، اور فرماتے ہیں کہ علم الحق علم الاذواق لاعن الاوراق وھو العلم الصحیح وما عداہ تخرّص وتخمین لیس العلم اصلاً یعنی علمِ حق ذوق و وجدان سے حاصل شدہ علم ہے، محض کتابوں سے حاصل کردہ نہیں، اور یہی علمِ صحیح ہے، باقی اٹکل پچو مطلق علم نہیں، شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل اللہ کا علم قیاسی نہیں، مبدء نبوت سے اخذ کردہ ہے، قطعی و یقینی ہے، حقیقی و واقعی ہے، اس کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے سے حق تعالیٰ خود ان کے معلم ہو گئے ہیں، اور اب وہ براہِ راست اسی مبدء سے علم حاصل کرنے لگتے ہیں، اِتَّقُوا اللّٰہَ وَیُعَلِّمُکُمُ اللّٰہُ [1] ۔ اس پر دلیل ہے، اسی لیے ایک

[1] اللہ سے ڈرو وہ تمہیں علم دیتے ہیں۔

دوسرے رازداں کی نصیحت ہے کہ خذ العلم بافواہ رجال اللہ، لا من الصحائف و الدفاتر
مردانِ حق کی زبان سے علم حاصل کرو، کتابوں اور دفتروں سے نہیں، کیونکہ ان کتابوں
میں قیاس و تخمین اور ظن و رائے کے سوا کیا رکھا ہے، اہل اللہ کی صحبت خاک کو کیمیا کرتی
ہے، ان کے افعال و اعمال ان کے افکار و خیالات رفتہ رفتہ قلوب کے زنگ کو دھوتے
جاتے ہیں اور تم غیر شعوری طور پر نیکی کی طرف مائل ہوتے جاتے ہو، اور بدی سے مجتنب
اور محترز، او ربالآخر ظلمت سے نکل کر نور کی طرف تمہارا منہ ہو جاتا ہے، عارفِ روم نے
صحبتِ مردانِ حق کے اثرات کو یوں بیان فرمایا ہے۔

خواہی کہ دریں زمانہ فردے گردی ۔۔۔ یا در رہ دیں صاحبِ دردے گردی
ایں را بجز از صحبتِ مرداں مطلب ۔۔۔ مردے گردی چو گردِ مردے گردی

یہ کُونُوا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ کے حکم کے پنہاں فائدوں کی اجمالی توضیح ہے۔

سیرت سازی کے قرآنی اصول کی اوپر جو توضیح پیش کی گئی، اس کو اجمالاً ایک دفعہ
پھر دہرا لیجیے اذا تکرر تقرر، تکرار سے چیزیں زیادہ دلنشین ہوتی ہیں، سیرت کی عمارت کا
سنگ زاویہ لا الٰہ الا اللہ پر پختہ یقین و اذعان ہے، تمام انبیاء کا اپنی قوم کو یہی پیغام تھا
کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ، اے قوم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا
تمہارا کوئی معبود و رب نہیں، اللہ ہی لائقِ عبادت ہیں استعانت انہی سے کی جانی چاہیے
میرا سر انہی کے سامنے جھک سکتا ہے، غیر کے سامنے نہیں اس بنیادی عقیدہ کا زبان
سے اظہار اور قلب سے اقرار ضروری ہے، زبان سے بار بار کی تکرار یقین کو پختہ کرتی ہے
جس قدر یقین میں پختگی ہو گی اسی قدر عمل میں سہولت ہو گی، یقین میں شدت پیدا کرنے کے لیے
غور و فکر، تدبر و مراقبہ ضروری ہیں، یقین اس شدت کا پیدا ہو جائے کہ شک و شبہ کی
مطلقاً گنجائش نہ رہے، تم جانتے ہو کہ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے تمہارا ہاتھ جل جائیگا اسی
طرح تمہیں توحید فی المعبودیت و توحید فی المربوبیت کا یقین ہو جانا چاہیے، ذلت (جو عبادت

کی اصل ہے حق تعالیٰ ہی کے سامنے اس کا ظہور ہو سکتا ہے، جو ہمارے مالک ہیں حاکم ہیں، مولیٰ ہیں، خالق ہیں، رب ہیں، وکیل و نصیر ہیں، حق تعالیٰ ہی نافع و ضار ہیں، مُعِز و مُذِل ہیں، حاجت و مراد سوا ان کے کوئی پوری نہیں کر سکتا، اسی لیے انہی کے سامنے دستِ سوال دراز ہو سکتا ہے، کسی اور کے سامنے ہرگز نہیں، زبان پر یہ دعا جاری رہے اور قلب میں اس کا مفہوم متمکن۔

اللّٰھم کما صننت وُجُوھنا ان تسجد لغیرك فصن ایدینا ان تمتد بالسوال لغیرك۔ الٰہی جس طرح تو نے ہمارے چہروں کو غیر کے آگے سجدہ کرنے سے بچا لیا، اسی طرح ہمارے ہاتھوں کو اپنے غیر کے آگے سوال کرنے سے بچائے رکھ۔

اس عقیدہ اور یقین کا شخص اپنے ہم جنسوں کے آگے کیسے خود کو ذلیل کر سکتا ہے، اس کی سیرت غلاموں کی سی کیسے ہو سکتی ہے، وہ نفع و ضرر کی توقع غیر اللہ سے کب رکھ سکتا ہے، اور اپنی عزت اس وہمی نفع و نقصان کی خاطر کیسے بیچ سکتا ہے، مجاہد اسی یقین اساسی کو پختہ کرتا ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ خواطر کی نگہبانی کی جائے، سلبی اور اضلالی علم کو ایجابی و ہدایتی علم سے بدلا جائے قانون تقطیب افکار (Law of the Polarisation of thought) نفسیات کا ایک مسلّمہ قانون ہے، اسی قانون کے استعمال سے اضلالی علم ہدایتی علم میں مبدل کیا جاتا ہے، نہ صرف یہ بلکہ ایجابی خیالات ہدایتی افکار کو ذہن میں ہمیشہ جمانے کی کوشش کرنی چاہیے، اور سب سے زیادہ ایجابی خیال حق تعالیٰ کا خیال ہے، جب یہ قلب پر چھا جاتا ہے، تو قلب تمام ظلمتوں سے پاک ہو جاتا ہے، نورانی ہو جاتا ہے، نور ہو جاتا ہے، اللّٰھم اجعل فی نفسی نورًا اللّٰھم اجعلنی نورًا کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ سرور و طمانیت ہے، مسرت و سعادت ہے جو پاک سیرت کی لازمی خصوصیت ہے، نیک سیرت شخص مسرور و مطمئن ہوتا ہے، اس کی جان اس کا تن راحت میں ہوتا ہے، وہ فطرۃً نور ہوتا ہے، یہ روحانی مسرت ہے، جو طبعی غم و حزن میں باقی رہ سکتی ہے۔ اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا

يَتَّقُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۔ (پ ۱۱ ع ۱۱)

قوتِ ایمانیہ و ظہورِ غیب

چشم بگذشتہ ازیں محسوسہا یافتہ از غیب بینی بوسہا

خود نمی یابم یکے گوشے کہ من نکتہ گویم ازانِ چشمِ حسن

مدتوں ہم اس خیال میں رہتے ہیں کہ ہمیں "صداقت" کا علم ہے، لیکن یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا، کہ کیوں صداقت کے وہ آثار ہماری زندگی میں نمایاں نہیں ہوتے جن کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے الفوز فِی القضا امورِ تکوینی میں کامیابی و کامرانی نزل الشہداء، ایسی اعلیٰ قسم کی میزبانی جیسی کہ شہیدوں کی جنت میں ہوگی، عیش السُّعداء، سعیدوں کا سا عیش، النصر علی الاعداء، دشمنوں پر فتح کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے؟ کیوں رحمت کے وہ آثار ظاہر نہیں آتے، جن سے ہمارے دل کو ہدایت ہو (تھدی بھا قلبی) ہمارے کاموں میں جمعیت ہو (تجمع بھا امری) ہماری ابتری دور ہو، اور ہماری ساری پریشانیاں سلجھ جائیں (تلم بھا شعثی) ہمارا دین سنور جائے (تصلح بھا دینی) ہمارا قرض ادا ہو جائے (تقضی بھا دینی) ہماری نظر سے غائب چیزوں کی نگہبانی ہو (تحفظ بھا غائبی) ہمارے پیش نظر چیزوں کو بلندی عطا ہو (ترفع بھا شاھدی) ہمارا چہرہ نورانی ہو جائے (تبیض بھا وجھی) ہمارا عمل پاکیزہ ہو جائے (تزکی بھا عملی) رشد و ہدایت کا ہمارے قلب میں الہام ہو (تلھمنی بھا رشدی) حق تعالیٰ کے ساتھ ہمارے فطری جذباتِ الفت از سر نو پیدا ہو جائیں (ترد بھا الفتی) اور ہر برائی سے بچے رہیں (تعصمنی بھا من کل سوء)

شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا علم یقین صادق کے درجہ کا نہیں، یا پختہ یقین نہیں، اور وہ ایمان ہمیں حاصل نہیں جو ہمارے دل میں پیوست ہو گیا ہو، جس کے مانگنے کی ہدایت ان الفاظ میں

کی گئی ہے :-

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ اِیْمَانًا یُّبَاشِرُ قَلْبِیْ ۔ اے اللہ میں تجھ سے وہ ایمان مانگتا ہوں جو میرے دل
وَیَقِیْنًا صَادِقًا الخ ۔ میں پیوست ہو جائے اور پختہ یقین الخ

ہمیں علم و یقین کی وہ کیفیت حاصل نہیں، جس کے پیدا ہو جانے کے بعد حضرت مسیح کے الفاظ میں حریتِ تامہ حاصل ہو جاتی ہے ۔

ہم میں سے اکثر ایک ایسے سادہ طریقہ کی تلاش میں اپنی مختصر زندگی کے دن گزار دیتے ہیں، جس کا حصول اور جس پر مداومت ہمیں ایمان کے ان آثار و برکات سے مالا مال کر دے، جن کا اوپر ذکر ہوا، ہمیں ایک ایسی چیز کی تمنا ہے، جو ایمان کو ہمارے قلوب میں پیوست کر دے، وہ پختہ یقین عطا کرے جس سے ایک بڑی تعداد محروم ہے، اور جس کے حاصل ہو جانے کے بعد ہماری ساری پریشانیاں سلجھ جائیں، ہمارا چہرہ نورانی ہو جائے اور ہمارا عمل پاکیزہ ہو جائے، اور تمام امور میں کامرانی و کامیابی نصیب ہو !

یقیناً ایک ایسا سادہ طریقہ موجود ہے، اور وہ اتنا سادہ اور سیدھا طریقہ ہے کہ اکثر تو اس کو جان کر بھی اس پر عمل کرنا نہیں چاہتے! بعض کا تو یہ عقیدہ ہے کہ زندگی میں پریشانیوں سے نجات اور جمعیتِ خاطر کا حصول ناممکن ہے! ان کا خیال ہے کہ :-

آدم از کثرتِ پریشانی ۔ می کند جستجوئے جمعیت
آدم آمد سہ حرف و ہر سہ جدا ۔ نشود جمع تا دمِ میت

بعض کا خیال ہے کہ یہ طریقہ پایا تو جاتا ہے، لیکن وہ ایک رازِ نہفتہ ہے، اس تک ان کی رسائی ممکن نہیں، وہ رازِ سینہ ہے، سفینہ پر نہیں ملتا، اور اس راز کے جاننے والے کالمعدوم ہیں، بعض سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ سخت مشکل ہے، اس پر عمل ناممکن ہے! یہ ہر شخص کے بس کی چیز نہیں الفاظ یا تعبیرات کی کثرت نے اس کو چھپا رکھا ہے اور دلائل کی کثرت نے اس کا ادراک مشکل کر دیا ہے۔

از دلائل می شود مشکل بما ادراکِ حق !! ۔ ایں رہ از بسیاریِ سنگِ نشاں ہموار نیست !

حقیقت یہ ہے کہ یہ طریقہ موجود ہے اور وہ اتنا سادہ ہے کہ بچے بھی اس کو سمجھ سکتے ہیں، بوڑھی خواتین بھی سمجھ سکتی ہیں! الہامی صداقتوں کو سمجھنے کے لیے ہمیں بچوں کی طرح سلیم فطرت بن جانا چاہیے، اسی وقت ہم میں وہ شعور پیدا ہوتا ہے، جس کی بیداری کے بعد ہمیں کامل حریت نصیب ہوتی ہے! یہ طریقہ مختصر الفاظ میں یہ ہے :-

۱- ہمیں حق تعالیٰ کی ان ظاہری و باطنی نعمتوں اور عنایتوں کو یاد کرنا چاہیے، جو ہماری پچھلی زندگی میں ہم پر کی گئیں اور ان پر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے

۲- ہمیں حق تعالیٰ کی ان آئندہ نعمتوں اور عنایتوں کا شکر ادا کرنا چاہیے جن کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے!

اس اجمال کی تفصیل ضروری ہے :-

۱- ایمان ان اشیاء کا جوہر ہے جن کی ہم حق تعالیٰ سے امید رکھتے ہیں، اور ان اشیاء کے وجود پر گواہی ہے جن کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے، حق تعالیٰ پر ایمان، ان سے حُسنِ ظن، ان سے اُنس و محبت مومن کا طرۂ امتیاز ہے: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ اس ایمان حُسنِ ظن، انس و محبت ہی سے وہ تمام نعمتیں جو ابھی پردۂ غیب میں ہیں، خارج میں ظاہر ہوتی ہیں، یہ وہ پل ہیں جن سے گزر کر حق تعالیٰ کی نعمتیں مومن تک پہنچتی ہیں، اس راز کو عارف رومی نے یوں فاش کیا ہے :-

آں کہ شد انسش بشاہِ فرد خویش ۔۔۔ یافت در ماہائے جملہ در دِ خویش

ایمان اور اُنس مسلسل شکر و حمد سے قوی ہوتا ہے، جب ہمارے قلب میں ان نعمتوں، راحتوں عنایتوں اور احسانوں کا احساس موجود ہوتا ہے، جو حق تعالیٰ نے ہم پر ہماری پچھلی زندگی میں کی ہیں، ہم اس احساس کو تازہ کرکے ان نعمتوں کی جزئیات و تفصیلات پر نظر کرکے چیخ اٹھتے ہیں :

بے لطفِ تو من قرار نتوانم کرد ۔۔۔ احسان ترا شمار نتوانم کرد
گر بر تنِ من زباں شود ہر موئے ۔۔۔ یک شکرِ تو از ہزار نتوانم کرد

(ابو سعید مہنہ ؒ)

بجائے پچھلی زندگی کی مصیبتوں اور بلاؤں پر شعور کو مرکوز کرنے کے ہمیں یاد کرنا چاہیے کہ کس طرح حق تعالیٰ نے پچھلے زمانہ میں ہمیں خوف و حزن سے نجات بخشی، غم و مصیبت سے آزادی مرحمت فرمائی، مرض والم سے شفا عطا کی! ہمیں ان موقعوں کو یاد کرنا چاہیے، جن میں حق تعالیٰ کی کارسازی و بندہ نوازی نے ہماری جان کو آرام بخشا اور ضیق و پریشانی سے نجات دی، غم و مصیبت کی بے پناہ قوتوں نے ہمارے ضعیف جسم کو تباہ کرنا چاہا تھا، اور شر کی تباہ کن طاقتوں نے ہماری روح کے شیرازہ کو منتشر کرنا چاہا تھا، لیکن حق تعالیٰ کے کرم نے ہماری حفاظت کی، ان کے احسان نے ہمیں تباہی سے بچالیا!

کجا لبِ صدف و شکرِ ابرِ نیساں ست! کہ از شمار بروں قطرہ ہائے باراں ست! (حافظ)

ہاں ہم اپنے احسان مند قلب کی گہرائیوں سے حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ یہ سب کام اللہ تعالیٰ ہی کے تھے، ہماری حول و قوت کو اس میں کچھ دخل نہ تھا، لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ! جب ہم شکست خوردہ دل سوختہ تھے ان کی ربوبیت نے ہماری دستگیری فرمائی، جب ہم برگشتہ و پریشان تھے ان کی رحمت نے ہمیں راہ دکھائی! جب ہم غلط راہ پر پڑ لیے تھے، ان کی حکمت نے ہدایت کی طرف ہماری رہبری کی، جب ہم غم و مصیبت، خوف و حزن میں مبتلا تھے، اُن کے فضلِ عمیم نے ہمیں سنبھالا!

اے خدا قربانِ احسانت شوم این چہ احسان است قربانت شوم!

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کَمَا یَنْبَغِیْ لِجَلَالِ وَجْھِکَ وَعَظِیْمِ سُلْطَانِکَ!

ہر روز کچھ دیر کے لیے ہمیں اپنی گزشتہ زندگی کے ان تجربوں کو تازہ کرنا چاہیے، جب کہ حق تعالیٰ نے ہماری خاص طور پر مدد فرمائی، اور ہمارے لیے نجات کا سامان فراہم کیا، ہم میں سے ہر ایک کی زندگی میں ایسے تجربات و واقعات ضرور گزرے ہیں جن کی یاد ہم تازہ کر سکتے ہیں، ہمیں انہیں یاد کرنا چاہیے ان پر حق تعالیٰ کا بہت بہت شکر ادا کرنا چاہیے! عارف حق شناس ہوتا ہے، غیر عارف ناسپاس!

عارف آں باشد کہ باشد حق شناس ہر کہ عارف نیست گردد ناسپاس (عطار)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کے احسانات کا یوں شکر ادا کیا ہے:-

اللّٰھُمَّ لَکَ الحمدُ بما ھدیتنا	تیرے ہی لیے حمد ہے اس پر کہ تو نے ہمیں ہدایت دی اور
ولک الحمدُ بما اکرمتنا ولک	تیرے ہی لیے حمد ہے اس پر کہ تو نے ہمیں عزت دی اور تیرے
الحمد بما سترتنا ولک الحمد	ہی لیے حمد ہے کہ تو نے ہماری ستر پوشی کی، اور تیرے ہی لیے
بالقراٰن ولک الحمد بالاھلِ	حمد ہے قرآن پر، اور تیرے ہی لیے حمد ہے اہل و مال پر اور تیرے ہی
والمال ولک الحمد بالمعافاۃ	لیے حمد ہے درگزر کرنے پر، اور تیرے ہی لیے حمد ہے یہاں
ولک الحمد حتیٰ ترضیٰ و	تک کہ تو خوش ہو جائے، اور تیرے ہی لیے حمد ہے جب
لک الحمد اذا رضیت	کہ تو خوش ہو جائے اے وہ جس کی ذات سے ڈرنا چاہیے
یا اھل التقویٰ و اھل	(ڈرنے کے قابل بس تیری ہی ایک ذات ہے) اے وہ کہ تو
المغفرۃ!	ہی مغفرت کرسکتا ہے۔

ان ہی انعامات پر جو ہماری پچھلی زندگی میں حق تعالیٰ نے ہم پر کیے ہیں ہمیں حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

نحمد اللہ خالق الاشیاء   نشکر اللہ رازق الاحیاء (مظہر الحق)

یاد رکھو ایسا کرنے سے ہمارا ایمان مضبوط ہوتا ہے، ہمارا قلب یقین کے نور سے لبریز ہو جاتا ہے اور ہم حق الیقین کے طور پر جاننے لگتے ہیں کہ حق تعالیٰ ہر حال میں ہمارے لیے کافی ہیں، ہمارے قلب کی گہرائیوں سے یہ چیخ نکلتی ہے۔

اللہ الکافی، کافی: قصدت الکافی وجدت الکافی

لکل کافٍ کافی کفانی الکافی ونعم الکافی وللہ الحمد!

ہمارا خوف دور ہو جاتا ہے، اُمیدیں جاگ اُٹھتی ہیں، نورِ یقین ہمارے قلب کی تاریکی کو دور کر دیتا ہے اور ہم حق تعالیٰ کے قُرب و معیت کی روشنی میں داخل ہو جاتے ہیں، اور ہمیں وہ شاندار آزادی حاصل ہوتی ہے جو مقربینِ بارگاہِ الٰہی کا حصہ ہے، وہ فرحت و سرور نصیب ہوتا ہے جس کو عیش السعداء

سے تعبیر کیا گیا ہے! اور اسی سرور کی حالت میں ہم بیدل کی زبان میں گنگنانے لگتے ہیں:

تا مزرعِ سبز آسماں خواہد بود　　تا خرمی باغِ جہاں خواہد بود
ہر تخم کہ ریشہ بروں خواہد بود　　شکرِ کرم ترا زباں خواہد بود

حق تعالیٰ کے ان گذشتہ احسانات کا حمد و شکر کے ساتھ یاد کرنا وہ طریقہ ہے جس کو ہر زمانہ کے صلحاء و صدیقین نے اپنے ایمان کی قوت کے ازدیاد کے لیے ہمیشہ استعمال کیا ہے، اور اس حد تک کیا ہے کہ اُن سے عجیب و غریب کرامات و خوارق عادات کا ظہور ہوا ہے، ان کی کامیابی کا یہی ایک راز تھا، اسی طریقہ نے قوتِ الٰہیہ کے دروازوں کو ان پر کھول دیا تھا، ان کو حق تعالیٰ کے قریب کر دیا تھا، اور حق تعالیٰ کو اُن سے قریب، اس کی وجہ سے اُن کے لیے ایسی چیزیں ممکن ہو گئی تھیں جو عام طور پر انسان کے لیے ممکن نہیں ہوتیں۔

دیکھو جب حضرت دانیال علیہ السلام کو بخت نصر نے ایک اندھے کنویں میں دو شیروں کے ساتھ قید کر دیا تھا تو انہوں نے کہا جاتا ہے کہ یہ دعا کی تھی:۔

الحمدُ لِلّٰہِ الّذی لا یخیب من دعاہٗ والحمدُ لِلّٰہِ الّذی لا یکل من توکّل علیہ الحمد لِلّٰہِ الّذی ھو ثقتنا حین تنقطع عنا الحیل الحمدُ لِلّٰہِ الّذی ھو رجائنا حین یسود قلوبنا باعمالنا الحمدُ للّٰہ الّذی یکشف ضرّنا عند کربتنا، الحمد للّٰہِ الّذی یجزی بالاحسان احسانًا، الحمد للّٰہ الّذی یجزی بالصبر نجاتًا، (رواہ ابن ابی الدنیا وسندہ حسن)

حمد اس خدا کی ہے جو اپنے مانگنے والے کو محروم نہیں کرتا، حمد اس خدا کی ہے جو اس شخص سے نہیں تھکتا جو اس پر بھروسہ کرے، حمد اس خدا کی ہے جو ہمارا آسرا ہے جب ہماری تدبیریں منقطع ہو جاتی ہیں، حمد اس خدا کی ہے جو ہماری تکلیف کے وقت ہماری مصیبت کو دور کرتا ہے حمد اس خدا کی ہے جو احسان کا بدلہ احسان سے دیتا ہے، حمد اس خدا کی ہے جو صبر کا بدلہ نجات و رستگاری سے دیتا ہے!

یہ ساری دعا حق تعالیٰ کی حمد و ثنا سے بھری ہوئی ہے، اس کا ہر جملہ ان تجربوں کو حافظہ میں تازہ کرتا ہے

جب کہ حق تعالیٰ کی خاص تائید ہمیں ہوئی تھی اور طوفانِ حوادث سے ہماری کشتی نکل آئی تھی اور ہماری زبان سے بے اختیار یہ جملے نکلے تھے۔

اللّٰھم لک الحمد شکراً ولک	اے اللہ تیرے ہی لیے ہر تعریف ہے، شکر کے ساتھ اور تیرا ہی
المنّ فضلاً وانت ربنا حقاً	حصہ ہے، فضل و کرم کے ساتھ، بیشک تو ہمارا رب ہے، پالن ہے
ونحن عبیدک رقاً۔	ہے اور ہم تیرے بندے ہیں، ناتوان و محتاج۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے مقابلہ کو چلے اور جب حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حنین کی لڑائی کے لیے نکلے، تو ان کی زبان پر حق تعالیٰ کی حمد و ثنا ہی جاری تھی۔

کنت وتکون وانت حیّ لایموت	تو ہے اور رہیگا، تو ایسا زندہ ہے جس کو موت نہیں!
تنام العیونُ وتکدر النجوم وانت	آنکھیں سوتی ہیں اور ستارے بدلتے ہیں، تو زندہ اور
حیٌّ قیوم لاتاخذک سنۃ ولا	زندہ رکھنے والا ہے، تجھ کو اونگھ اور نیند نہیں چھو سکتی!
نومٌ یاحیّ یاقیّوم!	یا حیّ یا قیّوم!

یاد رکھو کہ حق تعالیٰ کی رحمت و رافت جو ہماری پچھلی زندگی میں ہمارے ساتھ رہی، وہ اب بھی ہم پر محیط ہے، وہی قوت جو گزشتہ زمانہ میں ہماری دستگیری کرتی رہی ہے، اب بھی ہماری مدد کر رہی ہے، وہی فضل عمیم جس نے اب تک ہمیں سنبھالا ہے، اب بھی ہمیں سنبھال رہا ہے۔

حق تعالیٰ اب بھی وہی ہیں، ان میں تغیر نہیں، وہ تغیر سے منزہ و ماوراء ہیں، یہ امر واقعی کہ انھوں نے ہمیں گزشتہ زندگی میں بلاد غم سے نجات دی ہے، اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ وہ اپنے ہی عدم تغیر و عدم بعفر کی وجہ سے ہمیں ہرگز فراموش نہ کرینگے!

سعدیؒ اسی طریقہ کو جو ہم یہاں پیش کر رہے ہیں، اصولاً استعمال کرتے ہوئے حق تعالیٰ کے گزشتہ احسانات کو یاد دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:-

فراموشت نہ کرد ایزد دراں حال ‏ ‏ کہ بودی نطفہ مدفون و مدہوش

روانت داد و عقل و طبع و ادراک ‏ ‏ جمال و حسن و رائے و فکرت و ہوش

دہ انگشت مرتب کرد بر کف ۔ دو بازدیت مرتب ساخت بر دوش!

گنوں پنداری اے ناچیز ہمت ۔ کہ خواہد کردنت روزے فراموش!

خوب سمجھ لو کہ صداقت جس وقت تک کہ وہ محض ایک ذہنی تعقل بنی رہتی ہے ہماری مدد کرنے سے قاصر ہوتی ہے، لیکن جب ہمیں اس کا تحقق ہوتا ہے وہ ایک ہمہ تواں قوت بن جاتی ہے، اب اہم بات جاننے کی یہ رہ جاتی ہے کہ صداقت کا تحقق کس طرح ہوتا ہے؟ یاد رکھو کہ جب ہم یہ یاد کرتے ہیں کہ ہماری پچھلی زندگی میں حق تعالیٰ نے ہم پر کیا کیا احسانات کیے ہیں، تو ہم اس صداقت کے تحقق کے قابل ہوتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے جو کچھ اس کے پہلے کیا ہے وہ اب بھی کر سکتے ہیں، معاذ اللہ حق تعالیٰ کہیں کمزور نہیں ہو گئے ہیں کہ وہ ہماری حفاظت نہ کر سکیں اور ہمیں بچا نہ سکیں، اور نہ معاذ اللہ وہ بہرے ہی ہیں کہ سُن نہ سکیں، وہ سمیع و بصیر، وہ علیم و قدیر ہیں، وہ ہر طرح کافی ہیں: اَلَیْسَ اللّٰهُ بِکَافٍ عَبْدَهٗ؟ کَفٰی بِاللّٰهِ وَلِیًّا وَّکَفٰی بِاللّٰهِ نَصِیْرًا

اگر ہم حق تعالیٰ کے ان احسانات کو یاد کرتے رہیں، جو پچھلی زندگی میں ہم پر بارش کی طرح نازل ہوتے رہے ہیں تو ہمیں شدت سے اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ ہم حق تعالیٰ کا شکر ادا کریں ان کے جملہ احسانوں کا، جملہ عنایتوں اور کرموں کا، نعمتوں اور راحتوں کا، اب ہمیں ایسا کرنا چاہیے، اور خوب خوب کرنا چاہیے! وحی غیر متلو کے الفاظ میں ہمیں کہنا چاہیے:

اللّٰھم لک الحمد کالذی تقول، و	حق تعالیٰ آپ کے لیے کل حمد ہے جیسی کہ آپ فرماتے ہیں
خیرا مما نقول، اللّٰھم لک الحمد	اور اس سے بڑھ کر کہ ہم کہتے ہیں: حق تعالیٰ آپ ہی کے لیے
کلہ ولک الشکر کلہ، ولک الملک	تعریف ہے سب کی اور آپ ہی کے لیے شکر ہے سب کا، اور
کلہ، ولک الخلق کلہ، بیدک	آپ ہی کے لیے حکومت ہے سب کی، اور آپ ہی کے لیے ہے
الخیر کلہ، الیک یرجع الامر	مخلوق سب کی، آپ ہی کے ہاتھ میں بھلائی ہے سب کی
کلہ!	اور آپ ہی کی طرف امور رجوع ہوتے ہیں سب کے سب۔
الحمد للہ الذی کفانی واوانی و	سب تعریف اس اللہ کی ہے جو مجھ کو کافی ہوا اور جس نے

اطعمنی وَسقانِی وَالّذِی مَنّ عَلیّ — مجھ کو کھانا دیا، اور کھلایا اور پلایا اور مجھ پر احسان اور
وافضل وَالّذِی اعطانی فاجزل — فضل کیا، اور مجھ کو مال و دولت دی اور بہت دی،
الحمد للہِ علی کلِّ حال۔ — ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔
اَللّٰھمّ لکَ الحمدُ کما ینبغی لجلال — اے اللہ تیرے لیے ایسی تعریف ہو جو تیری ذات کی
وجھک وعظیم سلطانک۔ — بزرگی اور تیری بڑی بادشاہت کے سزاوار ہو!

اس طرح حمد و شکر ادا کرنے سے، تسبیح و تقدیس سے ہم میں ایک اعلیٰ شعور پیدا ہوتا ہے، ایک پختہ یقین، باطنی وقوف، براہِ راست وجدان پیدا ہوتا ہے، جو عقلی علم یا تعقل سے ماوراء ہوتا ہے، اس کی کیفیت کا الفاظ میں ادا کرنا ممکن نہیں، ہمیں اس امر کا تحقق ہو جاتا ہے کہ جو کچھ بھی حق تعالےٰ نے اب تک کیا ہے وہ اب بھی کر سکتے ہیں۔

"اِنّہ علیٰ کُلِّ شَیءٍ قدیر و بالاجابۃ جدیر، نعم الولی و نعم النّصِیر!"

۲- اب ہمیں جو کام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ہم حق تعالیٰ کا جو زمین و آسمان کے خالق ہیں، جن کے ہاتھ میں سب کی بھلائی ہے، اور جن کی طرف سب امور رجوع ہوتے ہیں، ان نعمتوں کے لیے شکر ادا کریں، جن کی ہمیں اب حاجت یا ضرورت ہے، ہمیں اس پر ایمان ہے، ہمیں اس امر کا تحقق حاصل ہے کہ حق تعالیٰ ہر دشوار کو آسان کر سکتے ہیں، اُن کے لیے ہر دشواری کو آسان کر دینا آسان ہے (ان تیسیر کل عسیر علیک یسیر) پچھلی زندگی میں حق تعالیٰ نے ایسا کیا ہے اور اب بھی وہ کر سکتے ہیں، قطعاً کر سکتے ہیں، اس لیے ہم اُن کا شکر ادا کر رہے ہیں کہ اُنھوں نے ہماری دعا سُن لی، اس نعمت کا ظہور جس کی ہمیں حاجت ہے پردۂ غیب سے قطعاً ہو رہا ہے، اور غیب میں تو وہ ظاہر ہو چکی، ہماری مراد وہاں ہمیں مل چکی، ہمارا ایمان اس لامتناہی قوت پر ہے جس کے لیے ہر دشوار آسان ہے جس کے لیے ہر ناممکن ممکن ہے، اور ہم ان چیزوں کا جو ظاہر نہیں ہوئیں اس طرح ذکر کرتے ہیں گویا کہ وہ ظاہر ہو چکیں، یہی تاکید ہے ہمارے محبوب و مطاع صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی۔

اُدعوا اللہ وانتم موقنون بالاجابۃ — تم دعا مانگو، اور تم کو اُس کے قبول ہونے کا یقین ہو۔

حق تعالیٰ کا ایک نام مجیب بھی تو ہے، یعنی دعا اور سوال قبول کرنے والے، ان کا ارشاد ہے:

اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ	مجھ کو پکارو میں تمہاری دعا قبول کرلونگا۔
اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ	جب کوئی مجھے پکارتا ہے، تو میں پکارنے والے کی بات کا جواب دیتا ہوں۔
من یدعونی فاستجیب لہ	کوئی مجھ سے دعا کرتا ہے کہ میں اس کی دعا قبول کروں
ما من مسلم یدعوا بدعاءٍ الا استجیب لہ	جو مسلمان کوئی دعا کرتا ہے، تو اس کی دعا قبول ہوتی ہے۔

یہ اور اس طرح کی اور یقین آفرینیوں کے بعد اور خود اپنے ذاتی تجربہ کے بعد ہم دعا کے ساتھ ہی اجابت کی قبولیت کے یقین کے ساتھ حق تعالیٰ کا اس نعمت پر شکر ادا کرتے ہیں جس کی ہمیں حاجت ہو اور یقین رکھتے ہیں کہ یہ نعمت ہمیں حاصل ہو چکی ہے، گو کہ ابھی پردۂ غیب سے اس کا ظہور نہیں ہوا ہے۔

بات یہ ہے کہ عام آدمی چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنے سے پہلے نعمت کا ظہور ہو چکا ہو وہ ظہورِ نعمت کے بعد شکر ادا کرتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اس کی دعا اکثر موثر نہیں ہوتی، جو شخص نعم الٰہی کے لیے ہمیشہ دعا کرتا رہتا ہے اور حق تعالیٰ کا محض اس وجہ سے شکر ادا نہیں کرنا چاہتا کہ ابھی اس کی دعا کی قبولیت کے آثار و نتائج نہیں پیدا ہوئے ہیں، وہ ایمانِ کامل کی دولت سے محروم ہے، شکر گزار (شکار) ذاکر (ذکار) و مطیع و فرمانبردار، روح حق تعالیٰ کی نعمتوں اور عنایتوں کو اپنی طرف جذب کرتی ہے، تحمید و تسبیح ہم میں وہی شعور پیدا کرتی ہے جو ہم میں اس وقت خود بخود پیدا ہوتا، جب ہماری دعا قبول ہو چکی ہوتی!

ہم اپنا رُخ اس ذات کی طرف کیے ہوئے ہیں، "جو فاطرِ سماوات و ارض" ہے، اس کے ثنا خواں ہیں، اس کی نعمتوں کا شکر ادا کر رہے ہیں، عرض کر رہے ہیں کہ حق تعالیٰ آپ خیر محض ہیں، رحمتِ مطلق ہیں، فکرِ تام ہیں، کمالِ مطلق ہیں، محسن ہیں، مکرم و منعم ہیں مفضل ہیں، وہاب ہیں، نافع، رحمٰن و رحیم ہیں، مجیب ہیں، آپ ہمارے حالات میں کامل الٰہی تطابق پیدا کر رہے ہیں، یہ تطابق ہمارے

تخیل، ہمارے منصوبوں سے کہیں زیادہ کامل ہے، ہم نے اپنی جانیں آپ کے سپرد کر دی ہیں اور اپنا منہ آپ کی طرف کیا ہے، اور اپنا کام آپ کو سونپ دیا ہے۔ لا ملجاء ولا منجاء الا الیک!

اس دعا و ثنا کے نتیجہ کے طور پر ہمارے شعور میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے، تاریکی دور ہو جاتی ہے اور قلب کی فضا نورانی ہو جاتی ہے، قلب مسرت سے بھر جاتا ہے، اطمینان، سکینہ، وقار، سرور کا مبدأ فیاض کی جانب سے مسلسل فیضان ہونے لگتا ہے، باطن انوار و کیفیتِ محبت سے لبریز ہو جاتا ہے، ہم جان لیتے ہیں کہ اب ہم حصارِ سلامتی میں ہیں، اور ہماری دعائیں عالمِ قدس میں پہنچ چکی ہیں، اب جو کچھ ہوگا، وہ خیر ہوگا! گو ابھی خارج میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے معاملات ویسے ہی نازک ہیں لیکن ہمارا باطن یقین و مسرت سے پُر ہو جاتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ ایمان ان اشیاء کے وجود پر گواہی ہے، جن کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے، ایمان ان اشیاء کی حقیقت یا جوہر ہے، جن کی ہم حق تعالیٰ سے توقع کرتے ہیں۔

اس یقین و مسرت و سکینیت کی وجہ سے ہم پھر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، ان کی حمد و ثنا کرتے ہیں، تسبیح و تقدیس میں مصروف ہو جاتے ہیں، اس نعمت کے لیے اس بخشش و فضل کے لیے جس کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے اور جس کا وقوع ابھی قریب نظر نہیں آتا، ممکن ہے کہ اس کا کچھ عرصہ کے لیے ظہور نہ ہو، وقوع نہ ہو، لیکن یہی عدمِ ظہور و عدمِ وقوع ہمیں اپنی قوتِ ایمانیہ سے کام لینے کا موقع عطا کرتا ہے کہ ہم اس یارِ "پسندیدہ" کے حمد و ثنا میں مشغول و مصروف رہیں، جس کے ہاتھوں میں سب کی بھلائی ہے، اور ہر چیز کا پورا اختیار ہے، فَسُبۡحَانَ الَّذِیۡ بِیَدِهٖ مَلَکُوۡتُ کُلِّ شَیۡءٍ وَّاِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ!

جامی از یارِ پسندیدہ مبرید حاشا
کاں پسندیدہ جز کارِ پسندی نکند!

ہم شکر ادا کرتے ہیں، حمد و ثنا کرتے ہیں، اس نعمت پر بھی جس کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے لیکن جس کے متعلق ہمارا ایمان ہمیں یقین دلاتا ہے کہ یہ نعمت حق تعالیٰ نے ہمیں عطا کر دی ہے اور وہ

ظاہر ہونے والی ہے، کہا جاتا ہے کہ جب بارش کی دعا کے لیے لوگ جمع ہونے لگے، تو ایک بچی اپنی چھتری ساتھ لیے دعا میں شریک ہونے پہنچی، اس کو یقین تھا کہ بارش اب قطعاً ہوگی، ہمارا ایمان بھی اس معصوم جان کی طرح ہونا چاہیے کہ مبدا رفیاض کی جانب سے وہ نعمت ہمیں قطعاً عطا ہوگی جس کا سوال ہم نے کیا ہے؛ جس قدر ہماری قوتِ ایمانی قوی ہوگی اسی قدر ہمارے تمام امور میں کامیابی و کامرانی نصیب ہوگی، اور ہماری ساری پریشانیاں سلجھ جائینگی، مومن اپنی قوتِ ایمانی ہی سے ہمیشہ کام لیتا ہے، اور کامراں ہوتا ہے۔

بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس نعمت کا خارجی ظہور نہیں ہوتا، جب ایسا ہو تو یقین رکھو کہ یہ ہمیں ایک بہتر حالت کی طرف منتقل کرنے کے لیے ہو رہا ہے اور ہمیں حق تعالیٰ کی حکمت و رحمت کا عمیق علم عطا کرنا مقصود ہے، اس لیے بجائے حزن و یاس کے ہمیں حق تعالیٰ کی حمد و ثنا میں مصروف رہنا چاہیے، یہ ہمارے ایمان کی بڑی آزمائش ہے، اس خاص وقت کی دعا یہ ہے:-

اللّٰهم لك الحمد حمدًا دائمًا مع دوامك ولك الحمد خالدًا مع خلودك ولك الحمد حمدًا لا منتهى له دون مشيتك ولك الحمد لا يريد قائله الا رضاك ولك الحمد حمدًا عند كل طرفة عين وتنفس اللّٰهم اقبل بقلبي الى دينك واحفظ من ورائنا برحمتك، اللّٰهم ثبتني ان ازل واهدني ان اضل.	اے اللہ حمد تیرے ہی لیے ہے۔ ایسی حمد کہ تیری ہمیشگی کے ساتھ وہ بھی ہمیشہ رہے، اور تیرے ہی لیے حمد ہے ایسی حمد کہ تیرے دوام کے ساتھ وہ بھی دائم رہے، اور تیرے ہی لیے حمد ہے ایسی حمد کہ اس کی انتہا تیری مشیت کے ادھر نہیں اور تیرے ہی لیے حمد ہے ایسی حمد کہ اس کے قائل کا مقصود تیری ہی خوشنودی ہے، اور تیرے ہی لیے حمد ہے ایسی حمد جو ہر پلک جھپکانے اور ہر سانس لینے کے ساتھ ہو، اے اللہ میرے دل کو اپنے دین کی طرف متوجہ کردے اور ہماری حفاظت ہمارے اوپر سے رکھ اپنی رحمت کے ساتھ! اے اللہ مجھے ثابت قدم رکھ کہ کہیں بہک جاؤں اور اے اللہ مجھے ہدایت پر رکھ کہ کہیں گمراہ نہ ہو جاؤں۔

ہم اس دعا میں مصروف رہتے ہیں حق تعالیٰ کی ثنا و حمد میں مشغول رہتے ہیں، یہاں تک کہ ہمیں اس کی پرواہ نہیں رہتی کہ مصیبت سے نجات کا سامان پردۂ غیب سے ظاہر ہوا ہی کہ نہیں اور بالآخر شعور کا وہ نکتہ نمایاں ہوتا ہے، جب اس نجات کا خیال ہی قلب میں خطور نہیں کرتا، اور ہم حق تعالیٰ کی حمد و ثنا میں صرف حق تعالیٰ ہی کی خاطر مشغول و مصروف ہو جاتے ہیں، رضا و موافقتِ مولیٰ کے مقام کی طرف ہمارا عروج ہوتا ہے، اب نہ ہم میں کوئی ارادہ باقی رہتا ہے، نہ کوئی خواہش، نہ فعل نہ اختیار، یہ سب ارادہ و فعلِ حق میں غائب و فانی ہو جاتے ہیں۔

آمد خبرے ز آمد او — من بعد خبر نماند مارا

یہی شیخ جیلی کے الفاظ میں الراحۃ الکبریٰ والجنۃ المعجلۃ فی الدنیا والآخرۃ ہے، اسی کا نام اطمینانِ قلب ہے جس کی طرف اس آیۂ کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِکْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ؕ (پ ۱۳ ع ۱۰)	جو لوگ ایمان لائے، اور ان کے قلب اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مطمئن ہو گئے، ہاں اللہ ہی کے ذکر سے دل کو سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

اطمینانِ قلب یا نفسِ مطمئنہ کے حصول کے بعد بندۂ مومن حق تعالیٰ سے راضی ہو کر جنتِ ذات میں داخل ہو جاتا ہے:۔

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۔ (پ ۳۰ ع ۱۴)

یہی حریتِ تامہ ہے، یعنی حق تعالیٰ کا پانا اور ان سے راضی و مسرور رہنا:۔

یار با ماست چہ حاجت کہ زیادہ طلبیم
دولتِ صحبتِ آں مونسِ جاں مارا بس (حافظ)

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ !

ضمیمہ

شکر کے ذریعہ سلوک کے طے کرنے میں مندرجہ ذیل دعائیں اکسیر کا حکم رکھتی ہیں، سحر کے وقت ان کا ورد رقتِ قلبی کے ساتھ جاری رہنا چاہیے:-

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ اِلٰهِیْ اَنَا الصَّغِیْرُ الَّذِیْ رَبَّیْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الضَّعِیْفُ الَّذِیْ قَوَّیْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الْعَارِیُّ الَّذِیْ کَسَوْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الْجَائِعُ الَّذِیْ اَشْبَعْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الظَّمْاٰنُ الَّذِیْ سَقَیْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الْمَرِیْضُ الَّذِیْ عَافَیْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الدَّاعِیْ الَّذِیْ اَجَبْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الْفَقِیْرُ الَّذِیْ اَغْنَیْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الْجَاهِلُ الَّذِیْ عَلَّمْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الْمُهَانُ الَّذِیْ کَرَّمْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا السَّائِلُ الَّذِیْ اَعْطَیْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الرَّاغِبُ الَّذِیْ اَرْضَیْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الْخَائِفُ الَّذِیْ اٰمَنْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الْغَائِبُ الْیَسِیْرُ الَّذِیْ اٰوَیْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الْخَاطِیْ الَّذِیْ غَفَرْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الذَّلِیْلُ الَّذِیْ عَزَّزْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الْمَجْهُوْلُ الَّذِیْ عَرَّفْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الْعَوِرُ الَّذِیْ سَتَرْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ غِیَاثِیْ فِیْ کُلِّ کُرْبَةٍ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنْتَ رَجَائِیْ فِیْ کُلِّ شِدَّةٍ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنْتَ خَیْرُ الْاٰلَاءِ عِنْدِیْ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنْتَ قَدِیْمُ الْعَفْوِ فَلَكَ الْحَمْدُ وَلَمْ تَسِمْنِیْ لِسُوْءِ عَمَلِیْ قَطُّ فَلَكَ الْحَمْدُ وَلَمْ تُؤَاخِذْنِیْ بِخَطِیْئَتِیْ فَلَكَ الْحَمْدُ وَلَمْ تُشْمِتْ بِیْ عَدُوِّیْ فَلَكَ الْحَمْدُ وَمَا بَیَّتُّ فَضِیْحَتِیْ بِعَمَلٍ فَلَمْ تُعَذِّبْنِیْ وَلَمْ تَفْضَحْنِیْ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَرْجُوا الْخَیْرَ فَتُیَسِّرُهٗ وَاَخَافُ الشَّرَّ فَتَصْرِفُهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَتَلَطَّفْتَ بِیْ فِی الصِّغَرِ فَلَكَ الْحَمْدُ وَهَدَیْتَنِیْ لِلْاِسْلَامِ فِی الْکِبَرِ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَرَیْتَنِی الثَّنِیَّاتِ فَلَكَ الْحَمْدُ وَعَلَّمْتَنِیْ مَا لَمْ اَکُنْ اَعْلَمُ فَلَكَ الْحَمْدُ وَارْزُقْنِیْ مَا لَمْ اَکُنْ اَحْسَبُهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَسَخَّرْتَ لِیْ مَا لَمْ اَکُنْ مُقْرِنًا فَلَكَ الْحَمْدُ عَظُمْتَ وَکَبُرْتَ فَلَكَ الْحَمْدُ بِكَ اُصْبِحُ وَاُمْسِیْ فَلَكَ الْحَمْدُ بِیَدِكَ مَوْتِیْ وَحَیَاتِیْ فَلَكَ الْحَمْدُ رَبِّ ارْحَمْنِیْ

وَاَنَا اَسْئَلُكَ وَلَا تُعَذِّبْنِيْ وَاَنَا اَسْتَغْفِرُكَ . رَبِّ لَا تَحْرِمْنِيْ لِقِلَّةِ شُكْرِيْ وَ
لَا تُعَذِّبْنِيْ لِكَثْرَةِ ذُنُوْبِيْ وَارْحَمْنِيْ مِنْ اَجْلِ ضُعْفِيْ وَاَعْطِنِيْ مِنْ اَجْلِ
فَقْرِيْ وَارْحَمْنِيْ وَاعْفُ عَمَّا تَعْلَمُ مِنْ ذُنُوْبِيْ فَاِنْ تُعَذِّبْ
فَاَنَا الظَّالِمُ وَاِنْ تَعْفُ فَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ
وَاِنْ تَعْفُ فَطَوْلٌ مِّنْكَ وَاِنْ تُعَذِّبْ
فَغَيْرُ ظَالِمٍ وَلَا مَسْئُوْلٍ

ماحول پر قابو کس طرح حاصل کیا جائے؟[1]

گرچہ دیوار افگند سایہ دراز　　　　باز گردد سوئے او آں سایہ باز
ایں جہاں کوہ است فعلِ ما ندا　　　　سوئے ما آید ندا ہا را صدا

قرآنِ عظیم کی تعلیم یہ ہے کہ کائنات میں ایک لاتناہی حکمت، رحمت و کرم کے ساتھ مصروفِ عمل ہے اور زندگی کے ہر قدم پر ہماری رہبری کرنے پر آمادہ ہے۔ اگر ہم اس پر بھروسہ کریں اور اعتصام کے طریقوں سے واقف ہو کر اس کے دامن میں چنگل ماریں، ہمیں کائنات میں بے یار و مددگار، بے ولی و ... نہیں چھوڑا گیا ہے، ساری زندگی لطفِ حق شاملِ حال رہتا ہے، زندگی حق تعالیٰ کی نعمت و فضل سے مملو ہو جاتی ہے، اطمینانِ قلب و جمعیتِ خاطر نصیب ہوتی ہے، اگر ہم رضائے حق کے تابع ہو جائیں اور حق تعالیٰ کو کافی سمجھ کر سارے کام ان کے سپرد کر دیں

حق تعالیٰ ہمیں سلامتی و نجات کی طرف لے جانا چاہتے ہیں وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ان تجربات میں کامیاب کرنا چاہتے ہیں جن سے ہم گزر رہے ہیں اور جن سے ہم خوفزدہ ہیں! اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ (بقرہ ۲۴۳) وہ ہمارے ضعف و کمزوری سے واقف ہیں، وہ ہمارا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے ہیں۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (النساء ۲۸) حق تعالیٰ ہمیں برترین مسرت عطا کرنا چاہتے ہیں اور اس سرور سے ہمارے قلب کو مملو کرنا چاہتے ہیں جس کا خود ہمیں اندازہ نہیں فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان خزانۂ غیب میں موجود ہے اس کی کسی کو خبر نہیں (السجدۃ)

---

[1] یہ مقالہ پہلی مرتبہ برہان بابت جنوری ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا

دنیا میں ہر جگہ ایک کامل الٰہی نظم موجود ہے، جس میں توافق و ہم آہنگی بھی ہے اور سرور و سکینہ بھی!
حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی اس نظمِ الٰہی کے دائرہ میں بسر ہو اور زمین پر رہ کر ہم جنت کی خوشبو سونگھتے رہیں: هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَمَلٰٓىِٕكَتُهٗ لِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِؕ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا (الاحزاب ۶) حق تعالیٰ اور اس کے فرشتے مومن پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں حق تعالیٰ انہیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جاتے ہیں اور وہ مومن پر بہت مہربان ہیں۔

اسی زندگی میں ہمیں یہ نعمت مل سکتی ہے اور حق تعالیٰ ہی ہمیں اس کو عطا کر سکتے ہیں، وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ! اگر ہم حق تعالیٰ پر کامل بھروسہ کریں تو ہماری مثال اس درخت کی سی ہو جاتی ہے جو پانی کے چشمے کے بازو لگا ہو، ہر وقت روحانی قوت و حیات کے سرمدی چشموں سے ہمیں تازگی پہنچتی رہتی ہے!

صد چو عالم در نظر پیدا کند ‌ ‌ ‌ ‌ چونکہ چشمت را بخود بینا کند ‌ ‌ ‌ ‌ (رومیؒ)

اگر ہماری آنکھیں حق تعالیٰ کے مشاہدے کے لیے کھل جائیں اور ہم ہدیت و نظمِ الٰہی کے دائرہ میں اپنی زندگی بسر کریں تو ہماری ساری خارجی مشکلیں حل ہو جاتی ہیں یا غائب ہو جاتی ہیں:!

گر جہاں پُر برف گردد سر بسر ‌ ‌ ‌ ‌ تاب خور بگدازدش از یک نظر ‌ ‌ ‌ ‌ (رومیؒ)

اس عقیدہ یا ایمان کی مضبوط چٹان پر کھڑے ہو کر زندگی کے کچھ قدیم دستور سنو اور زندگی کے تجربات، حالات یا ماحول ہیں ان سے کام لو۔ زندگی گر یہیم رہیگی "خند بکدم" ہو جائیگی!

یاد رکھو کہ خارجی زندگی باطنی زندگی کا عکس ہے۔ ہماری باطنی زندگی یا "انفس" جیسا ہوگا ویسا ہی عکس ہمارے خارجی حالات ہونگے، ویسا ہی ہمارا "آفاق" ہوگا آفاق تابع انفس ہے۔ آفاق میں تغیر انفس کے تغیر کا تابع ہے۔ اس صداقت کو قرآن حکیم نے کئی سے زیادہ جگہ واضح کیا ہے: شک و شبہ سے نکالنے کے لیے ہم اس کا ذکر کر رہے ہیں

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى یُغَیِّرُوْا ‌ ‌ ‌ ‌ واقعی حق تعالیٰ کسی قوم کی حالت میں تغیر نہیں کرتا

مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ (الرعد ۲۶) جب تک وہ لوگ خود اپنی حالت کو نہیں بدلتے

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمۡ يَكُ مُغَيِّرًا یہ بات اسی سبب سے ہے کہ حق تعالیٰ کی ایسی نعمت

نِّعۡمَةً اَنۡعَمَهَا عَلٰى قَوۡمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا کو جو کسی قوم کو عطا فرمائی ہو نہیں بدلتے جب تک کہ

مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ (الانفال ۷۶) وہی لوگ اپنے نفس کو نہیں بدل ڈالتے۔

خارج کا تغیر، ماحول کا بدلنا، حالات پر قابو پانا ہو تو باطن کا تغیر، نفس کا بدلنا ضروری ہے اگر باطن میں کجی ہو، نفس خام و ناشائستہ ہو، تو خارج میں کجی، ناہمواری، عدم توافق یا دوسرے الفاظ میں درد و غم، قلت و افلاس، ضیق و پریشانی کا ہونا ضروری ہے۔

باطن یا نفس سے مراد ظاہر ہے کہ نفس اور اس کے صفات ہیں اور ان سے پیدا ہونے والے افعال و اعمال ہیں۔ اب ماحول کی ناسازگاری، ضیق و پریشانی، رنج و غم، غم و الم راست نتیجہ ہیں باطنی زندگی کا، یعنی رذائلِ اخلاق کا، اتباعِ ہوا کا، جرم و معصیت کا، بدکرداری و گناہ کا۔ قرآن مبین نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:۔

وَمَاۤ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی

كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں سے ہے اور بہت سے

كَثِيۡرٍ (شوریٰ ۵۶) تو درگذر ہی کر دیتا ہے۔

اسی اصول کو کسی اور جگہ اور زیادہ واضح الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے۔

اَوَلَمَّاۤ اَصَابَتۡكُمۡ مُّصِيۡبَةٌ قَدۡ اَصَبۡتُمۡ اور جس وقت تم کو ایک تکلیف پہنچی کہ تم اس سے

مِّثۡلَيۡهَا قُلۡتُمۡ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلۡ هُوَ مِنۡ دو چند پہنچا چکے ہو تو کہتے ہو کہ یہ کہاں سے

عِنۡدِ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ آئی؟ آپ فرما دیجیے کہ یہ تکلیف تم کو تمہارے

شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ (پ ۴ ع ۶) ہی طرف سے پہنچی۔

صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کی تفسیر میں فرمایا:

انما ھی اعمالکم ترد علیکم یہ تمہارے اعمال ہیں جو تم پر لوٹائے جاتے ہیں۔

دوسری جگہ یوں فرمایا:

إنما هي أعمالكم أحصيها — یہ تمہارے اعمال کا بدلہ ہے جن کو میں محفوظ رکھتا ہوں
عليكم فمن وجد خيرا فليحمد — (تمہارے نامۂ اعمال میں لکھواتا جاتا ہوں کہ ان کا پورا پورا بدلہ تم
الله ومن وجد غيرها فلا — کو ملے) اگر تم میں سے کوئی خیر پائے تو اللہ کا شکر کرے اور اگر
يلومن إلا نفسه. — اس کے خلاف پائے تو سوائے اپنے نفس کے کسی پر ملامت نہ کرے

اس اصول کی وضاحت میں صوفیۂ کرام نے جو مثال استعمال کی ہے وہ نہایت صحیح اور صاف ہے، وہ شخص اور اس کے سایہ سے اس اصول کو سمجھاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ظل یا سایہ شخص کے تابع ہوتا ہے۔ اگر کوئی شے ٹیڑھی ہو تو اس کا سایہ بھی ٹیڑھا ہوگا اور اگر سیدھی تو سایہ بھی سیدھا ہوگا۔ النفس شخص کی مانند ہے اور ماحول اس کا سایہ ہے، یا صفات و اعمال شخص کی مثال ہے، حالات و واقعات ان کا عکس و سایہ ہیں۔ شیخ ابو النجاؒ اپنے احباب سے کہا کرتے تھے۔

اعلموا ان جميع الوجود يقابلكم بحسب — یعنی "جان لو کہ جو اعمال تم سے سرزد ہوتے ہیں ویسے
ما برز منكم من الاعمال، فانظروا — ہی تمہارے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے، اسی لیے ذرا
كيف تكونون، فان الظل تابع — اپنے اعمال پر نظر رکھنا کیونکہ ظل یا سایہ شخص کے
الشاخص في العوج والاستقامة — تابع ہوتا ہے کجی و راستی ہر دو میں۔

اس صداقت پر امام شعرانی کو اتنا یقین تھا کہ اگر اپنے دوستوں یا بیوی یا نوکروں سے کجروی یا نشوز و گریز اپنے معاملہ میں پاتے تو ذمہ دار اپنی ذات کو ٹھہراتے اور اپنے ہی پر ملامت کرتے۔ ان کا یہ قول مشہور ہے۔

إنّ الوجود يعاملني على صورة عاملت — یعنی "لوگ میرے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتے ہیں
به، فاللوم عليّ لا عليهم في الاصل — جیسا کہ میں ان کے ساتھ کرتا ہوں، پس ملامت
لانهم كظل الشاخص على حد سواء — میری ہی ذات پر ہو نہ کہ ان کی ذات پر کیونکہ
فان كان الشاخص مستقيما فالظل — ان کی مثال کسی شے کے سایہ کی مانند ہے۔ اگر

مستقیما اواعوج فالظل اعوج	شے سیدھی ہے تو سایہ بھی سیدھا ہے اور اگر شے
ومن طلب لاستقامۃ الظل	ٹیڑھی ہو تو سایہ بھی ٹیڑھا۔ جس شخص نے اس بات
مع عوج الشاخص فقد رام	کی توقع کی کہ ٹیڑھی شے کا سایہ سیدھا ہو گا تو
المحال۔	اس نے محال کی تمنا کی"

قرآن عظیم نے کُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ اور كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ اور لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اور مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا کہہ کر اس صداقت کی توضیح کی ہے، اس اصول کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو! یہ وہی اصول ہے جس کو امیر مینائی نے عاشقوں کی زبان میں اس طرح ادا کیا ہے۔

یہ رونا بیوفائی کا یہ شکوہ کج ادائی کا سزا ہو دل لگانے کی، مزہ ہو آشنائی کا

فلسفۂ اخلاق کی زبان میں اس کو یوں بیان کرتے ہیں: الناس مجزیون باعمالھم ان خیراً فخیر وان شراً فشر۔ لوگوں کو اعمال کی جزا ملتی ہے اگر اعمال اچھے ہوں تو ان کی جزا بھی اچھی ہوتی ہے، اور اگر اعمال بد ہوں تو ویسی ہی ان کی جزا ہوتی ہے!

بنیادی اصول کو سمجھ لینے کے بعد اب ماحول یا واقعاتِ زندگی کے سلسلہ میں تمہیں چند باتیں سمجھنی ضروری ہیں۔

اوپر بیان کیے ہوئے اصول پر غور کرنے سے تمہیں یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ زمین و آسمان کی پیدائش کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے اور قرآن کریم نے صاف الفاظ میں اس کی وضاحت کر دی ہے:-

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَ	حق تعالیٰ نے آسمان و زمین کو حکمت کے ساتھ
لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ	پیدا کیا کہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے
لَا يُظْلَمُوْنَ ۔ (الجاثیہ ۲۶)	اور ان پر ذرا ظلم نہ کیا جائے۔

یاد رکھو کہ زندگی کا مقصد طفلِ شیر خوار کی طرح ہماری دایہ گری کرنا نہیں! یہ فرائض و واجبات کا

بار ہمارے کندھوں پر رکھتی ہے تاکہ ان کی ادائی میں ہم زیادہ سے زیادہ قوی ہوتے جائیں، ہمارے اخلاقی اعصاب و عضلات طاقتور ہوں اور ہم انسانِ کامل بن جائیں اور اس سرور و مستی سے بہرہ یاب ہوں جو کاملین کے لیے مقدر کی گئی ہے:

یا یوں کہو کہ ہماری زندگی ایک تربیت گاہ ہے، حق تعالیٰ ہمارے معلم اور استاد ہیں، روز مرہ کے واقعات اور حادثات وہ آلات ہیں جن کے ذریعہ ہماری سیرت کی تکمیل کی جارہی ہے۔ دنیا کی مثال ایک "رنج ساز وادی" سے دی جاتی ہے۔ یہاں کبھی غم کی مضراب سے اور کبھی خوشی کے تاروں سے سیرت کے خفتہ نغمے بیدا کیے جاتے ہیں، راحت و غم، بلا و طرب، لذت و الم ہمیں اپنا سلوک طے کرنے میں مدد دے رہے ہیں، دونوں ہمارے لیے خیر ہیں، ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی ؎

بس زبونِ وسوسہ باشی دلا گر طرب را باز دانی از بلا

موت وحیات کی تخلیق قرآنِ حکیم کے الفاظ میں اس لیے ہوئی ہے کہ اس امر کی آزمائش کی جائے کہ ہم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے:

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (الملک ع ۱)

جب حقیقت یہ ہے تو عارف نہ زندگی کے تغیرات سے گھبراتا ہے نہ ان سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے، یہ تو اس کی تادیب و تزکیہ کے لیے ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ ان تغیرات و تحولات سے وہ اسی طرح سبق لیتا ہے جس طرح کہ ایک ذہین و محنتی طالب علم استاد کی تقریر و تعلیم سے استفادہ کرتا ہے، اپنے جہل کو دور کرتا ہے، اپنے نفس کا تزکیہ، قلب کا تصفیہ اور اپنے دماغ کا خیالاتِ فاسدہ سے تخلیہ کرتا ہے، ان واقعات و تغیرات کی حیثیت اس کی نگاہ میں ایک پردہ کی سی ہے اور اس پردہ کے پیچھے وہ حق تعالیٰ ہی کو مصروفِ عمل دیکھتا ہے اور شیخ جیلی کے الفاظ میں حق تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

رَبِّ اَشْهِدْنِيْ مُطْلَقَ فَاعِلِيَّتِكَ فِيْ اے پروردگار مجھے ہر شے میں اپنی فاعلیت کا

كُلِّ مَفْعُوْلٍ حَتّٰى لَا اَرٰى فَاعِلًا غَيْرَكَ — مشاہدہ نصیب کر تاکہ تیرے سوا کسی کو فاعل نہ دیکھوں کہ

لِاَكُوْنَ مُطْمَئِنًّا تَحْتَ جَرَيَانِ اَقْدَارِكَ — تیرے اقدار کے جاری ہونے سے مطمئن ہو جاؤں

مُنْقَادًا لِكُلِّ حُكْمِكَ! — اور تیرے ہر حکم کا مطیع و فرمانبردار بن جاؤں۔

اسی علم و عرفان کے ایک متوالے کی زبان سے یہ سریلے نغمے نکلے ہیں :-

یار ہست مرا ورائے پردہ — حسنِ رُخ او سزائے پردہ

عالم ہمہ پردۂ مصور — اشیاء ہمہ نقشہائے پردہ

ایں پردہ مرا ز تو جدا کرد — اینست خود اقتضائے پردہ

نے نے میانِ ما جدائی — ہرگز نکند غطائے پردہ (دلا اعلم)

جاہل تغیرات کو پسند نہیں کرتا، ان سے کبیدہ خاطر ہوتا ہے، ان کا مقابلہ کرتا ہے، مزاحم ہوتا ہے! لیکن زندگی دائمی تغیر کا نام ہے "سکون محال ہے قدرت کے کارخانہ میں" اس لیے جاہل کا مقابلہ خود زندگی کے قانون اور اس کی قوتوں سے ہے، یہ قانون اور اس کی قوتیں مقصد و غایت کے لحاظ سے منصفانہ اور مہربان اور عمل کے لحاظ سے غیر جانبدارانہ اور ناقابلِ شکست ہوتی ہیں۔

ہمیں زندگی کے واقعات و تغیرات کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کے ساتھ برضا و رغبت اشتراک عمل کرنا چاہیے! یعنی ہمیں اس سبق پر نگاہ رکھنی چاہیے جو ہمیں ان واقعات و تجربات کے ذریعہ دیا جا رہا ہے کیونکہ جب ہم اس سبق کو یاد کر لیتے ہیں اور اس کے مطابق اپنی سیرت و عمل میں تغیر پیدا کر لیتے ہیں، تو پھر یہ تکلیف دہ، ناخوشگوار اور المناک واقعات و تجربات رفع ہو جاتے ہیں اور طمانیت و برد قلبی ہمیں نصیب ہوتی ہے حقیقی معنی میں کامیاب زندگی کا راز حق تعالیٰ کے ارادے اور مقصد کے ساتھ توافق و اتحاد ہے۔ اور اس مقصد و ارادہ کا اظہار ان ہی واقعات و تجربات و تغیرات میں ہو رہا ہے جس کے ساتھ توافق ضروری ہے جس کا شرع کی زبان میں "توافق بالقضاء" نام ہے، جس کو "رضا بالعطاء" و "حفظ حال" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، اسی لیے واقفانِ راز نے کہا ہے کہ

بدیں سپاس کہ مجلس منور ست بناز — گرت چو شمع جفائے رسد بسوز و بساز

ہمیں دنیا میں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ تجربات کے ذریعہ سیرت کی تکمیل کریں، اپنی پوشیدہ و نہفتہ روحانی قوتوں کو ظاہر و نمایاں کریں جو الٰہی قوتیں ہم میں بالقوی ہیں انہیں بالفعل کریں اور ہم اسی صورت میں ارادۃ اللہ کے ساتھ توافق قائم کر سکتے ہیں جب ہم اپنی زندگی کے واقعات و تجربات کے ساتھ برضا و رغبت اشتراکِ عمل کریں، اور جو سبق وہ ہمیں سکھانے کے لیے رونما ہو رہے ہیں انہیں سیکھیں نہ کہ ان سے تجاہل برتنے کی کوشش کریں:۔

در ریاضِ بندگی رعنا تر از شاخِ گل ست　　گردنے کز بارِ تسلیم و رضا خم می شود!

تمام تجربات کا مقصد ہمیں اس راہ پر لے چلنا ہے جو خدا کی طرف لے جاتا ہے، ہم اپنے جہل کی وجہ سے اس راہ سے بھٹک جاتے ہیں، دور جا پڑتے ہیں! جذبات و شہوات ہمیں صراطِ مستقیم سے ہٹا لے جاتے ہیں، صراطِ مستقیم کی طرف ہمارے قدم اسی وقت اُٹھ سکتے ہیں جب ہماری سیرت کی تکمیل ہو اور ہمارا روحانی ارتقا عمل میں آئے، اب زندگی میں رونما ہونے والے سارے تجربات و واقعات ہماری سیرت کی تکمیل کرتے ہیں اور ہمارے روحانی ارتقا میں مدد دیتے ہیں تاکہ ہم اس صراطِ مستقیم پر چلیں جو حق تعالیٰ کی طرف ہمیں لے جاتی ہے۔ لہذا تجربات و حالات خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار، مسرت بخش ہوں یا غمناک، بہر طور یہ ہمارے خیر برتر کے حصول کے لیے ضروری و لابدی ہیں، ان میں ہمارے لیے ہدایت کا ایک سبق پوشیدہ ہوتا ہے جس کو معلوم کرنے اور جس پر عمل پیرا ہونے کی ہمیں کوشش کرنی چاہیے اور جوں ہی ہم نے اس ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا ہمیں شقاوت و گمراہی سے نجات مل جاتی ہے اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج ضیق، خوف و حزن سے بھی!

فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ	تو جو شخص میری اتباع کریگا تو وہ نہ گمراہ ہوگا اور
وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ	نہ شقی اور جو شخص میری نصیحت سے اعراض
مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ	کریگا تو اس کے لیے تنگی کا جینا ہوگا اور قیامت
أَعْمَىٰ (طٰہٰ ۱۷)	کے روز ہم اس کو اندھا کرکے اٹھائینگے۔

ہر تجربہ، ہر واقعہ زندگی کا خیرِ لا متناہی کی طرف لے جاتا ہے، تصادم کی بجائے اس سے توافق ہی سب سے بڑی عقلمندی ہے، رضا بالقضاء اسی کو کہا جاتا ہے، ہماری زندگی میں کوئی حادثہ نہیں نازل ہوتا مگر وہی جو حق تعالیٰ نے ہمارے لیے مقدر فرمایا ہے، وہ ہمارے مولیٰ ہیں، آقا ہیں ہمیں اپنے سب کام انہی کے سپرد کر دینے چاہئیں

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰىنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ

شاد و خنداں پیشِ تیغش سر بنہ ہمچو اسمٰعیل پیشش سر بنہ (رومیؒ)

تمام تجربات و حادثات دوا و معالجہ کی غرض سے ظہور پذیر ہوتے ہیں اور جب ان کا مقصد پورا ہو جاتا ہے تو وہ غائب ہو جاتے ہیں، پھر ان دردناک حادثات کی تکرار عموماً نہیں ہوتی، پھر راحت و طمانیت ہی میں زندگی گزرتی ہے۔

بسردو گرمِ جہاں خاطرت چو راضی شد تمام عمر ترا آب سرد و نانِ گرم است (سلیمؒ)

جب تک ہم حادثاتِ زمانہ سے سبق نہیں لیتے کجروی و گمراہی میں مبتلا رہتے ہیں، اتباعِ شہوات میں گرفتار رہتے ہیں اور ان مصائب و آفات کو خود پیدا کرتے رہتے ہیں جن سے ہم نجات پانا چاہتے ہیں، جب ہم نے سبق ہدایت حاصل کیا، ہماری سیرت بدلتی ہے۔ ہم میں تقویٰ کے صفات پیدا ہوتے ہیں، ہمارا نقطۂ نگاہ بدلتا ہے، قانون الٰہی کے مطابق ہم فکر کرنے لگتے ہیں، حق تعالیٰ سے ربط قائم کرنے لگتے ہیں، ان کی ہدایت پر عمل پیرا ہونے لگتے ہیں۔ آفات و مصائب کا ورود جس غرض کی تکمیل کے لیے ہو رہا تھا اب وہ غرض چونکہ پوری ہو چکی ہوتی ہے، وہ بھی بتدریج غائب ہونے لگتے ہیں۔

دردناک تجربات و حادثات ہی سے ہمیں سبقِ ہدایت حاصل کرنا کافی نہیں بلکہ ان تجربات و حالات سے بھی جو خوشگوار اور راحت بخش ہوتے ہیں ہمیں سبق سیکھنا ضروری ہے۔ آسائش و نعمت کی حالت میں بھی ہمیں شکر کے ذریعہ حق تعالیٰ کی یاد میں رہنا چاہیے چنانچہ تاکید کے ساتھ حکم دیا گیا ہے

فلیکثر الدعاء عند الرخاء چین و آسائش کے وقت زیادہ دعا کرتے رہو

چین کی حالت میں دعا کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر نعمت کو حق تعالیٰ ہی کی طرف سے سمجھا جائے وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ کیونکہ درحقیقت منعم و قاسم نعمت حق تعالیٰ ہی ہیں، لہذا ان ہی کی مرضی کے مطابق نعمتوں کا استعمال ضروری ہے جب ہمیں نعمتیں عطا کی جاتی ہیں، جب ہم عافیت کی حالت میں ہوتے ہیں، جب ہمیں صحت و تندرستی ملتی ہے، امراض و آلام سے محفوظ ہوتے ہیں، فراخی و آسائش سے متمتع ہوتے ہیں تو یہ سب ہماری آزمائش و ابتلاء کے لیے ہوتا ہے، دیکھا جاتا ہے کہ اس عافیت کے نتیجہ کے طور پر ہم میں کبر و عجب تو نہیں پیدا ہو گیا، ہم شہوتوں اور لذتوں کے درپے تو نہیں ہو گئے، موجودہ نعمتوں کو حقیر و خوار تو نہیں سمجھنے لگے اور ان نعمتوں میں عیب و نقصان تو نہیں نکالنے لگے! دیکھا جاتا ہے کہ کیا نعمتوں اور راحتوں کی وجہ سے ہم حق تعالیٰ کی اطاعت سے روگرداں ہو کر گناہوں اور معصیتوں میں منہمک تو نہیں ہو گئے! اسی لیے سمجھا جاتا ہے کہ نعمت کی آزمائش مصیبت کی آزمائش سے زیادہ سخت ہوتی ہے، خوشی کا فتنہ تکلیف کے فتنہ سے بہت بڑا ہوتا ہے! صاف بات ہے اگر گناہوں پر قدرت ہونے کے باوجود ان سے رک جانا یا صبر کرنا بہت دشوار ہوتا ہے! عیش و آرام سے انسان کا جسم فربہ ہونے لگتا ہے عیش و آرام بغیر اس کو صبر نہیں آتا اور دوامِ عیش اسی وقت ممکن ہے جب اس کے حصول میں وہ لوگوں سے مدد چاہے اور ظالموں سے التجا کرے اور یہ امور نفاق، کذب، ریا، بغض، دشمنی کا سبب ہو جاتے ہیں اور ان سے تمام روحانی مہلکات پیدا ہوتے ہیں، قلب کے سارے امراض جنم لیتے ہیں، اسی لیے صادق مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے[1]!"

جب انسان نعمت و عافیت کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ عموماً حق تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے، ازدیادِ دولت کی تدبیریں، اپنے بچاؤ کا خیال، مال کی حفاظت کا بندوبست، اس کے خرچ کرنے کا انتظام، یہ تمام امور اس کے قلب پر ہجوم کرتے ہیں، اور یہ سب اس کے

[1] حب الدنیا راس کل خطیئۃ (رواہ البیہقی فی الشعب وابن ابی الدنیا)

دل کو سیاہ کرتے اور حق تعالیٰ کی یاد سے غافل کرتے ہیں جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا:

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ۔ غفلت میں رکھا تم کو بہتات کی حرص نے یہاں تک کہ تم قبرستانوں میں پہنچ جاتے ہو!

اسی لیے عیش سے بچنے کی ہدایت فرمائی گئی۔ حضور انور صلعم نے معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ "تم تنعم سے بچو، کیونکہ اللہ کے بندے عیش کرنے والے نہیں ہوتے (اِنَّ عِبَادَ اللّٰهِ لَيْسُوْا بِالْمُتَنَعِّمِيْنَ)

سچ ہے کہ نعمت کا فتنہ مصیبت کے فتنہ سے بہت زیادہ سخت ہوتا ہے اور نعمت و مصیبت ہر دو ہمارے لیے ابتلا یا آزمائش ہیں! اسی حقیقت کو قرآن حکیم میں حق تعالیٰ اس طرح ادا فرما رہے ہیں:

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اُمَمًا مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (پ ۹ ع ۱۱) ہم نے دنیا میں ان کی مختلف جماعتیں کر دیں۔ ان میں سے بعض نیک تھے اور بعض اور طرح کے اور ہم ان کو خوش حالیوں اور بدحالیوں سے آزماتے رہے کہ شاید باز آجائیں۔

اسی طرح فرمایا:۔

وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً (پ ۳۶) اور ہم تم کو بری بھلی حالتوں سے اچھی طرح آزماتے ہیں۔

نعمت و عافیت کی حالت میں مرد مومن مشکور رہتا ہے، یہی اس حالت کا ادب ہے۔

اَلْمُؤْمِنُ مَشْكُوْرٌ عِنْدَ الرَّخَاءِ مومن چین کی حالت میں حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔

دل و زبان و اعضا کے شکر ہی سے نعمتیں سلب و نقصان سے محفوظ ہوتی ہیں اور ان میں اضافہ ہوتا ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ اگر تم شکر کرو تو یقیناً ہم نعمتوں میں اضافہ کرتے ہیں

خوب سمجھ لو کہ اجابتِ دعا، رزق و غنا، توبہ و مغفرت کا انحصار اپنی مرضی پر رکھا ہے کہ چاہا تو دیا، چاہا تو نہ دیا، لیکن شکر کے معاوضہ میں زیادتی نعمت بلا تخلف ہے! اسی لیے حضور انور صلعم

نے فرمایا:

مَنْ نَزَلَتْ اِلَیْہِ نِعْمَۃٌ فَلْیَشْکُرْھَا جس کو نعمت ملے وہ اس کا شکرادا کرے!

نیز فلیکثر الدعاء عِنْدَ الرَّخَاءِ چین و آسائش کی حالت میں زیادہ دعا کرتے رہو

زندگی کے تجربے، حادثے، تغیر و تحول ہماری آزمائش، ہماری سیرت کی تعمیر و تکمیل، ہماری صلاحیتوں کو بیدار کرنے، بالقوی کو بالفعل کرنے ہی کی غرض سے رونما ہو رہے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں ملائم و ناملائم اور انسان کے نفس کی بھی دو حالتیں ہیں، تیسری حالت نہیں۔ ایک عافیت دوسری بلا، ناملائم یا دردناک حادثات کا ورود اس لیے ہوتا ہے کہ ہم کجروی سے باز آجائیں، شہوتوں کے اتباع سے رک جائیں، سیرت کی اصلاح کرلیں! سوہانِ قضا ہمارے پیکرِ خاکی کو پختہ و ہموار بناتا ہے، اس کی کمی و خامی کو غم و الم کے انگارہ سے دور کرتا ہے، بقول اقبال:

جہانِ ما کہ جز انگارہ نیست   اسیرِ انقلابِ صبح و شام است

زسوہانِ قضا ہموار گردد   ہنوز ایں پیکرِ گل ناتمام است

نفس کی اس حالت کو بلا و مصیبت کی حالت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ملائم یا نعمت و عافیت کے حالات سے بھی ہماری آزمائش ہوتی ہے، اگر ہم ان حالات میں یادِ حق سے غافل نہ ہو جائیں، اپنا رُخ حق تعالیٰ ہی کی جانب رکھیں، ان کی نعمتوں کو ان کی مرضی کے مطابق استعمال کریں تو ہم اپنے باطن میں یہ ندا سنتے ہیں:-

اُرْکُضْ بِرِجْلِكَ ھٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ (پ۲۳ ع۱۳)   اپنا پاؤں مارو یہ نہانے کا ٹھنڈا پانی ہے اور پینے کا۔

یعنی ہم حق تعالیٰ کی رحمت و رافت، لطف و منت کے دریا سے سیراب ہوتے ہیں، ہم پر ان کی نعمت و ناز و محبت کے دروازے کھل جاتے ہیں، ظاہر و باطن کی نعمتیں ہم پر تمام کردی جاتی ہیں اور حق تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے ہماری پرورش و پرداخت کرتے ہیں اور یہ حالت موت کے وقت تک باقی رہتی ہے اور موت کے بعد وہ اپنے فضل و کرم سے ایسی نعمت عطا

کرتے ہیں جس کو کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کان نے سُنا اور نہ کسی کے دل پر اس کا خطرہ گزرا ہے۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (السجدہ ۲۶)

نا ملائم یا دردناک واقعات و حادثات پر غالب کرنے کا طریقہ تعطل، عجز، کسل، جبن، بزدلی، ماتم و سینہ کوبی نہیں، نہ مزاحمت و مقابلہ، سرکشی و سب و شتم ہی ہے بلکہ جیسا کہ اوپر وضاحت کی گئی ان حادثات کے سبق ہدایت سے مستفید ہونا، صبر و استقامت، حکمت و عقلمندی سے اپنی سیرت و اخلاق میں تغیر پیدا کرنا ہے! ہم میں سے اکثر کے لیے اس امر کا اعتراف سخت مشکل ہے کہ ہماری زندگی میں جو کچھ بھی درد و غم، اندوہ و الم کی صورت میں وقوع پذیر ہو رہا ہے اس کی اصلی علت خود ہمارے النفس میں پوشیدہ سرگرم عمل ہوتی ہے، شیخ محی الدین اکبرؒ کی یہ تہدید کہ "یداک کسبتا وفوک نفخ" یہ تیرے دونوں ہاتھوں کی کمائی ہے اور تیرے منہ کی مانگ ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتی اور ہم الزام زندگی پر رکھتے ہیں، حق تعالیٰ پر تہمت لگاتے ہیں یا اپنے ہم جنسوں کو متہم ٹھہراتے ہیں، اور اس سبق کو سیکھنے سے انکار کرتے ہیں جو حادثات والمناک واقعات کے ذریعہ حق تعالیٰ کی لا انتہا ہی حکمت ہمیں سکھلانا چاہتی ہے۔ ہم ٹوٹے ہوئے دل لے کر چیخ اُٹھتے ہیں کہ "لوگو! دیکھو، میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جا رہا ہے! ایک مصیبت ختم نہیں ہونے پاتی کہ دوسری اس سے زیادہ آفت مجھ پر نازل ہوتی ہے!

بتلاؤ میرا کیا قصور ہے؟ یہ سب میری تقدیر کا نوشتہ ہے! ہائے تقدیر!

طالعے دارم آنکہ از پے آب ‏ ‏ گر روم سوے بحر بر گردد
در بدوزخ روم پے آتش ‏ ‏ آتش ہا زیخ فسردہ تر گردد
ور زکوہ التماس سنگ کنم ‏ ‏ سنگ نایاب چوں گہر گردد
گر سلامے برم بہ نزد کسے ‏ ‏ ہر دو گوشم بحکم کر گردد
در بصحرا روم بجستن خاک ‏ ‏ خاک حالی بہ نرخ زر گردد
ایں چنیں حالہا بہ پیش آید ‏ ‏ ہر کرا روزگار بر گردد

(۲) [illegible]

مرزا لطف اللہ [illegible]

لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ ہمارے روحانی ارتقا کے لیے جن حالات کی ضرورت ہے ہم خود انہیں اپنی طرف جذب کرتے ہیں، ان تمام بلاؤں اور آفتوں کا باعث خود ہم ہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جامع و مانع الفاظ میں ہماری "ھوی متبع و شح مطاع" (خواہشاتِ نفسانی جن کا اتباع کیا گیا اور وہ مرض جس کی پیروی کی گئی ہے) جب ہماری آنکھوں سے غفلت کا پردہ اٹھ جاتا ہے اور ہماری سمجھ میں آجاتا ہے کہ "از ماست کہ بر ماست" "از ما خیزد بر ما ریزد" اور زندگی میں کامل انصاف ہے تو پھر ہم چیخ اٹھتے ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْئًا وَّلٰکِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ (یونس ۶)

بے شک حق تعالیٰ لوگوں پر ظلم نہیں کرتے لیکن لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

اب ہم اپنا رخ حق تعالیٰ کی طرف کر لیتے ہیں "انصار اللہ" بن جاتے ہیں، حق تعالیٰ کی مخالفت ترک کر دیتے ہیں، ان کے قائم کردہ حدود سے تجاوز نہیں کرتے، ان کے قوانین کی پابندی کرنے لگتے ہیں، اسی میں ہماری عظیم الشان کامیابی ہے!

ماحول پر غالب آنے کا بس یہی طریقہ ہے کہ ہم اپنے قلب کا جائزہ لیں اور خارجی مشکلات و آفات کے اسباب و علل کی تلاش "انفس" میں کریں۔ اگر ہم دیکھیں کہ حق تعالیٰ کی محبت سے ہمارا قلب عاری یا خالی ہے، دنیوی لذتوں اور شہوتوں سے مملو ہے، اس کے کرّوفر پر گرویدہ ہے، اس کے رنگ و بو پر فدا، اس کے "خندۂ گریہ آمیز" پر قربان، تو ہمیں اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہنا چاہیے کہ

فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا وَلَا یَغُرَّنَّکُمْ بِاللّٰہِ الْغَرُوْرُ (پ ۲۱ ع ۱۲)

سو تم کو دنیوی زندگی دھوکہ میں نہ ڈالے اور تم کو دھوکہ باز شیطان اللہ سے دھوکہ میں نہ ڈالے۔

اور "انفس" کے تغیر کی طرف فوراً متوجہ ہونا چاہیے اور اس وقت کے انتظار میں نہ رہنا چاہیے جب آفات کا نزول ہونے لگے اور ہمیں مجبوراً ایسا کرنا پڑے۔ عموماً یہی ہوتا ہے کہ ہماری سیہ کاری کی وجہ سے ہمارے قلب کی محبوب ترین چیز ہم سے چھین لی جاتی ہے، اور اس وقت ہم شدتِ حزن و

فرطِ غم سے ہر چیز سے ٹوٹ کر حق تعالیٰ کے قدموں پر گر جاتے ہیں اور ہمارے قلب سے یہ چیخ نکلتی ہے۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ تَسْمَعُ کَلَامِیْ وَتَرٰی	اے اللہ تو میری بات کو سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا
مَکَانِیْ وَتَعْلَمُ سِرِّیْ وَعَلَانِیَتِیْ	ہے اور میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے، تجھ سے میری
لَا یَخْفٰی عَلَیْکَ شَیْءٌ مِّنْ اَمْرِیْ	کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی، میں مصیبت زدہ ہوں
وَاَنَا الْبَائِسُ الْفَقِیْرُ المستغیث	محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناہ جو ہوں ترساں
المستجیر الوجل المشفق المقرّ	ہوں، ہراساں ہوں، اپنے گناہوں کا اقرار کرنے
المعترف بِذَنْبِیْ اَسْئَلُکَ	والا ہوں، اعتراف کرنے والا ہوں، تیرے آگے
مسألۃ المسکین وابتھل الیک	سوال کرتا ہوں جیسے بیکس سوال کرتے ہیں، تیرے
ابتھال المذنب الذلیل وادعوک	آگے گڑگڑاتا ہوں جیسے گنہگار ذلیل و خوار گڑگڑاتا
دُعَاءَ الْخَائِفِ الضریر ودعاء	ہے اور تجھ سے طلب کرتا ہوں جیسے خوف زدہ آفت
من خضعت لک رقبتہ و	رسیدہ طلب کرتا ہے اور جیسے وہ شخص طلب کرتا ہے جس
فاضت لک عبرتہ وذلّ لک	کی گردن تیرے سامنے جھکی ہوئی ہو اور اس کے آنسو
جسمہ ورغم لک انفہ اللّٰھم	بہہ رہے ہوں اور تن بدن سے وہ تیرے آگے فروتنی
لا تجعلنی بدعائک شقیا وکن	کیے ہوئے ہو اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو، اے
لی رءوفا رحیما یا خیر المسئولین	اللہ تو مجھے اپنے سے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ اور میرے
ویا خیر المُعطین!	حق میں بڑا مہربان نہایت رحیم ہو جا! اے سب مانگے
(کنز العمال عن ابن عباسؓ وعبد اللہ بن جعفرؓ)	جانے والوں سے بہتر اے سب دینے والوں سے بہتر!

بلا کے نزول کے بعد ہم وہی کرتے ہیں جو نزول سے پہلے بھی رضا و رغبت کے ساتھ کر سکتے تھے، غم و الم کے انگارے سے جھلسنے کے پہلے اگر ہماری عبدیت کی یہی کیفیت ہوتی تو ہم پر یہ عذاب ہی نازل نہ ہوتا:

مَا یَفْعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ — اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر کرو

وَاٰمَنْتُمْ وَکَانَ اللّٰہُ شَاکِرًا اور ایمان لے آؤ اور اللہ تعالیٰ بڑی قدر کرنے والا

عَلِیْمًا۔ (پ ۸۶) اور خوب جاننے والا ہے!

عذاب یا دردناک تجربوں اور مصیبتوں سے بچنے کا طریقہ "ایمان و شکر" ہے، عقیدہ و عمل ہے ایمان باللہ، و عمل صالح ہے، یعنی "نفس" کا تغیر ہے، نقطہ نظر کا بدلنا ہے، سیرت کی اصلاح ہے تقویٰ کا پیدا کرنا ہے، حق تعالیٰ کا دامن پکڑنا ہے، ان کی ہدایتوں پر عمل کرنا ہے، ان کے بتلائے ہوئے طریقوں پر چلنا ہے، ہم خود اپنے ہاتھوں اپنی عافیت کے خرمن میں آگ لگاتے ہیں، ہم خود اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں، ہم خود اپنی جانوں کے دشمن ہیں، ہمارے سوا ہمارا کوئی دشمن نہیں، شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ نے اس حقیقت کو خوب لکھا ہے:

آتش بدو دستِ خویش در خرمنِ خویش چوں خود زدہ ام چہ نالم از دشمنِ خویش

کس دشمن من نیست منم دشمنِ خویش اے وائے من و دستِ من و دامنِ خویش

اسی لیے حق تعالیٰ نے جو ہمارے مولیٰ ہیں اور سب سے زیادہ خیر خواہ ہیں، ہم سبھوں کو اگلوں اور پچھلوں کو ایک ہی وصیت فرمائی ہے اور وہ یہی ہے کہ ہم تقویٰ کی زندگی بسر کریں۔

وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا واقعی ہم نے ان لوگوں کو بھی حکم دیا جن کو تم سے پہلے

الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَاِیَّاکُمْ کتاب ملی تھی اور تم کو بھی کہ حکم خداوندی کی اطاعت کرو اور

اَنِ اتَّقُوا اللّٰہَ (پ ۱۶۶) اس کی مخالفت سے بچو یعنی تقویٰ کی زندگی اختیار کرو

کامیاب زندگی کا قرآنی تصوّر[1]

ع تقصیر مکن دانۂ خود را شجرے کن (صائب)

کامیاب زندگی! کتنا پاکیزہ، کتنا بلند نصب العین ہے، زندہ دلوں کا مقصود ہے، مطلوب ہے، محبوب ہے، اس کے چہرۂ زیبا سے ذرا نقاب تو اُٹھا دو، دن کی پوری روشنی میں اس محبوب کے خد و خال نظر آئیں اور ہم چیخ اٹھیں ؎

دستے کہ پیکر نو بدیں آب و تاب ریخت گرد رہت بر آئینۂ آفتاب ریخت (بیخود موہانی)

ورنہ بقول عرفی "خواب نا دیدہ" کی تعبیر تو کچھ بے معنی چیز ہوگی۔

کامیابی کا لفظ آپ اپنا مفسر ہے، مقصود کا پانا کامیابی ہے، زندگی وہ کامیاب ہے جو اپنے مقصود سے ہم آغوش ہے، اب زندگی کا مقصود کیا ہے؟ بچوں کو سادہ زبان میں سمجھا کر اس سوال کا جواب پوچھو، تو وہ کھیل کود، تماشا، لہو و لعب ہی کو مقصودِ زندگی قرار دینگے۔ لیکن جب یہ بچپن کی منزل سے گزر کر جوانی کی دلفریب وادی میں قدم زن ہوتے ہیں، تو اب ان کا مقصود نئی صورت میں جلوہ افروز ہوتا ہے، اب وہ زیب و زینت و آرائش و زیبائش اور تفاخر کو غایتِ حیات قرار دیتے ہیں، اور اس سے حاصل ہونے والی لذت کو تمام "اقدار" سے بالاتر! التباس کا یہ زمانہ بھی گریز پا ہوتا ہے، اور وہ بہت جلد زینت و تفاخر کو بچپن کی بے معنی خواہش سمجھنے لگتے ہیں۔ جب ان کی عقلوں میں پختگی پیدا ہونے لگتی ہے تو پلٹ کر اپنی حالت پر نظر ڈالتے ہیں، اور کہہ اُٹھتے ہیں

اے آنکہ تمام آرزو ہوسی طفلی مستی مخبطی خود چہ کسی! (ربیع واعظ)

[1] مطبوعہ معارف ۱۹۴۳ء

اب زینت و آرائش سے زیادہ ٹھوس قیمتوں کی طرف ان کی نگاہیں اُٹھنے لگتی ہیں، وہ مال و دولت کے تکاثر، جاہ و مرتبت کے ترفع کو اپنی زندگی کا مقصود قرار دیتے ہیں، اور بچپن اور نوجوانی کی خام آرزوؤں کو خبط اور مستی سے تعبیر کرتے ہیں، پختہ عقل کی پسند کی ہوئی یہ قیمتیں اب ان کا نصب العین ہوتی ہیں، انہی کے حصول میں وہ شب و روز سرگرم عمل رہتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ بس ان کو پاکر وہ سارے عالم سے غنی ہو جائینگے، طمانیتِ قلب ان کو میسر ہو گی، اور راحتِ جان نصیب! اسی مغالطہ میں ان کی زندگی کے مختصر و معین دن گزرتے جاتے ہیں، رنج و راحت کی مقدار مقدر انہیں ملتی ضرور ہے لیکن امل کی درازی اور عمر کی کمی، بالآخر ان کی زبان سے یہ کہلواتی ہے

شد عمر تمام و ناتمامیم ہنوز　　　در دولتِ حسرتیم و خامیم ہنوز
عمریست کہ در راہ طلب گام زنیم　　　ویں طرفہ کہ در نخست گامیم ہنوز　(مومن یزدی)

پیری کی منزل میں قدم رکھ کر انسان کی بصیرت میں عموماً روشنی پیدا ہو جاتی ہے، اب وہ زندگی کے مختلف تجربات سے واقف ہو جاتا ہے، ان کے تمام التباسات کو جاننے لگتا ہے اور نظر کا دھوکا جس کا ہر قدم پر جوانی میں وہ شکار ہو رہا تھا، اب اس سراب کو آب، خوب کو خراب عطر کو شراب کہنے اور سمجھنے پر مجبور نہیں کرتا، اب وہ اشیاء کے حقائق کا کسی قدر عارف ہو جاتا ہے، زندگی کے گوناگوں تجربات کا ذخیرہ تصورات کی شکل میں اس کے حافظہ میں محفوظ ہوتا ہے، ان ہی سے کام لے کر وہ زندگی کی ماہیت سے واقف ہو جاتا ہے، اس کا تخیل زندگی کو ہری بھری کھیتی کے مشابہ پاتا ہے جس کی چند روزہ رونق و بہار نظر فریب ہوتی ہے، دلکش ہوتی ہے ہوش ربا ہوتی ہے، فریب خوردہ عقل اس کو دائمی اور مستقل سمجھتی ہے، اس کی پرستش کرنے لگتی ہے، اس کو اپنا مطلوب بنا لیتی ہے، اور اس کی گرویدہ ہو جاتی ہے، یکایک اس کھیتی کا رنگ بدلنے لگتا ہے، یہ زرد پڑ جاتی ہے، آدمی اور جانور اس کو روند کر چورا کر دیتے ہیں۔ کَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ!

احوالِ جہاں و اصلِ این عمر کہ ہست   خوابے و خیالے و فریبے و دمے است (خیام)

قرآن کریم نے اس حقیقت کو چند پاکیزہ جملوں میں یوں ادا کیا ہے :-

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ	تم خوب جان لو کہ دنیوی حیات محض لہو و لعب اور
وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ	زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اموال
فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ	و اولاد میں ایک دوسرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا
اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ	ہے جیسے مینہ ہے کہ اسکی پیداوار کاشتکاروں کو اچھی
مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا (پ ۲۷ ع ۱۹)	معلوم ہوتی ہے پھر وہ خشک ہو جاتی ہے، تو اس کو زرد
(ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانوی)	دیکھتا ہے، پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے

بہتوں کے لیے زندگی کا مقصود یا تو لہو و لعب ہے یا زینت و تفاخر، یا تکاثرِ اموال و اولاد، فلسفیانہ و اصطلاحی زبان میں اس کی تحلیل کرو تو معلوم ہوگا کہ اہلِ دنیا برترین اقدار یا تو لذت کو قرار دیتے ہیں یا دولت کو یا شہرت کو، اور دولت و شہرت سے بھی ایک قسم کی لذت و راحت ہی مطلوب ہوتی ہے، اور ان کے نزدیک کامیاب زندگی سے مراد وہ زندگی ہے جو ان اقدار کی تحقیق میں کامیاب ہوتی ہے۔ ہمیں ذرا سنجیدگی سے یہاں زندگی کے ان اقدار یا غایات کا امتحان کرنا ہے ع

ہشدار کہ راہ خود بخود گم نہ کنی

کیا لذت مقصودِ زندگی ہو سکتی ہے ؟ کیا ہم لذت اندوزی اور دل خوشی کے لیے پیدا ہوئے ہیں ؟ کچھ مفکرین کا یہ خیال ضرور رہا ہے، مسٹر وڈورس کا خیال تھا کہ ہر اچھی چیز کا تعلق شکم سے ہوتا ہے اور فرائڈ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات کا محور و مرکز آلۂ تناسل ہے، سائرینی مذہب کا بانی ارس ٹپس لذت ہی کو مقصودِ حیات قرار دیتا ہے۔ اپنے پیروؤں کو اس

لہ اور انسان کی حالت مکھی سے بہتر نہیں جو ہمیشہ حلوے ہی کی شیفتہ ہوتی ہے۔

ہر جا کہ مگس پرو جہ بالا و چہ پست   جز شیفتۂ بودۂ حلوا نیست (سحابی استرآبادی)

اس کی تلقین تھی ؎

ہمچو منت اعتقاد باید کردن　　　می خوردن و اندوہ جہاں ناخوردن

اپیکورس خوش باشوں کا بادشاہ اپنی اخلاقیات کا اولین محرک جلب لذت اور دفع الم قرار دیتا ہے، لیکن اتنی بات مسلم ہے کہ لذت کو خیر برتر قرار دینے سے پیکورس کی مراد کسی عیاش کی لذتوں سے تھی نہ شہوانی تعیشات سے بلکہ بدن کا درد والم سے اور روح کا پریشانی وغم سے نجات دلانا اس کے پیشِ نظر تھا، فرصت کی زندگی ہو، آلام و افکار سے نجات ہو، دوستی و محبت کا لطف ہو، فلسفے کا مطالعہ ہو، یہ تھے لذت کے تضمنات پیکورس کے خیال میں: خیام کی زبان میں ان کو اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے ؎

تنگے مئے لعل خواہم و دیوانے　　　سدِّ رمقے باید و نصفِ نانے
وانگہ من و تو نشستہ بہ ویرانے　　　خوشتر بود از مملکتِ سلطانے

خود خیام نے جہانِ بیوفا کا حاصل لذت کے سوا کچھ نہ پایا، صاحب نظر جب عالم پر غور کرتا ہے، ہر شے کا جائزہ لیتا ہے، تو اس کو خیام کی رائے میں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ؎

در عالمِ خاک از کراں تا بکراں　　　چندانکہ نظر کنند صاحب نظراں
حاصل زجہانِ بیوفا چیزے نیست　　　اِلّا مئے لعل و عارضِ خوش پسراں

ایک روز مرنا ضرور ہے "بے مونس و بے حریف و بے ہمدم و جفت" قبر کے گوشے میں سونا ضرور ہے، اور یہ بھی صحیح ہے گو ایک راز نہفتہ کہ ؎

ہر لالۂ پژمردہ نخواہد بشگفت!

تو پھر جلبِ لذت و دفع الم کے سوا زندگی کا مقصود ہو کیا سکتا ہے؟ 'لذتیت' کے اسی بنیادی اصول کو خیام قوت کے ساتھ پیش کرتا ہے ؎

کم خور غمِ روزگارِ ناساز شدہ　　　مے خور زکفِ ساقیِ دمساز شدہ
(دفع الم)　　　(جلب لذت)
کاں کز کس مادر آمد امروز بروں　　　فردا بینی بگون زن باز شدہ

کسی راستہ چلنے والے عامی کو روک کر پوچھو کہ وہ دنیا سے کیا چاہتا ہے؟ الفاظ کوئی استعمال کرے اس کا مدلول و مفہوم ہو گا وہی جو جلبِ لذت و دفع الم سے تم سمجھتے ہو! وہ درد و غم سے نجات چاہتا ہے، اور لذت و خوشی کا طلبگار ہے، اشیار کا اچھا یا بُرا ہونا اس کے نزدیک لذت بخش یا الم رساں ہونا ہے، وہ الم رساں و تکلیف دہ شے کو بُری سمجھتا ہے، اور لذت بخش اور فائدہ رساں چیز کو اچھی! اس کی خواہش کا انتہائی مطلوب کسی نہ کسی صورت میں لذت ہی ہوتی ہے! یہ ہے "نفسیاتی لذتیت" کے حامیوں کی تحقیق اور ادعا، اس نفسیاتی تحقیق سے قطع نظر کرکے کہ انسان ہمیشہ لذت ہی ڈھونڈھتا ہے، لذت ہی پر جان دیتا ہے، لذت ہی کو اپنا محبوب قرار دیتا ہے، یہ دعویٰ کہ انسان کو لذت ہی ڈھونڈھنی چاہیے لذت ہی کو اپنا مقصودِ حیات قرار دینا چاہیے، "اخلاقیاتی لذتیت" کے قائل پیش کرتے ہیں۔

ذرا غور تو کرو کہ کیا یہ بات صحیح ہے کہ انسان صرف لذت ہی کی خواہش کرتا ہے لذت ہی کی تلاش میں اس کے روز و شب بسر ہوتے ہیں؟ یا اس کو صرف لذت ہی کی تلاش کرنی چاہیے لذت ہی کو اپنی غایتِ قصویٰ قرار دینی چاہیے! کیا یہ صحیح ہے کہ

جہاں از پئے شادی و دل خوشی است نہ از بہر بیداد و محنت کشی است؟

یا سچی بات دراصل یہ ہے کہ

نہ آمدہ از پئے دل خوشی مگر از پئے رنج و محنت کشی؟

نیتفکّروا ولا نکونوا من المستعجلین!

لذتیت کی نفسیاتی شکل کا بطلان تو تم پر تھوڑے سے نفسیاتی غور و فکر سے خود ظاہر ہو جائیگا دیکھو بات یہ ہے کہ ہماری خواہشات کا مبدا دراصل ہماری احتیاجات ہیں، اشتہاآت ہیں، ہماری خالص انسانی اغراض ہیں جب ان احتیاجات وغیرہ کی تشفی ہوتی ہے، تو لذت نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے، لہٰذا کم از کم بعض مثالوں میں تم کو یہ ماننا ہی پڑیگا کہ ہماری خواہشات کا مطلوب اصل میں وہ اشیاء ہیں جن سے ان خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے، نہ کہ مجرد لذت، دیکھو ہمیں پہلے

بھوک لگتی ہے، اور پھر کھانے کی لذت حاصل ہوتی ہے، یعنی اوّل احتیاج، پھر اس کی تشفی اور نتیجہ کے طور پر لذت، یہی بات تمام لذتوں کے متعلق صحیح ہے۔ لذت ہماری احتیاجات کی تشفی کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے اور احتیاجات کا وجود تشفی سے مقدم ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جب اس طرح ہم لذت کی چاشنی سے واقف ہو جاتے ہیں تو بعض دفعہ لذت کی لذت ہی کی خاطر خواہش کرنے لگتے ہیں، مثلاً بھوک کی تشفی سے جو لذت حاصل ہوتی ہے، اس کو جان لینے کے بعد ممکن ہے کہ بغیر بھوک کے لذت ہی کی خاطر نگلنے لگیں، اور اس طرح دانتوں سے اپنی قبر اپنے ہی پیٹ کے اندر کھودنے لگیں، اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہر حالت میں ہماری خواہشات کا مطلوب لذت نہیں ہوتا، احتیاج کی تشفی، درد کی دوا، اشتہا کی تسکین ہر فرد چاہتا ہے، اور اس کے نتیجہ کے طور پر اُس کو لذت و فرحت محسوس ہوتی ہے، تو لذت بریڈلے کے الفاظ میں نام ہے تحققِ ذات یا تکمیلِ نفس کے احساس کا، کیونکہ فطری احتیاجات و اشتہاآت کی تشفی ہی سے ہماری ذات کی بڑی حد تک تکمیل ہوتی ہے، ان احتیاجات میں بدن و ذہن یا روح دونوں کی ضروریات شامل ہیں۔ انہی ضروریات کی تکمیل سے لذت پیدا ہوتی ہے، لہٰذا خواہش براہ راست لذت سے متعلق نہیں ہوتی لذت براہ راست معروض خواہش نہیں، اور نہ بذاتِ خود ہمارے لیے قیمت رکھتی ہے ہاں اس کو "مقیاس قیمت" قرار دیا جا سکتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح کہ تھرمامیٹر کا درجہ حرارت خود حرارت نہیں ہوتا، بلکہ مقیاس الحرارت ہوتا ہے، لذت ہر جسمانی و روحانی اقتضا کی تکمیل کے بعد لاحقہ کے طور پر نمودار ہوتی ہے لیکن خود کبھی مقصود بالذات نہیں ہوتی، اس لیے لذتیہ کا یہ کہنا کہ انسان صرف لذت ہی کی خواہش کرتا ہے، نفسیات کی رو سے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

اگر ہماری یہ سیدھی سادھی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے، تو خود تجربہ کر کے دیکھو، لذت کو مقصود بالذات قرار دو، اور اس کے حصول کی کوشش کرو۔ بہت جلد تم کو معلوم ہونے لگیگا کہ اس طرح لذت کا پانا اپنے سایہ کے پکڑنے سے زیادہ دشوار ہے، یہ عجیب بات ہے، اور ہر تجربہ کار لذت پرست کو شاید اس کا اقرار ہے، (فلاسفہ اس کو "استبعاد لذتیت" کے نام سے موسوم

کرتے ہیں) کہ لذت کی جتنی تلاش کرو اتنی ہی وہ بچ نکلتی ہے، جتنی زیادہ اس کی خواہش کرو اتنی ہی وہ کم ملتی ہے، اور جس قدر بے پروا اس کی طرف سے ہو جاؤ، اُسی قدر وہ تمہارے پیچھے دوڑتی ہے، پروفیسر ڈیوے کے یہ الفاظ حکیمانہ صداقت کے حامل ہیں :-

جب جذبہ کا رجحان باطن کی طرف ہوتا ہے، تو وہ اپنی فنا کا آپ باعث ہوتا ہے، اور اس کے نتیجہ کے طور پر انسان یا تو کلبیت اختیار کر لیتا ہے اور سرد ذوقی میں مبتلا ہو جاتا ہے، یا پھر ہر لحظہ نئی چیز کی تلاش میں رہتا ہے، جدید ترین احساس کا خواہشمند ہوتا ہے، جو اس کی پست اور درماندہ جذباتی فطرت کو اکسائے، اور اس میں نئے سرے سے جان ڈالے، اگر کوئی شخص محض حسی زندگی بسر کر کے اپنے وجود کے قوانین کو توڑتا ہے، اور ان اشیاء سے بے نیاز ہونا چاہتا ہے جن کے ساتھ یہ احساسات طبعاً پائے جاتے ہیں تو اس کی قوتِ احساس رفتہ رفتہ مضمحل ہو جاتی ہے، اور وہ اپنے مقصد کی شکست کا آپ باعث ہوتا ہے، وہ جذباتی خودکشی کا مرتکب ہوتا ہے[1]۔

اسی صداقت کا علم ہونے کے بعد سیرینیا اور اتباعِ ابیکورس نے یہ مان لیا کہ ایجابی لذت کا حصول انسان کے لیے ناممکن ہے، ان کی لذتیت میں قنوطیت کی جھلک پیدا ہو گئی اب وہ بجائے حصولِ لذت کے دفع الم کو مقصدِ حیات قرار دینے لگے، ابیکورس کا یہ قول مشہور ہے:

جو چیزیں زندگی کو مسرور بناتی ہیں، وہ نہ پیہم شرب مدام ہے اور نہ صنف نازک کی صحبت اور نہ مرغ و ماہی اور قیمتی ماکولات سے آراستہ کیے ہوئے دستر خوان بلکہ سنجیدہ و متین غور و فکر جو ہر عمل انتخاب و اجتناب کے اسباب و وجوہ کا امتحان کرتا ہے، اور ان بیہودہ خیالات و اوہام کو دور کرتا ہے، جو روح کی پریشانی اور اختلال کا باعث ہوتے ہیں[2]۔

سچ ہے :-

---

[1] نفسیات ص ۲۹۹ [2] دیکھو بیک ول کی کتاب The Source Book of Ancient Philosophy ص ۲۰۰ مقابلہ کرو راقم کی کتاب فلسفہ یاس ص ۸۹۔

اصلاحِ مزاج از ضروریات است یک تنقیۂ دماغ می باید کرد! (واقف)

ارس تی پوس کا مشہور پیرو ہگے سی یس (Hegasius) لذت کو مقصودِ حیات قرار دیتا ہے، اور اس کی طلب میں کوشاں ہوتا ہے، بہت جلد تجربہ اس کو سکھلاتا ہے کہ باغِ جہاں میں غم ہی کا تو میوہ ہر شخص کو نصیب ہوتا ہے، اور اگر کوئی بے غم ہے تو وہ بنی آدم نہیں، طرفہ جانور ہے!

عالم ہمہ در دست وعدہ میخواہد | از خوانِ کرم برگ و نوا میخواہد
کس بے حاجت نمی تواند دیدن | درویش غذا، شہ اشتہا میخواہد (سحابی استرآبادی)

جب لذت مقصودِ حیات اور وہ ناقابلِ حصول تو پھر زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی، دنیا استخوانِ بے مغز ہے، عاقل اس استخواں کو کتوں کے آگے پھینک دیتا ہے، موت کو زندگی پر ترجیح دیتا ہے، موت ہی میں راحتِ جان پاتا ہے، موت ہی سے سارے درد والم رفع ہو جاتے ہیں، اور غم وہم دور! ایجابی لذت ناقابلِ حصول، لیکن سلبی لذت ممکن اور وہ موت کے ذریعہ، لہذا

با چرخِ ستیزہ کار مستیز و برو | با گردشِ دہر در میامیز و برو!
یک کاسۂ زہر است کہ مرگش خوانند | خوش درکش و جرعہ در جہاں ریز و برو! (امیر ابوالحق)

یہ تھا استدلال ہگے سی یس کا، اور اس قوت واثر کے ساتھ یہ پیش کیا گیا، کہ لوگوں نے خودکشی شروع کر دی اور اس کو "داعی الی الموت" کا خطاب دیا، جو لوگ زندگی کا مقصدِ وحید لذت اندوزی اور ذواقیت کو قرار دیتے ہیں، انھیں اسی طرح استدلال کرنا پڑیگا۔

لذتیت سے قنوطیت ایک ہی قدم کا فاصلہ ہے، جب لذت پرستوں کا تجربہ یہ ہو تو بتاؤ کہ

با قحبۂ مستورہ لذت چہ کند کس؟

اخلاقیاتی لذتیت کے حامیوں کا یہ دعویٰ کہ لذت ہی کو زندگی کی غایتِ قصویٰ

قرار دینا چاہیے، دیوانگی نہیں تو کیا ہے؟ نہیں لذت زندگی کی غایت نہیں، عقلمند لذت کی ماہیت و مقام سے واقف ہوتا ہے، طیباتِ حیات کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا لیکن وہ زندگی کا مقصود لذت اندوزی نہیں قرار دیتا، مجرد لذت کا کبھی تعاقب نہیں کرتا اس کو موجِ سراب اور جوشِ حباب سمجھتا ہے، اور اس کے دھوکے میں نہیں آتا۔

اِنَّ اللبیب بمثلھا لا یخدع

وہ اپنے مقصود کے حصول میں سرگرمِ عمل ہوتا ہے اور مسرت خود سایہ کی طرح اس کا پیچھا کرتی ہے، مقصود کے حصول میں اس کا ہر عمل لطف انگیز، ہر حرکت فرحت بخش ہوتی ہی، جانتے ہو کہ یہ مقصود کیا ہے؟ رضائے حق! حق تعالیٰ ہی سے اس کو آرامِ جاں اور بردِ قلبی نصیب ہوتی ہے اور عارفِ روم کے ساتھ مل کر وہ لذتیں سے کہتا ہے ؎

گر گریزی بر اُمیدِ راحتے ہم از آنجا پیشت آید آفتے

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست جز بخلوت گاہِ حق آرام نیست

جب لذت مقصودِ زندگی نہیں تو کیا شہرت یا اشتہارِ خلق، جاہ و مرتبت، نام و نمود وہ اعلیٰ اقدار ہیں جن کا حصول زندگی کی غایت قرار دیا جا سکتا ہے؟ ہم میں سے بہت سارے ایسے ہیں جنہیں زبان کی لذت سے کان کی لذت زیادہ مرغوب معلوم ہوتی ہے، وہ اس لطیف لذت کے لیے اپنی تمام کثیف لذتوں کو قربان کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں، مصائب میں گرفتار ہونے سے نہیں گھبراتے، درد و غم برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، آفتوں اور خطروں کا مقابلہ کرتے ہیں، جب ان سے کہا جاتا ہے کہ شہرت کی قیمت بلا و مصیبت ہے تو بھی ان کی ہمت پست نہیں ہوتی، ان کے لیے شہرت غایت الغایات ہے، خیر برترین ہے، مطلق قیمت ہے، اضافی قیمت نہیں!

شہرت کی خواہش ہر انسان میں کسی قدر ضرور موجود ہوتی ہے، اس کا راز یہ ہے کہ انسان کا نفس تنقیص کو فطرۃً ناپسند کرتا ہے، اور علو و بلندی کو طبعاً پسند! بندہ ہونا اس کے

نفس پر شاق ہوتا ہے، ربوبیت طبعاً محبوب ہے، ہر شخص کے باطن میں وہ جذبہ موجود ہے جس کی تصریح فرعون نے اپنے اس قول سے کی تھی "أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ" اس کی رفعت کا جب لوگ اقرار کرتے ہیں، تو وہ خوش ہوتا ہے، بقولِ عارفِ روم، فربہ ہوتا ہے:۔

جانور فربہ شود از راہِ نوش آدمی فربہ شود از راہِ گوش

شہرت کا طالب دراصل لذت ہی کا پجاری ہے، اس کا معبود بھی ایک قسم کی لذت ہی ہے، وہ اپنے نفس کی کبریائی کا اعلان چاہتا ہے، تشہیر چاہتا ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے ہر قیمت کو ادا کرنے پر تیار ہوتا ہے۔

اب غور کرو وہ اپنی مسرت، اپنی بردِ قلبی کی عمارت کس بنیاد پر قائم کر رہا ہے، ہوا پر۔ تعریف جو خلق کی زبان سے نکل رہی ہے، وہ آخر ہوا ہی تو ہے، جس کا خفیف سا جھونکا بھی ہمارے بیمار شہرت کے دل کے غنچہ کو شگفتہ کر دیتا ہے، مگر کیا کوئی عقلمند اپنی مسرت کے قلعہ کو اس قدر کمزور بنیادوں پر قائم کریگا؟ کیا ہوا پر اس کا اقتدار ہے؟ کون جانتا ہے کہ آج ہوا کا رُخ کس طرف ہوگا؟ عوام کالانعام آج اپنے ہیرو کو اوجِ آسمان پر جگہ دیتے ہیں اور کل بغیر کسی وجہ کے خاکِ مذلت پر پٹک دیتے ہیں، آج تحسین و تصفیق ہے اور کل زجر و توبیخ، اور کچھ دن بعد مطلق ذہول اور فراموشی، یہ ہے المناک تجربہ تقریباً ان تمام پرستارانِ شہرت کا جنہیں عوام نے کچھ دن کے لیے بت بنا کر پوجا تھا، ولنگٹن واٹرلو کا فاتح اعظم نپولین کو شکست دیتا ہے، اپنے زمانہ کی تہذیب و تمدن کو غارت و برباد ہونے سے بچا لیتا ہے، عوام اس کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں، بطلِ اعظم کا خطاب دیتے ہیں، اور کچھ ہی دن بعد لندن کی گلیوں میں یہی مشتعل و غضب آلود مجمع پتھروں سے اس کے خود کو توڑ پھوڑ ڈالتا ہے جس کو ولنگٹن اپنی موت کے دن تک محفوظ رکھتا ہے۔ جولیس سیزر ایک دن دنیا پر حکومت کرتا ہے اور دوسرے دن احسان فراموش دوستوں کے ہاتھ موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا ہے۔ سکندرِ اعظم کی لاش تیس دن تک بے گور و کفن پڑی رہتی ہے، اس کو عزت کے ساتھ خاک کے سپرد کرنے کو

بھی کوئی نہیں ملتا، یہ ہے انجام ہر شہرت و رفعت کا!

گیرم پسر اکہ رستم دستام شدی | یا خسرو ئے نیمروز یا شام شدی
نہ زور بگور می تواں برد نہ زر | افسوس کہ کیمیائے اوہام شدی

شہرت کا اثر سیرت پر کیا ہوتا ہے؟ شہرت سے عجب وپندار پیدا ہوتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنی ہی ذات کو کبیر اور سارے عالم کو اپنے مقابلہ میں حقیر سمجھتا ہے! مقید ہو کر مطلق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، بندہ ہو کر خدا بنتا ہے، جب اس کو خدا سے ڈرایا جاتا ہے تو اپنے تکبر اور عزت کے گھمنڈ میں حدود اللہ سے تجاوز کرتا ہے۔ وَاِذَا قِیْلَ لَہُ اتَّقِ اللّٰہَ اَخَذَتْہُ الْعِزَّۃُ بِالْاِثْمِ (پ ۲ ع ۹) جس شخص کا دماغ اس قدر اُلٹ جائے اس کو مسرت وطمانیتِ قلبی کہاں نصیب ہو سکتی ہے؟ اس کو ہر قدم پر خلاف طبیعت عناصر سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، کوئی اس پر طعن کرتا ہے اور کوئی حسد، کوئی اس کو "قطرۂ آبِ گندہ" کہتا ہے، اور کوئی "ظرفہ جانور" اس کا ہر عیب دنیا کے سامنے نمایاں طور پر پیش کیا جاتا ہے، اس کی کوئی غلطی لوگوں کی نگاہوں سے چھپ نہیں سکتی شہرت کی وجہ سے گویا وہ آفتاب کے نیچے کھڑا ہوتا ہے، اور اس کا ہر نقص اب نمایاں ہی، اور بقول عارفِ روم اس کی حالت یہ ہوتی ہے۔

خشمہا و چشمہا و اشکہا ! | بر سرت ریزد چو آب از مشکہا!

ایک آرزوئے شہرت، تمنائے رفعت، خواہشِ علو اس کو ہزاروں غموں اور آفتوں میں مبتلا کرتی ہے، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ حق سے کٹ کر خلق سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے، اور خلق سے سوائے غم واندوہ کے اور کیا ہاتھ آسکتا ہے، وہ خلق کے قلوب کو ہمیشہ مسخر رکھنا چاہتا ہے، ان پر اعتماد کرتا ہے، سمندر کی موجوں پر گھر بنا رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ اساس پائدار اور مستقل ہے، فیا للعجب! خلق کے وعدوں سے وہ خوش ہوتا ہے، لیکن اس کی خوشی کی مدت ایک رات سے زیادہ نہیں۔

وعدۂ اربابِ دنیا ہمچو خوابِ احتلام | شب ہمہ شب عیش و عشرت باشد و فردا دو غ

ایسے احمق پر ترس آتا ہے، مگر اس کے مقصودِ حیات کو کوئی عاقل اپنی زندگی کا مقصود بنانا پسند نہیں کرتا۔

نہیں، ہم محض حصولِ جاہ کو زندگی کی غایت نہیں قرار دے سکتے۔ اس میں گو کسی قدر لذت ضرور ہے، لیکن یہ غیر مخلوط لذت نہیں، درد و آفت، رنج و مصیبت کا عنصر اس مرکب میں بہت زیادہ ہے، یہ انسان میں کبر و غرور پیدا کرتا ہے، اور متکبر نہ دنیا میں راحت و طمانیت پا سکتا ہے، اور نہ آخرت میں فوز و کامیابی، وہ دل کا اندھا ہوتا ہے، حق تعالیٰ کی نشانیوں کی پہچان سے محروم رہتا ہے، حق بات اس کو نظر نہیں آتی، حق کی طرف سے اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، جب دیدِ حق نہ رہے تو پھر اس میں پوست کے سوا رہ کیا جاتا ہے؟

آدمی دید ست وباقی پوست ست — دید آں باشد کہ دیدِ دوست است (رومی)

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (پ ۹ع ۶) — میں ایسے لوگوں کو اپنی نشانیوں سے برگشتہ ہی رکھوں گا جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں، جس کا ان کو کوئی حق حاصل نہیں۔

اسی کی طرف اشارہ ہے، اور اسی وجہ سے وہ حق تعالیٰ کا مبغوض ہو جاتا ہے۔ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ، جب دیدِ حق کھو چکا، حق تعالیٰ کا مبغوض قرار پا چکا، تو پھر اس کے ہلاک ہونے میں باقی کیا رہا۔ انانیت، اپنی ذات سے محبت اپنے ہی ذکر کے انتشار کی خواہش، اپنی ہی تعریف کی محبت اور اس سے پیدا ہونے والی لذت، یہی تو ہیں اجزا اس کی ہلاکت اور بربادی کے! اسی لیے نفس انسانی کے امراض سے پوری طرح واقفیت رکھنے والے حکیم نے فرمایا تھا کہ

اِنَّمَا هَلَاكُ النَّاسِ بِاتِّبَاعِ الْهَوٰى وَحُبِّ الثَّنَاءِ — ہویٰ وہوس کی پیروی اور اپنی تعریف و توصیف کی محبت لوگوں کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔

ایک اور طریقے سے اسی صداقت کا اظہار شدت کے ساتھ فرمایا گیا ہے۔

ذئبان ضاریان ارسلا فی ذربة	دو بھیڑیے حملہ کرنے والے جو بھیڑوں کے گلے
غنم لیسا باکثر فسادًا من حب	میں چھوڑ دیے جائیں اتنا نقصان نہیں کرتے
الشرف والمال فی دین الرجل	جتنا کہ شرف اور مال کی محبت مسلمان آدمی کے
(المسلم)	دین میں کرتی ہے۔

اسی حب الشرف سے ارادہ رفعت، یا ارادہ علو پیدا ہوتا ہے، اور جب تک انسان اس سے خالی نہیں ہوتا، اپنی آخرت درست نہیں کر سکتا۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ	یہ عالم آخرت ہم ان ہی لوگوں کے لیے خاص کرتے
لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا	ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا
فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (پ ۲۰ ع ۱۲)	اور نیک نتیجہ متقی لوگوں کو ملتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت خلیفہ عمر بن عبد العزیز اس آیت کو مرتے وقت پڑھتے تھے، یہاں تک کہ پڑھتے پڑھتے جان دی!

خوب سمجھ لو کہ ہم حصولِ کمال سے نہیں منع کر رہے ہیں، ہم علم میں منفرد با کمال ہونے کی آرزو کو جائز سمجھتے ہیں، ہم کمالِ حریت یعنی شہوات و جذبات سے آزادی، دنیوی ترددات سے نجات کو حقیقی کمال قرار دیتے ہیں، ہم حق تعالیٰ اور ان کے صفات و افعال، مالکیت و حاکمیت کے علم کو سب سے زیادہ اعلیٰ و حقیقی کمال سمجھتے ہیں، اور ہمارے عقیدے کی رو سے یہ علم یہ معرفت عارفین کے لیے مرنے کے بعد نور بنیگی[1]

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ	ان کا نور ان کے داہنے اور ان کے سامنے دوڑتا
يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا۔	ہوگا، یوں دعا کرتے ہونگے کہ اے ہمارے پروردگار
(پ ۲۸ ع ۲۰)	ہمارے لیے ہمارے اس نور کو آخر تک رکھ۔

---

[1] دیکھو مذاق العارفین ترجمہ احیاء العلوم جلد سوم ص ۲۷۹۔

اور جو اس نور معرفت سے بے بہرہ ہونگے ان کا حال اس شخص کا سا ہوگا، جو اندھیریوں میں پڑا ہے۔

کمن مثلہ فی الظلمات لیس بخارج منہا (پ ۸ ع ۲)	اس شخص کی طرح جس کی حالت یہ ہو کہ وہ تاریکیوں میں پڑا ان سے نکلنے ہی نہیں پاتا۔

ہم اس جذبہ کی مذمت کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے کمال کے پیدا ہونے کے بعد ایک شخص اپنی ذات کو کبیر اور سارے جہان کو حقیر و صغیر سمجھتا ہے، یا پھر کمال اس لیے حاصل کرنا چاہتا ہے کہ لوگوں کے دلوں اور جسموں پر حکومت کرے، اور اس سے حاصل ہونے والی لذت و خوشی کو اپنی زندگی کا مقصود قرار دے، اس خصوص میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا کی صورت میں سیدھے راستے کی تعلیم فرمادی تھی۔

اللّٰھم اجعلنی صبورًا و شکورًا و اجعلنی فی عینی صغیرًا و فی اعین الناس کبیرًا [1]	حق تعالیٰ مجھے صابر و شاکر بنا، مجھے اپنی آنکھوں میں صغیر رکھ اور لوگوں کی آنکھوں میں کبیر بنا۔

جب میں خود اپنی آنکھوں میں حقیر رہوں، اپنی بندگی و بیچارگی کو بھول نہ جاؤں، اپنی ظلمت و جہل سے باخبر رہوں، تو پھر مجھ میں نہ اپنی تعریف کی خواہش پیدا ہوتی ہے، اور نہ کبر کا مذموم جذبہ، اب حق تعالیٰ اپنے اس متواضع بندہ کو رفعت عطا فرماتے ہیں، اور حقیقی کمال سے حصۂ وافر، یہ بزرگی اور کمال کا عطیہ ہے اور اس کا استعمال معطی کے احکام کے مطابق ہی کیا جاسکتا ہے۔

مقصود حیات اگر شہرت یا اشتہارِ خلق نہیں تو کیا مال و دولت کو زندگی کی انتہائی غایت قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس امر میں شاید کسی کو ہم سے اختلاف نہیں ہوگا کہ مال ہمیشہ ایک ذریعہ ہے کسی غایت کے حصول کا، خود غایت نہیں، ہم نے ان غایات میں سے بعض پر اوپر بحث کی ہے، اور ان کو

[1] یہ دعا حضرت بریدہؓ کی روایت سے مسند بزار میں ملتی ہے۔

زندگی کا مقصود نہیں قرار دیا، یعنی اگر مال سے جاہ طلبی یا لذت اندوزی مقصود ہو تو پھر مقصود کے ابطال سے ذریعہ کا باطل ہونا بھی لازم آئیگا، اور اگر جائز مقصدِ حیات کے حصول میں یہ استعمال ہو تو پھر یہ ایک زبردست قوت ہے اور عظیم الشان نعمت ؎

مال را گر بہر دیں باشی حمول   نعم مالٌ صالحٌ گفتش رسولؐ

اب ہمیں زندگی کے حقیقی مقصد کے تعین کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ قرآن کریم کی ہدایت کی روشنی میں مقصودِ حیات کا تعین ضروری ہے، حق تعالیٰ کی معرفت اور ان کی عبادت جہان کی تخلیق کی غایت ہے۔ صریح ارشاد ہے، مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔[1]

عبادت بغیر عرفانِ حق کے ممکن نہیں، لہذا وحدتِ ذاتیہ حق کی معرفت اور اس کی عبادت کے سوا جہان کا کوئی مقصود نہیں، ہر نبی اور ہر رسول کے پیغام کا خلاصہ بس یہی تھا۔

يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (پ ۱۲ ع ۵)	اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود برحق نہیں۔

جامیؔ نے اس مقصود کو ان دل پذیر اشعار میں ادا کیا ہے: ؎

از زندگیم بندگیِ تست ہوس   بر زندہ دلاں بے تو حرام ست نفس

خواہد ز تو مقصودِ دلِ خود ہر کس   جامیؔ ز تو ہمیں ترا میخواہد و بس

زندگی کا مقصود، برترین مقصود، غایت الغایات حق تعالیٰ ہیں، ان کی یافت ہے، ان کی عبادت و بندگی ہے، ان کا عشق و محبت ہی، یا یوں کہو کہ ہماری ساری عبادت، ہمارا جینا اور ہمارا مرنا سب خالص حق تعالیٰ ہی کے لیے ہے:-

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (پ ۸ ع ۷) (ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی)	کہو کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو مالک ہے سارے جہان کا اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے اور میں سب ماننے والوں سے پہلا ہوں۔

[1] حضرت ابن عباس نے لیعبدون کی تفسیر لیعرفون سے کی ہے ۱۲۔

حق تعالیٰ ہمارے مقصود ہیں، اسی لیے ہمارے محبوب و مطلوب بھی۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ　　اور جو مومن ہیں اُن کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے۔ (پ ۲ ع ۴)

وہ ہماری جان و مال، فرزندوں سے زیادہ عزیز و محبوب ہیں۔

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم　　خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم

مقصود منِ خستہ زکونین توی　　از بہر تو میرم و برائے تو زیم

جب زندگی کا مقصود حق تعالیٰ ہیں، تو اب دیکھو کہ وہ ہماری اس زمینی زندگی کو کس طرح بسر کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ پہلے اجمال، پھر تفصیل۔

اجمالاً یوں سمجھو کہ جب حق تعالیٰ ہمارے معبود ہیں اور محبوب ہیں تو ہمارا کام ایسا ہونا چاہیے کہ وہ کسی نہ کسی طرح عبادت میں شامل ہو جائے، یعنی ان ہی کے امتثالِ امر میں ہو، ان ہی کی رضامندی و خوشنودی کے خاطر ہو، نفس و ہوا کی پیروی میں نہ ہو، یعنی لذت اندوزی کے لیے نہ ہو، عیش پرستی کے لیے نہ ہو، جاہ طلبی کے لیے نہ ہو، ہمارے قلوب پر مالکیت و حاکمیت اللہ کی ہو، غیر اللہ کی نہ ہو، اور ہمارے ہر فعل کا تعین امرِ حق سے ہو، نفس و شیطان کے حکم سے نہ ہو، ایسی زندگی قرآن کی اصطلاح میں تقوی کی زندگی ہے، اور یہی کامیاب زندگی ہے، اقبال کے تمہیدی الفاظ کا اس جگہ ذکر کرنا ضروری ہے، یہ اپنے الفاظ میں تقویٰ کی زندگی اور کامیاب زندگی کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں۔

دائے ملائے وائے ایں دیرِ کہن　　تیغ لا در کف نہ تو داری و نہ من

دل ز غیر اللہ بپرداز اے جواں　　ایں جہانِ کہنہ در باز اے جواں

تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن　　اے مسلمان مردن است ایں زیستن

مردِ حق باز آفریند خویش را　　جز بہ نورِ حق نہ بیند خویش را

بر عیارِ مصطفیٰ خود را زند　　تا جہانے دیگرے پیدا کند

اب ذرا تفصیل میں جا کر تقویٰ کی ماہیت کو اچھی طرح سمجھ لو۔ قرآن میں متقیوں کی تعریف اجمالاً یوں کی گئی ہے۔

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ	جو سچی بات لے کر آیا، اور جس نے اس کو سچ مانا،
بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔ (پ۲۴ ع۱)	وہی لوگ پرہیزگار یا متقی ہیں۔

جو سچی بات لے کر آیا وہ نبی اور جس نے سچ مانا وہ مومن و متقی، تقویٰ نبی کو سچ ماننا اور اس کی تصدیق کرنی ہے، حق تعالیٰ انبیاء ہی کے ذریعہ علم صحیح عطا فرماتے ہیں، انبیاء اللہ ہی کے علم کو پیش کرتے ہیں، اپنی طرف سے اس میں کسی قسم کی نہ زیادتی کرتے ہیں اور نہ کمی، جو لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں، اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں، وہی متقی کہلاتے ہیں۔

تقویٰ کی کچھ تفصیلات کو اس آیت میں پیش کیا گیا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ	کچھ سارا کمال اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو
الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ	کرلو یا مغرب کو، لیکن کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر یقین
اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ	رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتب پر
وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى	اور پیغمبروں پر اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں
حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَ	کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو، اور مسافروں کو اور
الْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ	سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں، اور نماز
وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى	کی پابندی رکھتا ہو، اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو، اور
الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا	جو اشخاص اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب
عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ	عہد کر لیں، اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں
وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ	تنگدستی میں اور بیماری میں اور قتال میں یہ لوگ ہیں
الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ	جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔
الْمُتَّقُوْنَ (پ۲ ع۶)	(ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانوی)

اس آیت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے، کہ تقویٰ کا انحصار چند عقائد، اعمال اور اخلاق پر ہے، عقائد میں اللہ پر، آخرت پر، ملائکہ پر، کتبِ منزلہ پر، اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ و السلام پر ایمان لانا داخل ہے، یہ تقویٰ کے اساس ہیں، عمل کا صدور ایقان و ایمان سے ہوتا ہے، متقی کے ایقانات جن کا نتیجہ اعمالِ صالح ہیں، یہ ہونے چاہئیں جن کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس کے بعد ان اعمال کی بھی کسی قدر تفصیل پیش کر دی گئی ہے۔ ان کی تین قسمیں کی گئی ہیں۔ انفاق، اقامتِ صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ، انفاق رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں سوال کرنے والوں کے لیے ہو، اور قیدیوں کے چھڑانے میں کیا جائے، انفاق کی شرطِ مقدم حق تعالیٰ کی محبت ہے، یعنی جو کچھ خرچ کیا جا رہا ہے، وہ ان ہی کی محبت میں خرچ کیا جا رہا ہے، ان ہی کی خوشنودی و رضا کی خاطر، اس لیے نہیں کہ نام ہو، شہرت ہو، لوگوں کی نگاہوں میں برتری حاصل ہو، اخلاق میں ایفائے عہد اور صبر کا خصوصیت کے ساتھ ذکر ہے، صبر تنگدستی میں، بیماری میں اور کفار کے ساتھ جنگ میں

تقویٰ کے متعلق دوسری تمام قرآنی تصریحات کو پیشِ نظر رکھ کر حضرت امام غزالیؒ اس کی جامع و مانع تعریف یوں کرتے ہیں کہ تقویٰ بچنا ہے ہر اس شئے سے جس سے دین میں ضرر کا خوف ہو، محاورۂ عرب سے بھی اس تعریف کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ جو بیمار پرہیز کرتا ہے اس کو عرب "متقی" کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ ہر مضر چیز سے خواہ کھانے کی ہو یا پینے کی بچتا ہے اسی طرح دین کا تقویٰ نواہی سے اجتناب ہے حضرت غزالی کی اس تعریف میں امتثالِ امور یا عبادت پر زور نہیں دیا جا رہا ہے، بلکہ صرف اجتنابِ محظور یا گناہوں سے پرہیز ہی کی تاکید کی جا رہی ہے۔ منہاج العابدین میں وہ کسی جگہ فرماتے ہیں، کہ عبادت کے دو بڑے حصے ہیں، ایک عبادت کرنا، دوسرا پرہیز کرنا، اور یہ آدھا حصہ یعنی گناہوں اور شبہات سے پرہیز انسان کے لیے پہلے آدھ حصہ یعنی عبادت سے زیادہ بہتر ہے، مبتدی عبادت کے حصہ پر زیادہ زور

لہ دیکھو سراج السالکین ترجمہ منہاج العابدین ص ۵، (مطبوعہ نولکشور)

دیتا ہے، اور کامل اہلِ بصیرت پرہیز کا حصّہ اختیار کرتے ہیں، اور ان کو ہر وقت یہ دھیان رہتا ہے کہ دل کو غیر اللہ کی طرف مائل ہونے سے بچائیں، لیکن اگر دونوں حصّے حاصل ہو جائیں یعنی عبادت و پرہیز تو کمال حاصل ہوتا ہے، اور سلامتی اور غنیمت میسر ہوتی ہے۔[1]

عبادت کے دونوں حصوں کا خیال رکھ کر تقویٰ کی جامع و مانع تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے، تقویٰ کفر و شرک و نفاق و بدعت[2] سے احتراز ہے، امتثالِ مامور، اجتنابِ محظور اور رضا بقدر ہے، متقی کا قلب ایمان و توحید و صدق سے آراستہ ہوتا ہے، سنت پر قائم ہوتا ہے، اوامر کا اتباع کرتا ہے، نواہی سے بچتا ہے، راضی برضائے حق رہتا ہے، اسی چیز کو حضرت غوث اعظم شیخ عبد القادر جیلانیؒ اس طرح ادا فرماتے ہیں[3]: لابد لکل مومن فی سائر احوالہ من ثلثۃ اشیاء، امرٌ یمتثلہ ونھی یجتنبہ وقدر یرضی بہ۔ یعنی ہر مومن کے لیے تمام احوال میں تین چیزیں ضروری ہیں، امرِ الٰہی بجا لائے، نہی سے اجتناب کرے، اور تقدیر پر راضی رہے۔ اتنی بات یہاں سمجھ لینی ضروری ہے کہ امرِ الٰہی دو طرح پر ہوتا ہے، ایک تشریعی، یہاں وظیفۂ عبودیت یہ ہے کہ اس امر کو بجا لائے، اور امر منفی کی صورت میں ممنوعات سے بچے، دوسرا تکوینی، یہاں بندگی کا وظیفہ یہ ہے کہ اس کو تسلیم کرے، رضا بالقضاء کا اشارہ اسی طرف ہے۔ بالفاظ دیگر جو حق تعالیٰ کہیں وہ کرے اور جس طرح وہ رکھیں اس طرح رہے اول عبادت ہے، اور ثانی "عبودیت" ایسی ہی زندگی تقویٰ

---

۱ دیکھو سراج السالکین ترجمہ منہاج العابدین ص۱۱۸ و ص۱۱۹

۲ احتراز کا ذریعہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے، ذات اللہ ہی کو الٰہ قرار دینا یعنی معبود و مستعان ماننا زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کرنا توحید ہے، اس اقرار سے شرک کا خروج ہو جاتا ہے اور توحید داخل ہو جاتی ہے، جس ذات پاک نے یہ پیغام ہم تک پہنچایا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کی رسالت کے اقرار سے دل سے کفر کا خروج ہو جاتا ہے، اور ایمان جلوہ افروز ہوتا ہے، اس کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار نفاق ہے۔ اس کی تصدیق کے بعد انکار ارتداد ہے۔ بدعت دین میں کسی نئی بات کا پیدا کرنا یا جو دین کی بات نہیں، اس کو دین سمجھنا ہے۔ مجملاً شرک کے جانے سے توحید، کفر کے جانے سے ایمان و نفاق کے جانے سے صدق، بدعت کے چھوڑنے سے سنت حاصل ہوتی ہے (دیکھو باب اول عبادت و استعانت'

۳ فتوح الغیب مقالۂ اول۔

کی زندگی ہے، اور ہر معنی میں کامیاب زندگی!

اب دیکھو، زندگی میں کامیابی و سُرخ روئی کے لیے کن صفات کی ضرورت ہے، جو متقی کی سیرت کا جزو ہیں، وہ حق تعالیٰ پر شدت سے ایمان رکھتا ہے، ان سے شدت سے محبت کرتا ہے، ان کو وہ خیرِ مطلق اور قدوس مانتا ہے، زندگی اور کائنات کا مبدء وہ حق تعالیٰ ہی کو جانتا ہے اور لازماً زندگی کو بھی خیر سمجھتا ہے، جب اس کے اعتقاد اور اذعان کی رو سے زندگی اچھی اور زندگی کے تجربات اچھے ہیں تو پھر وہ ان سے زندہ دلی اور جوش کے ساتھ تعاونِ عمل کرتا ہے، قنوطیت و یاس کا اثر اس کے قلب پر مطلق نہیں ہوتا، اس کی زندگی اور خارجی حالات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے، اس کو شادمانی و کامیابی نصیب ہوتی ہے۔

عارفِ رومی نے کہا تھا، انما التدبیر تبدیل المزاج[1] آدمی میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ عملی چیز کائنات کے متعلق اس کا نقطۂ نظر ہے[2] مومن کا کائنات کے متعلق نقطۂ نظر تم نے اوپر دیکھا کہ کیا ہے، اس کے نزدیک کائنات ایک قدوس و قادر و علیم مطلق ذات کی تجلیات کا مظہر ہے، اسی یقین کی وجہ سے وہ زندگی میں کامیاب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اپنے مزاج کی اسی خوشگوار تبدیلی کی وجہ سے وہ جہان کے ناموافق عناصر کو اپنے موافق بنا لیتا ہے، چارسوئے کائنات اس کو بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اقبال کے اس گمان کو صحیح کر دکھاتا ہے ؎

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا — عجب نہیں ہے کہ یہ چارسو بدل جائے

خالقِ کائنات و ربِ کائنات سے حسنِ ظن رکھنے کی وجہ سے کائنات بھی اس کے ارادے کے مطابق بن جاتی ہے اور انا عند ظن عبدی کی بشارت صحیح ہوتی ہے، وہ حق تعالیٰ سے راضی ہوتا ہے، تو حق تعالیٰ اس سے راضی ہوتے ہیں۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ کا قول سچا ہوتا ہے، صادق مصدوق ﷺ نے بھی تو اس کی خبر دی تھی۔ ان للّٰہ رجالاً

---

[1] تدبیر اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ مزاج ہی بدل جائے۔

[2] یہ جی کے چسٹرٹن کا مقولہ ہے جو انگلستان کا ایک مشہور ادیب گزرا ہے۔

یرضی برضاھم ویغضب بغضبھم کما انھم یرضوا برضائہ ویغضبوا بغضبہ، بعض رجال اللہ ایسے بھی ہیں، جن کی رضا سے حق تعالیٰ بھی راضی ہوتے ہیں، اور جن کے غصہ سے وہ بھی غضب فرماتے ہیں جس طرح کہ خود یہ مردانِ حق اپنے مولیٰ کی رضا سے راضی اور اس کی ناراضی سے خود بھی ناخوش ہوتے ہیں، متقی کی اس شان کو دیکھ کر کسی عارف کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے۔

فارغ بنشین وغم مخور و شادی بزی این معنی لاالٰہ الا اللہ است!

مومن متقی کے خمیر میں وہ سب عناصر موجود ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ ایک حقیقی معنی میں کامیاب زندگی بسر کرتا ہے، ان ہی کا خیال رکھ کر امام غزالی فرماتے ہیں کہ "جس نے تقویٰ اختیار کیا اس کے سارے ترددات رفع ہو گئے، اب وہ آرام سے جدھر چاہے سو رہے، بات اصل بھی سو حاصل ہو گئی، اپنی تائید میں وہ قتادہ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ توریت میں لکھا ہے کہ "اے فرزند آدم تقویٰ اختیار کر اور جدھر چاہ سو رہ!" مومن متقی مجاہد ہوتا ہے، سو نہیں رہتا۔ مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنی ناکامیابی کا اندیشہ نہیں، بالفاظ غوث اعظمؒ ساکن الجوارح، مطمئن الجنان، منشرح الصدر، منور الوجہ، عامر البطن، غنی عن الاشیاء بخالقہا[1] ہوتا ہے۔ لوگ اشیاء کی ملکیت کی وجہ سے خود کو غنی سمجھتے ہیں، وہ غنی بالشئے ہوتے ہیں، مجاہدِ متقی اشیاء سے بے نیاز ہوتا ہے وہ خود خالقِ اشیاء کو رکھتا ہے، اس لیے وہ غنی عن الشئی ہوتا ہے، اس کے ذل و افتقار کی نسبت حق تعالیٰ سے ہے، وہ حق تعالیٰ کا فقیر ہے، اشیاء سے غنی ہے، اس کے ہاتھ میں لاالٰہ الا اللہ کی شمشیر ہے، اسی لیے وہ فرمانروائے موجودات ہے[2]، اسی فقیری ہی کی وجہ سے اس کو امانت ملی، اور اس امانت کی وجہ سے خلافت عطا ہوئی اب وہ خلیفۃ اللہ ہے، اسی لیے

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفریں کارکشا و کارساز (اقبال)

---

[1] ساکن الجوارح (بلا حرکت اعضاء) اور قلب مطمئن اور فراخ و کشادہ سینہ، روشن چہرہ، باطن آباد اور تعلق خالق کی وجہ سے تمام چیزوں سے بے پرواہ (فتوح الغیب مقالہ ۲)

[2] ہر کہ اندر دستِ او شمشیر لاست ؎ جملہ موجودات را فرماں رواست (اقبال)

تم دنیوی نقطۂ نظر سے کامیاب زندگی کس قسم کی زندگی کو قرار دیتے ہو؟ وہی نہ جو آسمان وزمین کے برکات سے مالا مال ہو؟ دیکھو اس کا حصول ایمان وتقویٰ پر منحصر ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (پ ۹ ع ۲) — اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیز کرتے تو ہم اُن پر آسمان وزمین کی برکتیں کھول دیتے۔

ان برکات کے ساتھ پھر نہ رنج وتعب ہوگا نہ حزن وخوف۔

فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (پ ۸ ع ۱۱) — پس جو شخص تقویٰ اختیار کرے اور درستی کرے سو ان لوگوں پر نہ کچھ خوف ہی اور نہ حزن۔

کامیاب زندگی وہی ہے نا جس میں دشمنوں سے محفوظیت حاصل ہے؟ بشرط تقویٰ اس کا وعدہ کیا جارہا ہے۔

اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا (پ ۴ ع ۳) — یعنی تم استقلال اور تقویٰ کے ساتھ رہو تو ان لوگوں کی تدبیر تم کو ذرا بھی ضرر نہ پہنچا سکیگی۔

حق تعالیٰ کی معیت اور اعانت کی وجہ سے متقی غالب ومنصور ہوتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝ (پ ۱۴ ع ۲۲) — اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو متقی ہوتے ہیں اور نیک کردار ہوتے ہیں۔

کامیاب زندگی وہی ہے نا جس میں سختیوں سے نجات ہو، رزقِ حلال ہو، دیکھو اسی کا تو وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے۔ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ متقی کی نجات کی شکل حق تعالیٰ نکال دیتے ہیں اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دیتے ہیں، جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا (پ ۲۸ ع ۱۷) اس کے ہر کام کو آسان کر دیتے ہیں وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا (پ ۲۸ ع ۱۷)

اخروی نقطۂ نظر سے بھی متقیوں ہی کی زندگی کامیاب ہوتی ہے، کیونکہ وہ حق تعالیٰ کے

محبوب ہوتے ہیں اِنَّ اللہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ۔ ان ہی کی عبادت قبول ہوتی ہے۔

اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ۝ حق تعالیٰ متقیوں ہی کا عمل قبول کرتے ہیں۔

ان ہی کو حق تعالیٰ کے نزدیک بزرگی حاصل ہے:۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللہِ اَتْقٰکُمْ ۔ اللہ کے نزدیک سب میں بڑا شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار یا متقی ہو۔ (پ۲۶ ع۱۴)

ان ہی کے اعمال قبول ہوتے ہیں، اور گناہ معاف ہوتے ہیں:۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللہَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا یُّصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ (پ۲۲ ع۶) اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور راستی کی بات کہو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو قبول کریگا اور تمہارے گناہ معاف کر دیگا۔

دوزخ کی آگ سے ان ہی کو نجات ملتی ہے۔

وَیُنَجِّی اللہُ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ لَا یَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (پ۲۴ ۳۶) اور جو لوگ متقی ہیں حق تعالیٰ ان کو کامیابی کے ساتھ نجات دینگے، ان کو نہ تکلیف پہنچیگی اور نہ وہ غمگین ہونگے۔

ان ہی کے لیے بالآخر جنت ہے اور سامانِ عیش و عشرت:۔

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَعِیْمٍ ۝ (پ۲۷ ع۳) متقی لوگ بلاشبہ باغوں اور سامانِ عیش میں ہونگے

بہرحال مومن متقی کے لیے دونوں جہان کی خوشخبری ہے، دنیا کی خوشخبری، آرام و آسائش اور برکتیں، غم و خوف و حزن سے نجات، دشمنوں سے حفاظت اور حق تعالیٰ کی معیت و نصرت اور آخرت کی بشارت معاملۂ قبر، حساب و کتاب کا آسان ہونا، یعنی حبس و حسابِ قیامت سے رستگاری اور بخشش خداوند غفار و ستار پھر رَوح و ریحان و جناتِ نعیم[۱]

الا اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ یاد رکھو کہ اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ہی

[۱] راحت اور غذائیں ہیں اور آرام کی جنت (سورۂ واقعہ)

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۔ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۔ (پ ۱۱ع ۱۲)

اور نہ وہ مغموم ہوتے ہیں، وہ وہ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں، ان کے لیے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی خوشخبری ہے

دیکھو یہی راز ہے، جس کو پالینے کے بعد تمہاری سمجھ میں آجائیگا کہ کیوں حق تعالیٰ جو ہمارے مولیٰ ہیں اور سب سے زیادہ خیرخواہ، سب اگلے پچھلوں کو ایک ہی وصیت فرماتے ہیں، اور وہ یہی ہے کہ ہم تقویٰ کی زندگی اختیار کریں اور بس، بتاؤ تم زیادہ جانتے ہو کہ اللہ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ؟ وصیت ان الفاظ میں ہوئی ہے وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ (پ ۵ع ۱۶) واقعی ہم نے ان لوگوں کو بھی حکم دیا تھا جن کو تم سے پہلے کتاب ملی تھی اور تم کو بھی کہ تقویٰ اختیار کرو۔

مومن کی خصلت تقویٰ ہے اور یہ خصلت دنیا و آخرت دونوں کی جامع ہے اور سب کاموں کے لیے کافی! مومن جانتا ہے کہ ؎

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں!

اسی لیے وہ عشق و ایمان پر اعمال کی بنیاد رکھتا ہے اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ حق تعالیٰ کی تقویٰ سے متعلق یہ وصیتیں ہیں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے پہنچی ہے ان کی بات کا انکار کفر، ان کی بات میں شبہ نفاق، ان کی بات میں اپنی بات کا ملانا بدعت ہے اور ان کی بات کا جوں کا توں مان لینا ایمان ہے، اس لیے گو

تعلیم پیرِ فلسفۂ مغربی ہے یہ
نادان ہیں جن کو ہستیِ غائب کی ہو تلاش
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا؟

ہے شیخ بھی مثالِ برہمن صنم تراش

محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی

اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش

مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام

ہے جس سے آدمی کے تخیل کو ارتعاش

کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور

مجھ پر کیا یہ مرشدِ کامل نے راز فاش

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است

ہر چند عقلِ کل شدۂ بے جنوں مباش (اقبال)

آئیے اسی جنون یا عشق کی اپنے مولا سے التجا کریں :۔

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر | شریکِ زمرۂ لایحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں | مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

(اقبال)

قرآن اور علاجِ خوف[1]

اس مختصر مقالہ میں میں نے ایک خونخوار جذبہ سے نجات کے چند نفسیاتی اصول پر روشنی ڈالی ہے، جو اول سے آخر تک قرآن کریم سے ماخوذ ہیں۔ خوف سے میری مراد ماسوائے اللہ کا خوف ہے۔ میں خشیۃ اللہ کو کوئی قابلِ علاج چیز نہیں سمجھتا، معاذ اللہ، یہ تو عین مقصود ہے۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ اصول کو میں نے اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے، طول و تفصیلات کو ترک کر دیا ہے۔

دو روزہ عمر پُر ز خوف و خطر است　　از غصہ غذائے خلق خونِ جگر است

آسودہ دلی ز بعد مردن ہم نیست　　زیرا کہ خطرہ دراں طرف بسیار تر است

انسان کی دو روزہ زندگی خوف و خطر سے بھری نظر آتی ہے، اس کے قلب پر اس خونخوار جذبہ کا پورا تسلط دکھائی دیتا ہے، جب وہ بستر سے اٹھتا ہے تو لرزاں و ترساں اٹھتا ہے، اور تمام دن کے غم و غصہ کے بعد جب وہ پھر بستر کی طرف لوٹتا ہے، تو بھی خائف و ہراساں ہوتا ہے، وہ ڈرتا کس چیز سے ہے؟ کسی کو تو بیماری کا خوف ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بیمار ہو جائے اور دنیوی کامیابی کی ساری توقعات مٹی میں مل جائیں، جب کسی عزیز یا دوست کی بیماری کی خبر سُن لیتا ہے تو بے چین و پریشان ہو جاتا ہے، ڈرتا ہے کہ کہیں مر نہ جائے! کسی کو خوف ہے کہ وہ ساری دولت کھو کر فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہو جائے، ضعف و ذلت کا شکار نہ ہو جائے کسی کو اپنی ملازمت کی طرف سے خطرہ ہے، وہ حالات کو تشفی بخش نہیں پاتا، ڈرتا ہے کہ کہیں بہت جلد اس کو بے روزگاروں کی صف میں شریک ہونا نہ پڑے، ٹھکروں کو

---

[1] یہ مقالہ موتمر علوم اسلامیہ جامعہ عثمانیہ میں پڑھا گیا، اور پہلی مرتبہ معارف نومبر ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔

محتاج نہ ہو جائے، رزق کا دروازہ بند نہ ہو جائے، کوئی اپنی ذمہ داریوں سے گھبرا رہا ہے، یہ ناقابل برداشت نظر آ رہی ہیں، اور وہ محسوس کر رہا ہے کہ اس کی قوتیں زائل ہو رہی ہیں، اس کا دل بیٹھا جا رہا ہے، اور وہ اپنے بلند مقام سے گر رہا ہے، کوئی ہے کہ اپنے ہم جنسوں سے ملنے سے گھبرا رہا ہے، وہ ان سے گفتگو نہیں کر سکتا، خوف سے اس کی زبان سوکھی جا رہی ہے، اور پسینوں میں ڈوب رہا ہے، کوئی خوف زدہ ہے، لیکن نہیں جانتا کہ کس چیز سے خوف زدہ ہے، اس کو اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہے، خطرہ کا وہ تعین نہیں کر سکتا، لیکن خوف کی لہریں اس کے قلب میں اٹھ رہی ہیں اور وہ بزدلی کی موت مر رہا ہے، غرض خوف کا جذبہ عالمگیر ہے، ہر شخص اس کا شکار ہے، کون ہے جس کو فکر نہیں، غم نہیں، خوف نہیں، شیخ عماد الدین فضل اللہ نے جو بات غم کے متعلق کہی ہے، وہ خوف کے متعلق بھی صحیح معلوم ہوتی ہے، اور نفسیاتی طور پر غم نتیجہ ہے خوف کا۔

غم را زِ من و مرا گریز از غم نیست   یارانِ قدیم را شکست از ہم نیست
غم خوی بمن کرد و من خوے بغم   ہمچوں من و غم دو یار در عالم نیست

کیا خوف سے نجات بھی ممکن ہے؟ کیا اس ظالم جذبہ کی مرد افگن قوت کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور اس پر فتح حاصل کی جا سکتی ہے؟ کیا زندگی کے چند روز طمانیتِ خاطر اور بردِ قلبی کے ساتھ بسر کیے جا سکتے ہیں؟ علمائے نفسیات نے اس کا کیا علاج تجویز کیا ہے؟ حکمائے کائنات کی کنہ وحقیقت پر غور کرنے کے بعد کیا اس کو خوفناک اور بے درد و بے رحم قوتوں کا نتیجہ قرار دیا ہے؟ کیا کائنات انسان کے لیے ایک صلیب کے مانند ہے، جس پر بالآخر اس کو جان دینا ہے، خواہ پامردی اور ہمت کے ساتھ، یا نامردی اور بزدلی کے ساتھ، لرزاں و ترساں؟

قرآن کریم خوف سے کس حد تک نجات دیتا ہے؟

لَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (پ ۴ ع ۹) کے کیا معنی ہیں؟ کیا کوئی مخلوق و مربوب شے حقیقت میں نافع و ضار ہو سکتی ہے؟ اگر نہیں تو پھر خوف کیوں؟ کیا یہ وہم کا نتیجہ

نہیں، باطل علم کی پیداوار نہیں؟ کیا اس سے نجات علم کی تصحیح سے ہو سکتی ہے، اختصار کے ساتھ بعض انہی اعتبارات پر یہاں بحث کرنی مقصود ہے۔

قرآنِ کریم کی تعلیم کی رو سے خوف سے نجات اور زنجیروں سے رہائی جن سے خوف نے ہماری گردنیں باندھ رکھی ہیں، دو طریقوں سے ہو سکتی ہے، ایک طریقہ ذہنی ہے اور دوسرا خارجی، پہلا طریقہ علم کی تصحیح پر مشتمل ہے اور دوسرا علم صحیح کے استعمال پر۔

(۱) **علم کی تصحیح**:۔ خوف سے رستگاری حاصل کرنے کے لیے تمہیں سب سے پہلے اپنے مابعد الطبیعاتی مسلمات کا جائزہ لینا چاہیے، مذہب کی زبان میں یہ "عقائد" کہلاتے ہیں ان کو عقل سے ثابت کرنے کی فلسفہ میں کوشش کی جاتی ہے، اور مذہب میں ان پر محض "ایمان" لایا جاتا ہے، اور وراء طور عقل سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ خلافِ تجربہ اور خلافِ وجدان نہیں ہوتے یہ مذہبی زندگی کے وہبی جذباتی اور حسی میلانات کی گہرائیوں میں اپنی جڑیں جمائے ہوئے ہوتے ہیں، تجربہ ان کی تائید کرتا ہے، وجدان ان کو اپنے ذوق کے مطابق پاتا ہے، عقل ان کی تردید نہیں کر سکتی۔

ایسا پہلا عقیدہ جس کو مان لینے کے بعد خوف سے قطعاً رہائی مل جاتی ہے، حق تعالیٰ کا رحیم اور حکیم ہونا ہے، فلسفیانہ الفاظ میں یوں سمجھو کہ کائنات تمہاری دشمن نہیں دوست ہے، تم روحانی کائنات میں زندگی بسر کر رہے ہو روحانی قوانین کی تم پر حکمرانی ہے، یہ قوانین کورانہ نہیں، ان کی ایک غایت اور مقصد ہے، اگر تم ان کی نوعیت کو سمجھ کر ان کے ساتھ توافق پیدا کرو گے تو تم ان کو اپنا رفیق کار پاؤ گے اور نتیجہ طمانیت اور تسکین قلبی ہوگا، اگر تم نادانی اور جہل سے ان کی خلاف ورزی کرو گے، تو نقصان تمہارا ہی ہوگا، خوف و غم میں مبتلا ہو گے، حزن و یاس سے نجات نہیں ملیگی، اور اس کا باعث خود تمہارا جہل ہوگا، اور جہل سے پیدا شدہ غلط عمل، یقین و ایمان کی شاہانہ قوت سے قطعی طور پر مان لو کہ دنیا اچھی چیز ہے، کیونکہ اس کا مبدء خیر ہے، یہ مبدء حق تعالیٰ ہیں جو حکیم بھی ہیں اور رحیم بھی؛ حق تعالیٰ خالقِ کائنات ہیں، جان کر

کائنات کو پیدا کیا ہے، وہ جو کچھ کرتے ہیں، حق ہے، بجا ہے، سراسر حکمت سے مملو ہے، باطل کا وہاں کوئی شائبہ نہیں۔ مَا صنع اللّٰہ فھو خیر۔ ؎

زنیکو ہرچہ صادر گشت نیکو است!

جب تمہارا یہ عقیدہ راسخ ہو جائیگا تو جنتِ خرم پر مسرت ہو جائیگی، خیر کا جلوہ تمہیں ہر طرف نظر آنے لگیگا، کمالات پر تمہاری نظر جائیگی، دل میں اور نظر میں، بصر میں اور بصیرت میں حق جلوہ افروز ہوگا، یعنی تمہاری طبیعت اور تمہاری فطرت بدل جائیگی، وہ عیب جو اور عیب بیں نظر باقی نہ رہیگی، وہ ذہنیت باقی نہیں رہیگی، جو ہر جگہ نقص کی تلاش کرتی ہے، اور اس پر اعتراض کرتی ہے، مستقبل کو خوف کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور واقعات کے وقوع کے پہلے ہی ان پر شر ہونے کا حکم لگاتی ہے، اور وہمی بھوتوں سے لرزتی اور کانپتی ہے!

ایمان کی آنکھ سے دیکھو اور یقین کرنے والے قلب کی باتوں پر غور کرو کہ حق تعالیٰ رحیم ہیں کَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا ان کا قول ہے، وہ مومن پر رحیم ہیں، وہ اس کے دوست ہیں، مددگار ہیں، مولیٰ ہیں، نصیر ہیں۔ وَاللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (پ ۲۶) جب حق تعالیٰ مومن کے ولی ہیں اس پر رحیم ہیں تو پھر اس کو کس چیز سے خوف ہو سکتا ہے؟ حق تعالیٰ کو اپنا ولی جان کر وہ کس چیز سے ڈر سکتا ہے؟ وہ تو حق تعالیٰ کے زیر پرورش ہو جاتا ہے، اور حق تعالیٰ اس کے ساتھ بشانِ رحمت پیش آتے ہیں، اس کے تمام معاملات کے کفیل ہوتے ہیں، وکیل ہوتے ہیں، جب یہ ادراک مومن کے قلب میں قوی ہو جاتا ہے، تو اب وہ بہ یک جست خوف و حزن سے آزاد ہو جاتا ہے، اور لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ کا مصداق بن جاتا ہے!

خوف کے وقت حق تعالیٰ کے رحیم و حکیم ہونے پر غور کرو، مضطرب قلب کو، پریشان دماغ کو، معطل حواس کو، کچھ دیر کے لیے اس نقطہ پر مرکوز کرو، یہی وہ نقطہ ہے جو انوار کا منبع ہے، قوتوں کا مرکز ہے، توانائیوں کا معبد ہے، اسی پر نظر جما کر تم خوف سے نجات حاصل کروگے، تمہارا ضعف دور ہوگا حزن رفع ہوگا، سکون حاصل ہوگا، سرور حاصل ہوگا، طمانیت و تسکینِ قلبی نصیب ہوگی۔

جب حق تعالیٰ حکیم و رحیم ہیں اور وہی جہاں دار ہیں تو ظاہر ہے کہ ؎

جہاندار داند جہاں داشتن!

اب مجھے کسی تجربہ سے خوف زدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود!

ہر واقعہ کی تخلیق اس ہمہ خیر قوت سے ہو رہی ہے، جو حکیمِ مطلق بھی ہے، اور رحیم و کریمِ مطلق بھی! اب زندگی کا کوئی واقعہ میرے لیے مضر نہیں ہو سکتا، وہ بحیثیت مجموعی میرے لیے مفید ہے، خیر برتر کے حصول کا ذریعہ ہے، یہ میرا جہل ہے کہ باوجود حق تعالیٰ کو رحیم اور ولی مان کر پھر یہ خیال کرتا ہوں کہ وہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، در پے آزار ہیں، جب تھوڑے سے غور و فکر کے بعد میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ حق تعالیٰ رحیم ہیں، اور میرے حال کے علیم، تو جمعیتِ تامہ مجھے نصیب ہوتی ہے اور خوف بالکل رفع ہو جاتا ہے!

دوسرا اصول جس کے مان لینے کے بعد خوف قطعی طور پر دور ہو جاتا ہے حق تعالیٰ کی معیت کا عقیدہ ہے۔ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، جہاں کہیں ہم ہوں وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنتُمْ (پ ۲۷ ع ۱۶) جب مجھے اس امر کا تحقق ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں، مجھ سے بہت قریب ہیں "اقرب" ہیں، میری حفاظت فرما رہے ہیں، ان کی معیت کی وجہ سے میں تمام شر و گزند سے محفوظ ہوں، ان کے حفظ و امان میں ہوں، تو پھر خوف میرے قلب سے بالکل دور ہو جاتا ہے اور سرور و اطمینان بلکہ ایک ذوق و مستی پیدا ہو جاتی ہے!

در ہجر تو بودہ اندوہ و آزارم
از وصل تو رفت ہستی و پندارم

شادی آمد و نصیب جانم شد
اکنوں جان و تن خویش را براحت دارم

جب کبھی خوف کے حالات پیدا ہوں، واقعات خطرناک نظر آئیں، غم کے بادل قلب پر چھانے لگیں تو ہمیں اس امر کا احساس کرنا چاہیے کہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، وہ رحیم ہیں، قادر مطلق ہیں، ان کی معیت کی وجہ سے مجھے علوئے تمکین حاصل ہے أَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ

واللہ معکم کا مصداق ہوں، ان کو رکھ کر مجھے کس چیز سے نقصان پہنچ سکتا ہے، ان کی معیت کی وجہ سے میں ہر شئے سے بلند ہوں ان کو رکھ کر مجھے کسی شے کی نہ خواہش ہے، اور نہ اس کے نہ ملنے کا غم جب مجھے کسی چیز کی خواہش ہی نہ ہو، تو پھر شکستِ خواہش کا بھی احتمال نہیں، اور اس کے نتیجہ غم و خوف سے بھی آزاد ہوں!

لیکن غم و مصیبت و خوف کی حالت میں حق تعالیٰ کی معیت کا احساس اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب ہم راحت اور آسودگی، فراغت و اطمینان کی حالت میں بھی حق تعالیٰ کی یافت و شہود سے غافل نہ رہے ہوں، ان کی یاد سے ذہول نہ رہا ہو، اور کسی عارف کے یہ الفاظ ہمارے پیشِ نظر رہے ہوں۔

تشنہ او میر گر تو زندۂ　　　　خاکِ آں در باش گر تو بندہ

ذرہ دردِ خدا در دل ترا　　　　بہتر از ہر دو جہاں حاصل ترا

جب ہمارے دل میں حق تعالیٰ کا درد ہو، ان کی معبودیت و ربوبیت کا اقرار ہو، ذلت کا اظہار ان ہی کے سامنے ہو، ذل و افتقار کی نسبت ان ہی کے ساتھ وابستہ ہو تو پھر خوف و پریشانی کے وقت ہمیں ان کی معیت کا شدید احساس ہوتا ہے، ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ ہی تو ہیں، مونس ہیں غمخوار ہیں، نصیر ہیں، وکیل ہیں، اسی طرح ہمارے قلب کی حفاظت ہو جاتی ہے، سکینت و طمانیت پیدا ہوتی ہے، اور خارجی حالات میں بھی خوشگوار تغیر پیدا ہو جاتا ہے اور ہم تمام مصائب سے محفوظ ہو جاتے ہیں، اور حزن سے خوف سے رہائی مل جاتی ہے!

اگر تم خوف سے بالکلیہ رہائی کے خواہاں ہو، اس کی بیخ و بنیاد کو صحن دل سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتے ہو، "جمعیت تامہ" کے حصول کے خواہشمند ہو تو خود شناس ہو، عرفانِ نفس حاصل کرو، اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ، اس عرفان کا آلہ محض عقلِ نظری نہیں، اس کے لیے اس عقل کی ضرورت ہے، جو بقول اقبال "ادب خوردۂ دل" ہے، عقلِ نظری (قیاسات عقل یونانی) تمہیں خود شناسی میں زیادہ مدد نہیں دے سکتی، یہ زیادہ تر اوہام باطل کا نقشہ تمہاری نگاہوں کے سامنے پیش کرتی اور

پھراس کو بگاڑتی رہتی ہے، یہی اس کا محبوب مشغلہ ہے، یہ نہیں لذتِ حضور سے محروم رکھتی ہے، کیونکہ خود اس کی تقدیر میں حضور نہیں۔

ہے فلسفہ زندگی سے دوری ۔۔۔ انجامِ خرد ہے بے حضوری

تمہیں اس جگہ اقبال کی نصیحت پر عمل کرنا چاہیے جو "پیر رومؒ" کی ہدایت کے مطابق تم سے کہہ رہے ہیں

عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

یہ عقل تمہیں اس وقت حاصل ہوگی جب شیخ بو علی سینا کی تحقیقات سے صرف نظر کرکے "سخنِ محمدی" سے دل بستگی پیدا کرو۔

دل در سخنِ محمدی بند ۔۔۔ اے پورِ علی ز بو علی چند (حکیم خاقانی در تحفۃ العراقین)

اب تمہیں اس عقل کے ذریعہ جو نورِ وحی کی ہدایت و رہبری میں قدم اٹھا رہی ہے، اپنی ذات کی معرفت حاصل کرنی چاہیے، اس معرفت کے حصول کے بعد تم کو اپنی "عبدیت" کا علم ہو جائیگا کہ تم ذات و ماہیت کے لحاظ سے معلوم ہو خارجاً مخلوق ہو، غیر ذاتِ حق ہو، حق تعالیٰ تمہارے ظاہر و باطن ہیں، اول و آخر ہیں، تم کو محیط ہیں، تمہارے ساتھ ہیں، تم سے قریب و اقرب ہیں تم حق تعالیٰ ہی کے وجود سے موجود ہو، ان ہی کی حیات سے زندہ ہو، ان ہی کے علم سے جانتے ہو، ان ہی کی قدرت و ارادے سے قوت و ارادہ کا استعمال کرتے ہو، وجود اور تمام صفاتِ وجودیہ تمہارے پاس امانت ہیں، یہ تمہارے لیے اصالۃً نہیں امانۃً ہیں، تم فقیر ہو اور امین، امانت کا استعمال جب کائنات کے مقابلہ میں کرتے ہو تو خلیفۃ اللہ کہلاتے ہو، اور جب امانت کا استعمال حق تعالیٰ کے مقابلہ میں کرتے ہو ولی اللہ کہلاتے ہو۔ یہی چار اعتبارات ہیں، عبداللہ کے، فقر، امانت، خلافت، ولایت، عبداللہ کے پاس اللہ ہیں، ان کی ہویت و انیت ہے، صفات و افعال ہیں ملک و حکومت ہیں، عبداللہ کا قیام ذات اللہ میں ہوتا ہے، ذات اللہ میں خوف کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے، وہ تو سرور محض ہے، اس لیے عبد بھی اللہ کی جہت سے اپنے اندر ناقابل بیان سرور

ؔ توضیح کے لیے دیکھو مصنف کی کتاب "قرآن اور تصوف"

محسوس کرتا ہے، طمانیتِ محض و ذوقِ خالص کا مخزن بن جاتا ہے، کیا خوب کہا ہے کسی عارف تام المعرفت نے ؎

چوں بدانستی کہ ظلِ کیستی | فارغی گر مردی و گر زیستی
قطرۂ نوری سراپا نور باش | بگذر از غم دائما مسرور باش

انسان اپنی اس حقیقی جہت کو فراموش کر کے خوف و حزن میں مبتلا ہوتا ہے، یا پھر خوف و حزن اس کے قلب پر محیط اس لیے ہیں کہ وہ سرے سے اپنی حقیقت سے آگاہ ہی نہیں اس کے ہر درد و غم، ہر خوف و ہراس کا علاج خود اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس سے جاہل اس سے زیادہ محرومی کیا ہو سکتی ؟

یک سبد پُر نان ترا فرقِ سر | تو ہمی جوئی لب ناں در بدر
تا بزانوئے میانِ قعرِ آب | در عطش و ز جوع گشتہ ہستی خراب

(۲) **علم صحیح کا استعمال**:۔ جب تم کو اپنی حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا، جب تم نے یہ جان لیا کہ حق تعالیٰ مومن کے ساتھ ہیں، اس سے قریب اور اقرب ہیں، اس کے ظاہر و باطن ہیں، جب تم کو یہ یقین ہو گیا کہ حق تعالیٰ مومن کے ولی ہیں، مولی و نصیر ہیں، اس پر رحیم ہیں، تو اب خوف کے وقت اپنے ایمان کی قوت سے کام لو، جرأت کے ساتھ کہو کہ کائنات کی کوئی چیز تم کو خوف زدہ نہیں کر سکتی، اپنے خوف زدہ نفس کو مخاطب کر کے کہو۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ وَ يُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ (پ ۲۴)

کیا اللہ اپنے بندہ کے لیے کافی نہیں ؟ کیا تجھ کو یہ ان سے ڈراتے ہیں جو خدا کے ماسوا ہیں ؟ (ڈر مت)

ہمیں اپنے تحت الشعور نفس کے ساتھ بچوں کا سا برتاؤ کرنا چاہیے، دیکھو بچہ اندھیری رات میں جاگ پڑتا ہے، اور ڈر کر رونے لگتا ہے، تم اُس سے کہتے ہو، ڈرو مت، یہاں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے تم کو ڈر ہو، خوف کی چیزیں صرف تمہارے خیال میں ہیں، کمرے میں نہیں، اس طرح خوف کی نفی کرنے کے بعد تمہیں ان چیزوں کا اثبات کرنا چاہیے جو سچ ہیں۔ مثلاً تم کہو گے

میں تمہارے ساتھ ہوں، تمہارے بازو ہی میں تو ہوں، کیا مجال کہ کوئی چیز تم کو چھو سکے، اس طرح اطمینان دلانے کے بعد کہ تم پاس ہی ہو، اور اس کو تمہاری قوت پر یقین ہونے کی وجہ سے کہ تم اس کی حفاظت کرنے کے قابل ہو، بچہ پھر بے فکری کی نیند سو رہتا ہے!

یہی طریقہ تم کو اپنے تحت الشعوری نفس کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے، پہلے خوف کے اسباب کی نفی کرنی چاہیے، جرأت و ہمت کے ساتھ اس کو یقین دلانا چاہیے کہ ساری دنیا میں خدا کے سوا تمہیں کوئی چیز ڈرا نہیں سکتی! تم جانتے ہو کہ یہ شیخی نہیں، واقعہ ہے، حقیقت کے عین مطابق ہے، مومن جس پر حق تعالیٰ رحیم ہیں، جس کے ساتھ وہ ہیں جس کی نصرت کا وہ اپنے اوپر حق سمجھتے ہیں، حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ جس پر وہ ستر ماؤں سے زیادہ شفیق اور مہربان ہیں، ایسا مومن کائنات میں سوائے حق تعالیٰ کے کس چیز سے ڈر سکتا ہے اور ڈر کر مومن رہ کیسے سکتا ہے؟ دیکھو ساری اشیاء مخلوق ہیں، مربوب ہیں، محکوم ہیں، مملوک ہیں جب تک خالق و حاکم مالک و رب نہ چاہے، یہ ہمیں نقصان کیسے پہنچا سکتی ہیں؟ حکم اللہ ہی کا چلتا ہے اَلْحُكْمُ لِلّٰهِ متصرف فی الامور حق تعالیٰ ہی ہیں، ان ہی کے قبضۂ قدرت میں تمام جانداروں کی پیشانی کے بال ہیں مَا مِنْ دَابَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا، ڈرنا ہمیں ان ہی کے جلال سے چاہیے، نافع وہ ہیں اور ضار وہ، معز وہ ہیں، اور مذل وہ، اور سارا عالم فقیر اور محتاج، نہ نفع کی قوت رکھتا ہے اور نہ ضرر کی، اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ولو جهد العباد ان ينفعوك بشيء لم يقضه الله لك لم يقدروا عليه ولو جهد العباد ان يضروك بشيء لم يقضه الله عليك لم يقدروا۔[1]

"اگر سب بندے مل کر کوشش کریں کہ تجھے اس چیز سے نفع پہنچائیں، جو اللہ نے تیرے لیے

---

[1] یہ اس حدیث کا ایک حصہ ہے، جو حضرت عبد اللہ بن عباس سے مروی ہے، اور جس کو حضرت غوث الاعظم شیخ عبد القادر جیلانی فتوح الغیب مقالہ ۴۲ میں پیش فرماتے ہیں، اور تاکید کرتے ہیں کہ ہر مومن کو چاہیے کہ اس حدیث کو اپنے دل سے تکرار کرتا رہے تاکہ دنیا و آخرت میں تمام آفات سے محفوظ رہے اور اللہ کی رحمت سے دونوں جہان میں عزت پائے۔

مقدر نہیں کی، تو وہ ایسا کرنے کی قدرت نہ پائیں گے اور اگر سب بندے مل کر تجھے کسی چیز سے ضرر پہنچانے کی کوشش کریں، جو اللہ نے میرے لیے مقدر نہیں کی، تو وہ اس پر قدرت نہ پائیںگے
اس صداقت پر پورا یقین رکھ کر اپنے نفس سے کہو کہ مجھے قطعاً کسی چیز سے ڈرنا نہیں چاہیے!
اور زندگی کا عجیب قانون ہے کہ جوں ہی خوف قلب سے دور ہوا، اب دنیا کی کوئی چیز ہمیں گزند نہیں پہنچا سکتی، حضرت دانیال ؑ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہیں شیروں کے غار میں ڈال دیا گیا لیکن شیروں نے انہیں چھوا تک نہیں، اس کی نفسیاتی توجیہ یہی ہوسکتی ہے کہ حضرت دانیال ؑ کا حق تعالیٰ پر اتنا اعتماد تھا کہ خوف ان کے سینہ میں مطلق نہ تھا، اور اسی وجہ سے شیر انہیں چھو نہ سکے۔
یہ تو ہم سبھی جانتے ہیں کہ کتا جو خوف زدہ شخص پر حملہ کر دیتا ہے، اس شخص کے قریب بھی نہیں آتا جو بالکل بے خوف ہوتا ہے، یہ جو سنیاسی جنگلوں میں جا بیٹھتے ہیں جہاں ہر قسم کے موذی اور درندہ جانور بھی موجود ہوتے ہیں، کیسے محفوظ رہتے ہیں؟ ان کی بے خوفی ان کے لیے سب سے بڑی حفاظت کا کام دیتی ہے، جو شخص حق تعالیٰ کو محافظ سمجھتا ہے، وہ بے خوف ہوتا ہے۔ کامل بے خوفی نتیجہ ہے ایمان راسخ کا!

نفی کے بعد اثبات، یعنی نفس کو یہ یقین دلانے کے بعد کہ خوف کی کوئی وجہ نہیں، اب ہمیں حق تعالیٰ کی معیت، احاطت، قرب و اقربیت کا ادراک کرنا چاہیے، جس طرح کہ چھوٹے بچے کو ہم نے اپنی موجودگی کا یقین دلایا تھا، اسی طرح نفس کو حق تعالیٰ کے حضور و معیت کا یقین دلانا ضروری ہے۔ جب وہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کا قیام حق تعالیٰ کی ذات میں ہے، وہ حق تعالیٰ کے نور میں منکشف ہے، اس کے داہنے بائیں اوپر نیچے آگے پیچھے حق تعالیٰ کا نور ہے، وہ نور کے قلعہ میں محصون ہے، محفوظ ہے، تو پھر خوف کا سایہ اس کے قلب سے اٹھ جاتا ہے، (ظلمت نور کی موجودگی میں کیسے ٹھہر سکتی ہے؟) سرور و طمانیتِ حقیقی کا نفوذ اس کی رگ و پے میں ہونے لگتا ہے، وہ قطرۂ نور بن جاتا ہے سراپا نور ہو جاتا ہے، اور مسرتِ دائمی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

اس مقصود کے حصول کے لیے تمہیں بعض ازلی وابدی صداقتوں کا دہرانا بڑی مدد دیگا جب خوف وہراس کی لہریں تمہارے قلب میں قیامت خیزی کررہی ہوں، اور دہ بیٹھا جا رہا ہو، اور تمہاری نظر میں دنیا تاریک ہو رہی ہو تو تمہیں بیٹھ جانا چاہیے، اور آہستہ سے لیکن استقلال وثابت قدمی کے ساتھ معیتِ حق کا ادراک کرتے ہوئے، ان صداقت بھرے الفاظ کی تکرار کرنی چاہیے۔

حَسْبِیَ اللّٰہُ نِعْمَ الْوَکِیْلُ نِعْمَ الْمَوْلٰی وَ — مجھے اللہ کافی ہے، اور وہ کیا خوب کارساز ہے،

نِعْمَ النَّصِیْرُ — کیا خوب مولی ہے، اور کیا خوب مددگار ہے۔

ان کی تکرار سے ہماری بصیرت کی آنکھیں کھلتی ہیں، ہمیں حق تعالیٰ کی کفایت کا یقین ہوتا ہے اور اسی یقین کی وجہ سے ہمیں خوف سے نجات ملتی ہے، آزادی نصیب ہوتی ہے۔

جامع ترمذی میں ہے کہ جب حضور انور صلعم کو کوئی مشکل پیش آتی، فکر کا بار قلبِ انور پر ہوتا ہے تو حق تعالیٰ سے مخاطب ہو کر فرماتے:۔

یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ

درد بھرے دل سے الغیاث کی یہ پکار نکلی کہ حی القیوم کی رحمت نے قلب کو سنبھالا دیا، اور اس کی حفاظت کے سامان فراہم کردیے۔

یاد رکھو کہ خوف طاری ہوتا ہے خوف پیدا کرنیوالے خیال کو قبول کر لینے کی وجہ سے، اس خیال کا مقابلہ ذہن کی اس سطح پر رہ کر نا ممکن ہے جس سطح پر خوف کی موجیں اُٹھ رہی ہیں، کوشش اس بات کی کرنی چاہیے کہ قلب اس سطح سے بلند ہو جائے، اور بالاتر سطح پر قدم جمائے دیکھو سمندر کا طوفان اسی وقت فنا کا باعث ہوتا ہے، جب ہم اس کی تباہ کن موجوں میں گھر جاتے ہیں۔ لیکن اگر ہم کسی بلند پہاڑی پر چڑھ جائیں، تو پھر ان بلا خیز موجوں کے شر و شور سے ہمیں نجات مل جاتی ہے، کیونکہ اب ہم ان کے پنجے سے باہر ہیں! بالکل اسی طرح جب ہم خوف کی حالت میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ جاتے ہیں تو ہمارا قلب خوف کی سطح سے بلند ہو جاتا ہے، اور

اس مقام پر پہنچ جاتا ہے، جہاں سکون ہی سکون ہے، شانتی ہی شانتی، سکھ ہی سکھ!

یاد رکھو قرآن کریم کی تعلیم کی رو سے ہمارے سارے دردوں کی دوا حق تعالیٰ ہیں، خوف و حزن کا علاج حق تعالیٰ کی محبت ہے، غیر اللہ سے بیزاری ہے، درد و الم خوف و ہراس کے وقت اپنے رُخ کو حق تعالیٰ کی طرف اخلاص کے ساتھ پھیر دو، اور عجز کے ساتھ ان کے قدموں پر پڑ جاؤ، اور پھر تمہارا کام بن نہ جائے تو شکایت کرنا۔

در حضرتِ ما دوستی یکدلہ کن
ہر چیز کہ غیر ماست آنرا یلہ کن
یک صبح با اخلاص بیا بر درِ من
گر کارِ تو بر نیاید آنگہ گلہ کن! (ابو سعید مہنہ)

بے خوف زندگی

جائے روحِ پاک علّیین بود　　کرم باشد کس وطن سرگیں بود! (رومی)

آئیے آپ کو بے خوف زندگی بسر کرنے کے وہ گر بتلائیں جنہیں صوفیۂ کرام نے اپنے ذوق و وجدان سے دریافت کئے ہیں، اگر آپ انہیں سمجھ لیں اور ان پر عمل کریں تو آپ اپنی زندگی کو لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کا مصداق بنا سکتے ہیں اور خوف و حزن سے نجات حاصل کر کے بے خوف و مطمئن زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

زیں شہد یک انگشت بسانم بلبت　　از لذت اگر محو نگردی تھف کن

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ صوفیۂ کرام کی زندگی حق تعالیٰ ہی کے قرب میں بسر ہوتی ہے، وہ حق تعالےٰ ہی کے لیے جیتے ہیں، اور انہی کے لیے مرتے ہیں، جیسا کہ عارف رومی نے کہا ہے:-

بہر یزداں می زید نے بہر گنج　　بہر یزداں می مرد نز خوف و رنج

آنچناں خندد کہ او بیند رضا　　ہمچو حلوائے شکر او را قضا

ظاہر ہے کہ بے خوف زندگی کے حصول کا اُن کے ہاں صرف ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے، اور وہ یہ کہ قرب حق میں زندگی بسر کی جائے، اور اس امر کا یقین پیدا کیا جائے کہ ہماری زندگی میں حق تعالیٰ ہی کی مراد اور ان ہی کی منشا، کی تکمیل ہو رہی ہے، اور یہ منشا، یا مراد خیر برتریں ہے۔

عمر خوش در قرب جاں پروردن است　　عمر زاغ از بہر سرگیں خوردن است (رومی)

اس مضمون میں ہم اسی اجمال کی تفصیل بیان کرینگے۔

صوفیہ کا یہ یقین قرآنی تصور پر مبنی ہے کہ حق تعالیٰ ہم سے قریب ہیں، اقرب ہیں، ہم پر محیط ہیں، ہمارے ساتھ ہیں، وہ ہم سب سے غائب نہیں، بعید نہیں، اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ "میرا رب

مجھ سے قریب ہے میری دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے، اِنَّہٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ بیشک وہ مجھ سے قریب ہے، اور میری سنتا ہے۔ جب کسی اعرابی نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کیا ہمارا رب نزدیک ہے کہ ہم اس سے سرگوشی کریں یا دور ہے جو ہم اس کو پکاریں تو جواب میں یہ آیت نازل ہوئی

وَاِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۔ — جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق سوال کریں تو ان سے کہہ میں قریب ہی تو ہوں۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا بیان ہے کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، لوگ بلند آواز سے تکبیر کہنے لگے، تو آپ نے فرمایا۔

یا ایہا الناس اربعوا علیٰ انفسکم	یعنی اے لوگو اپنی جانوں پر نرمی کرو (یعنی آہستہ کہو)
انکم لا تدعون اصم او لا غائبا انکم	تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو
تدعون سمیعا بصیرا وھو معکم	تم پکار رہے ہو سننے اور دیکھنے والے کو جو تمہارے
والذین تدعونہ اقرب الیٰ احدکم	ساتھ ہے اور تم جس کو پکار رہے ہو، وہ تمہارے
من عنق راحلہ۔	اونٹ کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔

یہ حدیث وما کنا غائبین کی تفسیر ہے، اور فانی قریب کی تشریح، سچ ہے،

خواب جہل از حرم قرب مرا دور فگند ۔ ورنہ نزدیک تراز دوست کسے ہیچ ندید

اس معرفت کے حصول کے بعد جو ورائے طور عقل و نظر ہے، جس کی سند نص قطعی و کشف صحیح ہے[1]، اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ قرب حق بغیر اختلاط و حلول و اتحاد[2] ہمیں حاصل ہے، صوفیۂ کرام نے قرب حق کے دو پہلوؤں پر فکر کرنے ان کا تحقق حاصل کرنے اور ان پر قلب کی قوتوں کو مرکوز کرنے کی ہدایت کی ہے، جس کی وجہ سے روح کو چین اور قلب کو طمانیت حاصل ہوتی ہے اور خوف و حزن سے قطعی طور پر نجات مل جاتی ہے، اور وہ دو پہلو رحمت و حکمت کے ہیں۔

(۱) قرب حق رحمت ہے، رحمت حق ہمیں کوئی گزند یا نقصان نہیں پہنچا سکتی، نقصان پہنچانا ہرگز

---

[1] مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی جلد اول مکتوب ۲۵ [2] شیخ علی المہائمی در تفسیر القرآن المسمی بہ تبصیر الرحمٰن ص ۳۱۹

نہیں چاہتی، اور نہ غیر کو نقصان پہنچانے دیتی ہے، حق تعالیٰ تو حلیم و رحیم ہیں، غفور و کریم ہیں اِنَّ اللّٰہَ بِکُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ وہ تو ہمیں سلامتی امن و رحمت ہی کی طرف بلاتے ہیں، اللّٰہ یدعوا الیٰ دار السّلام ان کا فضل و کرم عظیم ہے، واللّٰہ ذو الفضل العظیم وہ ہمارے سچے دوست ہیں اللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا! اگر ہم اس بنیادی واقعہ کو یاد رکھیں، فراموش نہ کریں، بھلا نہ دیں، ان کے سایۂ رحمت میں زندگی بسر کریں اور ان کی یاد میں رہیں تو کوئی چیز ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتی، کیونکہ رحمتِ حق کا مقابلہ کوئی چیز نہیں کر سکتی، حق کے مقابلہ میں کونسی قوت آسکتی ہے!

لیکن ہماری زندگی ذہول و غفلت میں گزرتی ہے، معصیت و نافرمانی میں بسر ہوتی ہے، حق تعالیٰ یار مہربان کی طرح ہمارے جویا ہوتے ہیں، اور ہم گدھوں کی طرح ان سے بھاگتے ہیں، اور بلاؤں اور آفتوں کا شکار ہوتے ہیں۔

تو مرا جویا چو یارِ مہرباں — من گریزاں از تو مانندِ خراں (رومی)

جب خوف و حزن آفات و بلیات کا سامنا ہو اور ہم قربِ حق کا ارادہ قائم کر سکیں، قلب کو اس واقعہ کا یقین دلا سکیں، کہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، اپنی رحمتِ کاملہ کے ساتھ ہمارے قریب ہیں، مونس و رفیق ہیں، یار مہرباں ہیں، ہماری قوتِ بازو او، ہماری پناہ گاہ ہیں، سہارا ہیں، وہی حق تعالیٰ جن کے حضور میں رات کی سیاہی اور دن کی روشنی آفتاب کی شعاع اور چاند کا نور درخت کے جاندار اور پانی کے حیوان سجدہ ریز ہیں، جو محسن و مکرم و منعم ہیں جو حرز ضعفا و کنز فقراء ہیں تو بھلا بتلاؤ کہ اس ادراک کے بعد قلب میں خوف باقی بھی رہ سکتا ہے، حاشا وکلاّ! قرآن کریم نے ببانگ دہل اعلان کیا ہے کہ اس ادراک یا ذکر کے بعد قلب کا اطمینان قطعی و یقینی ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ — جو لوگ ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے ان کے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے، خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔

"ذکر" توجہ قلبی ہی کا تو نام ہے، حق تعالیٰ کی طرف، ان کی رحمت و محبت کی طرف، قلب نے توجہ کی،

اس امر کا ادراک کیا، کہ یہ رحمت ہم پر ہر جانب سے محیط ہے کہ خوف دور ہوا اور طمانیت نصیب ہوئی اور زندگی کے میدان میں قدم اعتماد و اطمینان کے ساتھ بڑھنے لگے، کیونکہ اب ہمیں یقین ہوگیا، اور ہم نے محسوس کرلیا کہ رحمتِ حق ہمارے سامنے ہے، کَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْماً!

لیکن خوف و خطرے کے وقت رحمت کا ادراک اور اس کا تحضر و تحقق کوئی ایسی چیز ہی نہیں، جو سہولت کے ساتھ حاصل ہو سکے، اگر ہم نے راحت و آسودگی کے وقت فراغت و طمانیت کی حالت میں حق تعالیٰ کی معیت کا ادراک قائم نہ رکھا ہو تو خوف و مصیبت کے وقت ہم اس معیت کا ادراک نہیں قائم کرسکتے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں نہایت بے رحمی کے ساتھ دشمن کے حوالہ کردیا گیا ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی توجہ ہر حالت میں خواہ وہ نعمت و راحت کی ہو یا بلا و مصیبت کی حق تعالیٰ کی جانب لگائے رکھیں، ان کی یاد میں زندگی بسر کریں، ان کی معیت کا ادراک کرتے رہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عباسؓ کو اس بنا پر نصیحت فرمائی تھی کہ

اُذْکُرِ اللّٰہَ فِی الرَّخَاءِ یَذْکُرْکَ فِی الشِّدَّۃِ۔ — اللہ کی یاد چین کی حالت میں کر وہ تجھ کو سختی کی حالت میں یاد کریگا۔ یعنی تیری مصیبت دور کریگا۔

جب انسان آسائش اور چین کی حالت میں حق تعالیٰ کی یاد نہیں بھولتا، تو حق تعالیٰ بھی اس کو خوف و مصیبت کی حالت میں نہیں بھولتے، اس لیے تاکید کے ساتھ حکم ہوا ہے۔

فَلْیُکْثِرِ الدُّعَاءَ عِنْدَ الرَّخَاءِ — چین اور آسائش کے وقت زیادہ دعا کرتے رہو۔

جانتے ہو کہ چین کی حالت میں دعا کا کیا مطلب ہے، صرف یہ ادراک کہ ہر نعمت دراصل حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا کی جاتی ہے۔ وَمَا بِکُمْ مِّنْ نِّعْمَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ حقیقت میں منعم، قاسم، فاعل، مسبب، موجد حق تعالیٰ ہی ہیں، ان ہی کی مرضی کے مطابق نعمتوں کا استعمال ضروری ہے، اس کو دوسرے الفاظ میں "شکر" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور مومن کی شان میں فرمایا گیا ہے:

اَلْمُؤْمِنُ شَکُوْرٌ عِنْدَ الرَّخَاءِ — مومن چین کی حالت میں حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔

اگر ہم آسائش و نعمت کی حالت میں حق تعالیٰ کو یاد نہ رکھیں، نعمتوں کو ان ہی کی جانب سے

نہ سمجھیں، اور اس طرح اپنا رُخ اُن ہی کی جانب نہ رکھیں، تو مصیبت و خوف کے وقت ہم حق تعالےٰ کی رحمت و رافت کا ادراک نہیں قائم کر سکتے، جو ہماری نجات کا واحد ذریعہ ہے، چین و آسایش کے وقت حق تعالیٰ کی یاد ہمیں اس قابل بناتی ہے، کہ خوف و مصیبت کے وقت ہم ان کی معیت کا ادراک کرسکیں ان کی رحمتِ کاملہ کو اپنا مونس و رفیق پا سکیں، اس لیے حضور انورؐ نے ابن عباسؓ سے فرمایا تھا، کہ اے لڑکے :-

احفظ الله يحفظك الله، احفظ   خدا کی نگہداشت کرو، خدا تمہاری نگہداشت کریگا۔

الله تجده امامك ۔   خدا کو حاضر جانو تو اس کو اپنے سامنے پاؤ گے ۔

اگر ہم حق تعالیٰ پر نگاہ رکھیں، یعنی ان کی معیت کے ادراک میں رہیں، تو حق تعالیٰ ہمیں اپنی نگاہ میں رکھتے ہیں (اپنی رحمت و نصرت سے) اگر ہم حق تعالیٰ کی معیت کا ادراک قائم رکھیں، تو ہم انہیں اپنے سامنے ہی پاتے ہیں :-

خوف کے وقت حقیقی دعا تو یہ ہے کہ ہم کہیں "حق تعالیٰ میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں، میں آپ کی نظروں میں ہوں"، پھر کوشش اس امر کے ادراک کی کی جائے کہ ہم حق تعالیٰ کی آنکھوں کے سامنے ہیں، اور ان کی رحمتِ کاملہ بادل کی طرح ہم پر سایہ فگن ہے، یا نور کی طرح ہر جانب سے ہم پر محیط ۔

خوف اور بلا کے ورود کے وقت قرآن شاہد ہے، کہ پیغمبر اسلام (فداہ روحی) کو حکم ہوا کہ

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا   اپنے رب کے حکم پر صبر کرو کہ تم ہماری آنکھوں کے سامنے ہو

بعض عارفین کی جیب میں یہ آیت لکھی رہتی تھی، خوف و مصیبت کے وقت اس پر نظر ڈالتے، حضور و معیت حق کا ادراک کرتے، اور محض اس ادراک سے کہ حق تعالیٰ ہماری اس مصیبت کو جانتے ہیں، اس تجربہ میں شریک ہیں، دیکھ رہے ہیں، جھومتے رقص کرتے، خود حضور انورؐ پر اس آیت سے وجد طاری ہوا تھا، اور ام المومنین عائشہؓ صدیقہ آپ کے پاؤں پر گر گئی تھیں، جامیؔ نے شاید اسی مفہوم کو یوں ادا کیا ہے،

بادر دبساز چوں دوائے تو منم | در کس منگر کہ آشنائے تو منم
گر بر سر کوئے عشقِ ما کشتہ شوی | شکرانہ بدہ کہ خونبہائے تو منم

(۲) ثانیاً قربِ حق یا حضورِ حق حکمت ونظم کا نام ہے، حضورِ حق عالم لاہوت ہے، عالمِ لاہوت میں کامل الٰہی نظم پایا جاتا ہے بے نظمی یا اختلال نہیں، عالمِ لاہوت میں شر نہیں فساد نہیں بلکہ کامل نظم وترتیب ہے۔

نظمِ کائنات پر غور کرو، یہاں ہر قانون اپنا عمل کر رہا ہے، اس کی شکست یا ناکامی ناممکن ہے، مثلاً کوئی برقیہ (Electron) تک اپنے کام میں قصور نہیں کرتا، دوسرے برقیہ سے نہیں ٹکراتا اُن کے درمیان تصادم ممکن نہیں، یا قرآنی الفاظ میں یوں کہو کہ صُنعِ الٰہی میں کوئی خلل نظر نہیں آتا بار بار نگاہ ڈالنے پر بھی نگاہ درماندہ ہو کر لوٹتی ہے، اور کوئی عیب یا خلل نظر نہیں پڑتا

مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ	تو خدا کی صنعت میں کوئی خلل نہ دیکھیگا، تو پھر نگاہ
فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ	ڈال کر دیکھ لے، کہیں تجھ کو کوئی خلل نظر آتا ہے
ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ	پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ، نگاہ ذلیل اور درماندہ
الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (پ ۲۹ ع ۱)	ہو کر تیری طرف لوٹ آئیگی۔

عالمِ لاہوت میں اس سے کہیں زیادہ کامل نظم وتوافق کی حکمرانی ہے، یا یوں کہو کہ "نظمِ الٰہی" میں کامل توافق یا ہم آہنگی پائی جاتی ہے نغمۂ موسیقی جن تاروں سے پیدا ہوتا ہے، ان میں سے ہر تار اپنی مقررہ شرح ہی سے مرتعش ہوتا ہے، اس کی شرح ارتعاش میں کمی یا زیادتی نہیں ہوتی، نظمِ الٰہی کا بھی یہی حال ہے، یہاں بھی ہر شے ٹھیک ٹھیک ہوتی ہے، اپنے صحیح مقام پر ہوتی ہے، اپنا مفوضہ کام انجام دیتی ہے، اس کو کامل طور پر انجام دیتی، اور اپنے صحیح وقت پر انجام دیتی ہے

حضورِ حق یا قربِ حق کے مفہوم میں نظمِ الٰہی بھی شامل ہے، اور چونکہ حق تعالیٰ ہمیشہ ہمارے قریب ہیں، اقرب ہیں، ساتھ ہیں، نظمِ الٰہی، حکمتِ حق بھی اس کے ساتھ موجود ہے، اگر ہم اس پر بھروسہ کریں تو اس کا ظہور بھی قطعاً ہو کر رہیگا۔

جب ہم اپنی دعا میں کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں، تو ہمیں اس امر کا تحقق ہوتا ہے کہ معیتِ حق نہ صرف رحمت ہے، بلکہ حکمت بھی ہے، نظم بھی ہے، لہذا ہر شے ٹھیک ٹھیک ہوگی، اور اپنے ٹھیک وقت اور ٹھیک مقام پر ہوگی، اور اگر ہم اس یقینِ صادق کو قلب سے ہٹنے نہ دیں، تو پھر سب کچھ ٹھیک ہی ہوگا۔

عارف رومی نے اس حقیقت کو یوں ادا فرمایا ہے:

رو دیدہ بدوش تا دلت دیدہ شود — زاں دیدہ جہانِ دگرت دیدہ شود

گر تو ز پسند خویش بیروں آئی — کارت ہمہ سر بسر پسندیدہ شود

اگر "دیدۂ دل" سے حکمتِ الٰہی نظر آنے لگے، اگر دل نظمِ الٰہی کا مشاہدہ کرنے لگے، اس یافت و شہود میں وہ جا بھی رہے، تو پھر عارف کا ہر کام پسندیدہ ہی ہوگا، اپنے وقت پر ہوگا، اپنے مقام پر ہوگا، اور ہر وقت وہ یہی کہیگا کہ "الخیر فیما وقع" جو ہوا وہ ٹھیک ہوا،

ہر چیز کہ ہست آنچناں می باید — واں چیز کہ آنچناں نمی باید نیست!

نہ صرف یہ کہ حق تعالیٰ ہمیشہ ہمارے ساتھ ہیں، اللہُ مَعَنا، بلکہ ہر زندگی میں منشائے الٰہی ہی کی تکمیل ہو رہی ہے، ہمارے دل، ہمارے اعضاء اور ہم خود سراپا حق تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہیں، اس منشائے الٰہی کی بنیاد لا متناہی حکمت و رحمت پر قائم ہے، یہ سراپا حکمت ہے، رحمت ہے، یہ ہمیں خیر برتری کی طرف لیجا رہی ہے، اس کو ارادۃ اللہ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، مرضیِ مولیٰ بھی کہا گیا ہے، حق تعالیٰ کے ارادے سے توافق ان کی رضا سے راضی ہو۔ رضا از و، رضا بدو، رضا در و، اعراض عن الاعتراض، حفظِ حال، "قیام فی ما اقام اللہ" اس کی تعلیم تو ہمارے رہبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دی ہے، حق تعالیٰ کے ارادے، منشاء، مرضی سے زیادہ بہتر، زیادہ نفیس، زیادہ حسین و جمیل، زیادہ شاندار کوئی چیز نہیں ہو سکتی، نیک انجام و شادکام ہے، وہ شخص جس نے اپنے ارادے سے حق تعالیٰ کے ارادے کے خلاف کام نہ لینے کا ارادہ کر لیا اور بآوازِ بلند کہا:-

اُرِیْدُ اَنْ لَا اُرِیْدُ — میں نے ارادہ نہ کرنے کا ارادہ کیا۔

اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں حق تعالیٰ سے معروضہ کیا ہو۔

اللّٰھم ان قلوبنا ونواصینا و جوارحنا بیدک لم تملکنا منھا شیئاً فاذا فعلت ذٰلک فکن انت ولینا واھدنا الٰی سواء السّبیل[۱]	حق تعالیٰ! ہمارے دل ہم خود سرتاپا اور ہمارے اعضاء آپ ہی کے قبضہ میں ہیں! آپ نے ہیں اُن میں سے کسی چیز پر بھی اختیار (کامل) نہیں دیا ہے، پس جب آپ نے یہ کیا ہے تو آپ ہی ہمارے مددگار رہیے اور ہمیں سیدھی راہ دکھاتے رہیے۔

جس کی شب روز یہ دعا ہو کہ

اللّٰھم انی ضعیف فقوّ فی رضاک ضعفی وخذ الی الخیر بناصیتی واجعل الاسلام منتھا رضائی	حق تعالیٰ میں کمزور ہوں پس اپنی مرضیات میں میرا ضعف اپنی قوت سے بدل دیجیے اور کشاں کشاں مجھے خیر کی طرف لے جائیے، اور اسلام کو (یعنی ہر امر میں آپ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی خو کو) میری پسند کا منتہا بنا دیجیے

جب ہم حق تعالیٰ کے ہاتھوں میں اپنے آپ کو دیدیتے ہیں، نرم اور ملائم اور لچکیلے ہو جاتے ہیں، ان کے ارادے کے آگے سر تسلیم ختم کر دیتے ہیں، ان کی رضا سے راضی اور غضب سے غضبناک ہو جاتے ہیں تو پھر حق تعالیٰ بھی ہماری رضا سے راضی اور غضب سے غضبناک ہوتے ہیں، زبان وحی نے اس کی توثیق کی ہے، اِنّ لِلّٰہ رجالاً یرضی برضاھم ویغضب بغضبھم کما انھم یرضوا برضائہٖ ویغضبوا بغضبہ

ہر چہ خواہی آں کند گر ہر چہ خواہی آں کنی
انچہ گوئی بشنود گر ہر چہ گفت او بشنوی

جب مقام رضا کی تکمیل ہو جاتی ہے تو پھر ہمیں پروا نہیں رہتی کہ زندگی میں ہم پر کیا گزر رہی ہے، یا گزرنے والی ہے، کیونکہ ہم جاننے لگتے ہیں کہ انجام ہر چیز کا خیر ہے، خیر اب بھی اور ہمیشہ کے لیے بھی، اسی لیے شیخ جیلی نے جان کر کہا تھا کہ

---

[۱] ترمذی عن ابی ہریرہ وکنز العمال عن جابر۔ [۲] فتوح الغیب

الرضا بالقضا هو الراحة الکبری و الجنة العالیة المنفرد فی الدنیا وعلة محبة اللہ بعبد المومن فمن احبه اللہ لم یعذبه فی الدنیا والاخرة ۱؎	رضائے الٰہی سے راضی رہنا دُنیا میں بڑی راحت کا سبب ہے گویا جنّت عالیہ ہے۔ اور عبد مومن کے ساتھ حق تعالیٰ کی محبت کا باعث ہے، اور جس سے حق تعالیٰ محبت کرتے ہیں اُس کو نہ دُنیا میں تکلیف دیتے ہیں اور نہ آخرت میں۔

قربِ حق میں زندگی بسر کرنے اور اس پر یقینِ صادق حاصل کرنے کا کہ ہماری زندگی میں مرادِ الٰہی کی تکمیل ہو رہی ہے، نتیجہ خوف، پریشانی، فکر اور بے شمار خرابیوں کا کامل دفعیہ ہے۔ ہم کو اس سے اس عارف کامل کا نقطۂ نظر حاصل ہو جاتا ہے جو زندگی اور اس کے ہموم و غموم، افکار و پریشانیوں پر ہنستے ہوئے نظر ڈالتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ پسِ پردہ حکمتِ مطلقہ و رحمتِ مطلقہ کام کر رہی ہے اور اپنے شاندار منشاء و مراد کی تکمیل کر رہی ہے اور ہمیں خیرِ برترین کی طرف لے جا رہی ہے۔ سارے جہان کو بھی وہ اگر برف سے ڈھکا ہوا دیکھتا ہے تو گھبراتا نہیں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خورشید کی ایک نظر سے یہ ساری برف پگھل جائے گی۔

گر جہاں پُر برف گردد سر بسر تابِ خور بگدازدش از یک نظر (رومی)

اس لئے وُہ اپنے ساتھیوں سے عجیب امید افزا لہجہ میں کہتا ہے۔

سوئے نومیدی مرو کامید ہاست سوئے تاریکی مرو خورشید ہاست

بے خوف زندگی بسر کرنے کا راز تم نے دیکھا بس یہی ہے کہ

(۱) قربِ حق میں زندگی بسر کرو کیونکہ

عمرِ خوش در قربِ جاں پروردن است عمرِ زاغ از بہرِ سرگیں خوردن است

(۲) حق تعالیٰ کے ہاتھوں میں نرم اور ملائم بن جاؤ، تاکہ ارادۃ اللہ جاری ہو جائے، رضائے حق تمہارا مقام ہو، "قیام فی ما اقام اللہ" حق تعالیٰ نے جہاں تمہیں کھڑا کیا ہے وہیں کھڑے رہو۔ رضا بالعطا، حفظِ حال تمہارا شیوہ ہو، ہر حالت میں خوش رہو، تصادم بالقضا سے بچو۔

۱؎ فتوح الغیب

جن تجربات سے گذر رہے ہو، اُن پر خدا کا شکر کہتے رہو کہ ان کا تمھیں موقع دیا گیا، ان ہی سے سیرت کی تکمیل ہوتی ہے، دُنیا کو "رُوح ساز" وادی کہا گیا ہے، یہاں کبھی غم کے مِضراب سے اُور کبھی خوشی کے تاروں سے سیرت کے خفتہ نغمے بیدار کئے جاتے ہیں۔ ان پر ہر حال میں شکر واجب ہے۔ کرب و بلا دونوں کی ایک سی قیمت ہے۔

بہ الفاظِ دیگر جن چیزوں سے تمھیں خوف ہو، اُن ہی سے پیار کرو، تو خوف سے تمھیں ہمیشہ کے لئے نجات مِل جائے گی۔

بس زبونِ وسوسہ باشی دِلا
گر طرب را باز دانی از بلا

دار وئے جان

"بازگشت دم بطبیبی دکاں	مرہمِ دل دارم و دار وئے جاں"

آفت وبلا، غم وحزن، اندوہ ودرد کے دفع کرنے کا طریقہ جس کی تعلیم خاص طور پر صوفیائے کرام نے دی ہے، جو سراپا دین قرآنی سے ماخوذ ہے، یہ ہے کہ بلا کے نزول کے وقت نظر مبتلی یعنی مبتلا کرنے والے پر لگی جائے، اور وہ حق تعالیٰ ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (سورہ تغابن ۱-) اللہ کے حکم کے بغیر کوئی مصیبت نہیں پہنچتی۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا (سورہ توبہ ۶-) کہہ دے ہم کو ہرگز نہ پہنچے گا مگر وہی جو لکھدیا اللہ نے ہمارے لئے۔

اور یہ ایمان واذعان تو حاصل ہے کہ "فعل جمیل حقیقی ہمہ از جمال است" "اللّٰهُ جَمِيْلٌ وَّيُحِبُّ الْجَمَالَ"، ہاں فرق صرف اس قدر ہوسکتا ہے کہ ایک جگہ جمال، جلال کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے اور دوسری جگہ جمال، جمال ہی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ بس ایک عاشق کے الفاظ میں

"بجز اضمحلال در رویت نعم وگم شدن وحیراں ماندن در التذاذِ آنہا کارے نباشد"

یعنی حق تعالیٰ کی نعمتوں کے مشاہدہ میں مضمحل ہوجانے اور اس کی لذت میں گم اور حیران ہوجانے کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں!

دوسرے الفاظ میں نزول بلا کے وقت قلب کو بلا پر مرکوز کرنے کے بجائے اسکو "جمیع مدارک و قوی" کے ساتھ مبتلی یعنی حق تعالیٰ پر مرکوز کرنا چاہیئے اور اس کے جلال کو جمال ہی کی ایک شان اور ایک طرح جان کر اس کی یاد، اس کے شکر سے اس قدر بھر دینا چاہیئے کہ لذتِ دید کے سوا کسی اور چیز کا خیال ہی قلب میں نہ آسکے! کسی پختہ کار نے اس کیفیت کو یوں ادا کیا ہے:

وصل تو چوں دست داد ملک جہاں گو مباش	لعل تو چوں حاصل است جوہر جاں گو مباش

عاشقِ روئے تو نیست طالبِ دُنیا و دیں — آرزوئے جاں توئی، کون و مکاں گو مباش
گردشِ گردوں اگر قطع شود گو بشو — حاصلِ فطرت توئی، دَورِ زماں گو مباش
بے تو نیرزد جوے ہرچہ بود در جہاں — مایۂ جاں ہا توئی، سُود و زیاں گو مباش

اس دید کا نتیجہ وہی ہے جو قرآنِ عظیم میں یوں بیان کیا گیا ہے

هُوَ الَّذِیٓ اَنْزَلَ السَّکِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِهِمْ (سورہ فتح - ۱)

وہی ہے جس نے قلوب مومنین میں اطمینان پیدا کیا تاکہ اور بڑھ جائے ان کا ایمان اپنے ایمان کے ساتھ۔

کیا یہ طریقہ آسان ہے؟ قابلِ عمل ہے؟ جب مصیبت نازل ہوتی ہے تو ہمیں تو یہ معلوم ہوتا ہے، کہ جوفِ معدہ میں اعصاب کی جو گتھی ہے اُس پر ہتھوڑے کی ایک ضرب پڑی، حواس میں اختلال پیدا ہو گیا۔ تلخیٔ بلا سے دل خون آلُود ہو گیا۔ خوف و حُزن کا تسلّط قلب و دماغ پر ایسا ہو گیا، کہ کچھ بھی سُوجھنے نہ لگا۔ اِس رنجِ رواں کے طوفان میں نفس و قلب و رُوح سب غرق ہو گئے۔

ہاں یہ سب کچھ صحیح ہے، لیکن کامل علاج صرف ایک ہے اور وہ فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰهِ اور تَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا پر عمل کرنا! نزولِ بلا کے وقت قلب کی توجّہ کا حق تعالیٰ کی طرف ہو جانا ہے۔ جو بلا میں مبتلا کرنے والے ہیں۔ اور خود مصیبت و بلا کی طرف سے ہٹ جاتا ہے۔ صوفیہ کے الفاظ میں "مستانہ وار ایک حملہ کرنا ہے اور علم سے نکل کر معلوم تک جا پہنچنا ہے[لہ]" یا عاشق وارفتہ کے الفاظ میں معاملہ کی صورت کا یہ ہو جاتا ہے:

قبلہ و محراب من ابروئے دلدار ست و بس! — ایں دلِ شوریدہ را بایں چہ و باآں چہ کار (حافظ)

عمل کے لئے علم ضروری ہے۔ علم قائدِ عمل ہے۔ یہاں تمہارے لئے کس علم کی ضرورت ہے مُبتلی کے تمام صفات کے معرفت کی ضرورت ہے۔ مُبتلی حق تعالیٰ ہیں۔ ہر بلا کا ظہور حق تعالیٰ ہی کے علم و حکم سے ہو رہا ہے اور حق تعالیٰ ہمارے مولیٰ ہیں، رحیم و کریم ہیں، رؤف و رؤف ہیں، محسن و منعم ہیں حق تعالیٰ کی ان صفات کی وجہ سے اُن کی رحمت کی اُمید کا ہمارے دل میں پیدا ہونا ضروری ہے اور حسنِ ظن کا قائم

لہ یک حملۂ مستانہ مردانہ بکردیم — از علم گذشتیم و بمعلوم رسیدیم

ہو نالازمی، اور یہ حُسنِ ظن شیخ جبلی ؒ کے الفاظ میں "حوالہ کردن مقاصد خویش بر سابقہ امر عنایت جناب الٰہی ست، و نظر قلب است بسوئے حق بے تطبیع فواد و بے تمنیہ ارواح و نفوس" یعنی اپنے تمام مقاصد کو حق تعالیٰ کی عنایتِ سابقہ کے حوالے کرنا ہے اور قلب کی نگاہ کا ان پر جم جانا ہے۔ ایسی حالت میں قلب سے طمع اور رُوح و نفس سے تمام تمنائیں نکل جاتی ہیں اور وہم و شیخ اُٹھتے ہیں۔

تو در دلی! بغمِ این و آں کہ پردازد؟ بجائے جاں کہ تو باشی بجاں کہ پردازد؟
ز ناز نیست ترا فرصت و مراد نیاز کنون بحالِ دلِ ناتواں کہ پردازد؟

صوفیۂ کرام کی اصطلاح میں یہ "جذبۂ خواص" ہے یعنی "توجۂ قلب بسُوئے حق مع انقطاع عما سواہ" قلب کا حق کی طرف متوجہ ہو جانا اور غیر حق سے کٹ جانا، غیر حق سے خالی ہو جانا ہے۔

دل یافت دیدہ کہ مقیم ہوائے تست (شمس تبریز)

یعنی "لَا مُرَادَ وَلَا الْاِرَادَۃَ" کا مقام کہلاتا ہے۔ اِس مقام کا انسان "جلالِ محبوب کو جمالِ محبوب سے بہتر خیال کرتا ہے، دَرد و اَلم کو انعام سے زیادہ تصوّر کرتا ہے۔ جانتا ہے کہ جمال و انعام میں محبوب کی مراد اپنی مراد کے ساتھ ملی جُلی ہوتی ہے اور جلال و ایلام میں خالص محبُوب ہی کی مُراد ہے اور اپنی مُراد کے برخلاف "شتّان بینھما"[1] اُس کے قلب کی کشش دائمی طور پر محبوب ہی کی طرف ہوتی ہے دُنیا و آخرت کی نعمتوں سے اس کا دل رہا ہو جاتا ہے، اس کو تمام احوال و مشاہدات سے یکسوئی و بے نیازی حاصل ہو جاتی ہے۔ حق تعالیٰ ہی سے دائمی آرام و آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی کو قرب و اتصال، وصال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

گشتہ ام در جہاں و آخر کار
دلبرے برگزیدہ ام کہ مپرس (حافظ)

دوسرے الفاظ میں اس حالت قلبی کو "فقر" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فخر کیا ہے "الفقر فخری"۔ فقر میں قبلۂ توجہ حق تعالیٰ کے سوا کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اسی فقر سے "غنا" پیدا ہوتی ہے جو حق سے کامل نیاز پیدا ہو جانے کی وجہ سے

[1] مجدد الف ثانی جلد سوم مکتوب ۶

خلق سے بے نیاز ہوجانے کا نام ہے۔

آں کس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند فرزند وعیال وخانماں راچہ کند

دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی ! دیوانۂ تو ہر دو جہاں راچہ کند

یہ حال تو منتہیوں کا ہے، ان کی نظر ذات بحت پر ہوتی ہے۔ ان کا قلب ماسوا اللہ سے فارغ و خالی ہوتا ہے مقصود و مطلوب بجز واحدِ مطلق کے کچھ نہیں رہتا۔ تمام مقاصد ان کے سینہ سے نکل جاتے ہیں اور ان کی ساری ہمت حق تعالیٰ کی رضامندی کے حصول میں صرف ہوتی ہے۔ زندگی کا مقصد ان کے نزدیک بس یہی ہے اور اسی طرف خلق کو وہ بلاتے ہیں

سررشتۂ دولت اے برادر بکف آر ویں عمر گرامی بہ خسارت مگذار

دائم ہمہ جا باہمہ کس در ہمہ کار می دار نہفتہ چشمِ دل جانب یار

بتدیوں کا حال اس کی بالکل ضد ہے! یہ اپنے خدا کو زندگی کے مصائب سے نجات پانے کے لئے استعمال کرتے ہیں، گویا کہ وہ ان کی خواہشوں اور تمناؤں کے پورا کرنے کا ایک آلہ ہے۔ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اس سے دعا کرتے ہیں۔ ان کا مطلوب و محبوب ان کی اپنی تمنائیں ہیں۔ ان کا سینہ ان کی اپنی خواہشوں اور آرزوؤں سے بھرا ہوتا ہے۔ ہر خواہش پر ان کا دم نکلتا ہے، تلخیوں سے ان کا دل پرخون ہوتا ہے۔ دراصل یہی آرزو و ارمان ان کے معبود ہیں! مصائب میں گرفتار ہونے کے بعد خوف و حزن لوازمِ قلب ہو جاتے ہیں۔ ان سے جب یہ کہا جاتا ہے کہ اپنے سینے سے مقاصد کی نفی کر دو اور قلب کی توجہ کو حق تعالیٰ پر مرکوز کرو۔ اپنے مصائب سے نظر اُٹھاؤ اور حق تعالیٰ پر اس کو قائم رکھو کہ یہی راحتِ جان کے حصول کا واحد طریقہ ہے۔

مکن رغبت بہ چیزے ورنہ حالت بے صفا گردد

برغبت آنچہ خواہی عاقبت برہان بلا گردد

بات تو ان کی سمجھ میں آتی ہے لیکن اس پر عمل ان کے لئے ناممکن سا معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ ناممکن نہیں۔ اس کا آسان طریقہ ہم بتلاتے ہیں اور وہ یہ ہے: مصائب کے نزول کے وقت

تجریدی طور پر خدا کی طرف توجہ واقعی ابتداءً ہی مشکل ہے۔ ایسے وقت قرآن کریم کی آیت پر توجہ مرکوز کی جاسکتی ہے۔ مثلاً اس آیت کو لیجئے۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (اپنے رب کے حکم پر صبر کر کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہی تو ہے)

اس آیت کے مفہوم کو سمجھ کر کہ حق تعالیٰ ہماری حالت سے واقف ہیں، ہم ان کی نگاہوں کے سامنے ہیں اور جو خنجر دوست پہ قربان ہو جاتا ہے وہ سر سے لے کر پیر تک جان ہی جان ہو جاتا ہے۔ ہم اس آیت کی تکرار کرتے جائیں تو ہمارا دلِ شوریدہ رفتہ رفتہ ساکن و مطمئن ہوتا جاتا ہے اور روح کو بتدریج روشنی و فہم عطا کی جاتی ہے، یہاں تک کہ ہمیں یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہے، اب بھی اور ایک کروڑ سال بعد بھی۔

مبتدی کے یہ بات گو سمجھ میں نہ آئے لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ہمارا کام نزولِ بلا کے وقت صرف اتنا ہے کہ قلب کو حق تعالیٰ سے مربوط کرلیں اور اس طریقہ سے سکینت و اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ مصیبت خواہ کتنی ہی بڑی ہو، قلب کی سنبھال اصل چیز ہے اگر کل ہمیں سولی ہی دی جانے والی ہو ہمیں آج صرف اتنا ہی کرنا ہے کہ قلب کی وسعتوں میں حق تعالیٰ کو گھیر لیں اور ان کے سوا کسی اور کی جگہ نہ چھوڑیں۔

در دل بجز یکے نشاید کہ بود ۔۔۔ در خانہ اگر ہزار باشد شاید!

اس کا طریقہ ابتداً میں یہی ہے کہ کسی موزوں آیت پر توجہ کو پوری قوت سے مرکوز کر دیں ابتداء میں ہمیں معلوم ہوگا کہ ہمارا قلب گویا ایک مینا بازار ہے جس میں شور و غوغا، چیخ و پکار کے سوا کچھ نہیں۔ ہمیں اس سے بچ نکلنا ناممکن معلوم ہوگا لیکن اگر ہم آیتِ کریمہ کی تکرار کرتے جائیں تو رفتہ رفتہ شور میں کمی ہوتی جائے گی۔ ہمیں ہمت و استقلال سے کام لینا ہوگا کیونکہ جوں ہی خیال آیت پر جمنے لگے گا پھر مصیبت کا تصور ہمیں پریشان کرنے لگے گا اور ہمیں پھر شروع سے کوشش کرنی پڑے گی۔ ایسا معلوم ہوگا کہ گویا ہم ایک عمیق غار میں ہیں، جس کی تمام دیواریں چکنی اور پھسلنی ہیں، ہم اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور پھسل کر نیچے گر رہے ہیں۔ گھڑی گھڑی چڑھ رہے ہیں اور

بار بار پھسل کر گر رہے ہیں۔ بہر حال ہمت و استقامت کی آخر میں جیت ہوگی اور ہمیں معلوم ہوگا، کہ توجہ آیت پر جم رہی ہے، اور خدا کی طرف نظر اٹھ رہی ہے اور سکون و اطمینان کی ایک لہر باطنِ قلب سے سر اٹھا رہی ہے۔

اس حالت یا مقام پر پہنچنے کے بعد ہماری تمنا صرف یہ ہوگی کہ حق تعالیٰ وہی کریں جس میں ہماری خیر ہو

ماکارِ خود بیار گرامی گذاشتیم　　گر زندہ سازد ار کشد رائے رائے دوست

اور ہماری زبان سے بے اختیار نکلے گا اللّٰھم خرلی واختر لی ولا تکلنی الی اختیاری

رسول کریمؐ نے ہمیں یہ دعا سکھلائی ہے کہ "اللّٰھم لا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین او اقل من ذٰلک" "مولیٰ ہمیں ایک لحظہ کے لئے یا اس سے بھی کم عرصہ کے لئے ہمارے اپنے نفس اور اس کی تمناؤں کے حوالہ نہ کر۔" ہمیں اپنی تمناؤں کی تکمیل کی کوشش کے بجائے اور زندگی کے معاملات کو اپنی رائے کے مطابق سنوارنے کے بجائے رضائے حق کا طالب بن جانا چاہیئے۔ احکامِ شریعت کی رعایت اور اخلاص و توجہ بحق کا دوام ہی ہماری دولت ہے۔ ع

ایں داشتہ باش گو دگر ہیچ مباش!

تو چوں گوئی دریں میداں بیندیش　　کجا خواہی رسید از کوششِ خویش

برو تسلیم چوں گان شو زمانے　　مگر یابی زحالِ خود نشانے

بہت سے لوگ ایسے بھی نظر آئے جو زندگی کی کسی تکلیف کو دور کرنے کے لئے برسوں درد و رقت کے ساتھ دعائیں کرتے رہے۔ آخر میں تھک کر اور "سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے" کہہ کر انھوں نے رضا بالعطا اختیار کیا۔ فوراً ہی ان کے حالات میں ایک ایسا تغیر پیدا ہوا جو ان کی آرزوؤں و تمناؤں سے بھی زیادہ بہتر تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دعائیں مرضئ حق کے مطابق نہ تھیں، اور انھوں نے کبھی قلب کی گہرائیوں سے نہیں کہا تھا۔

رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا　　میں اللہ کی ربوبیت سے راضی ہوں۔

انھوں نے ربوبیت کے بوجھ کو اپنے ہی کمزور کاندھوں پر اٹھالیا تھا اور اپنے کاموں کے خود رب

بن گئے تھے۔ اور جب بالآخر انھوں نے محسوس کیا کہ اس سے تو کام نہیں چلتا اور

من بدستِ دوست دادم اختیارِ خویش را

کہہ کر انھوں نے توافق بالقضا پر اپنے نفس کو آمادہ کر لیا اور

بگذاشتہ ام مصلحتِ خویش بدو — گر بکشد و در زندہ کند او داند

کہہ کر حضرت کریم سے تقاضا چھوڑ کر حسنِ ظن سے کام لینا شروع کر دیا تو ان کی ساری الجھنیں سلجھ گئیں۔ اسی لیے تو کسی عارف نے کہا تھا کہ

"سالک را دو حال باید یکے سوختن بے تکلف، دیگرے ساختن بے تصرف۔ کما قیل

کمالِ عاشقی پروانہ دارد

کہ جز از سوختن پروا نہ دارد

ہمیں نہ کسی سے لڑنا ہے نہ جھگڑنا، ہمیں صرف جاننا ہے کہ اس کائنات کے حوادث یومیہ واجب الوجود جل شانہ کے ارادہ سے پیدا ہوتے ہیں اور اسی کے فعل سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ لہٰذا اپنے ارادے کو حق تعالیٰ کے ارادے کے تابع بنا کر ان حوادث کو اپنی مرادیں سمجھنا چاہیے اور ان سے لذت حاصل کرنی چاہیے۔ اگر بندگی ہے تو یہ نسبت ضرور پیدا کرنی چاہیے، ورنہ بندگی سے پاؤں نکالنا اور اپنے مولیٰ جل شانہ سے مقابلہ کرنا ہے۔ حدیث قدسی میں آیا ہے:

مَنْ لَّمْ يَرْضَ بِقَضَائِي وَلَمْ يَصْبِرْ عَلَى بَلَائِي فَلْيَطْلُبْ رَبًّا سِوَائِي وَيَخْرُجْ مِنْ تَحْتِ سَمَائِي[1]

جو میری قضا سے راضی نہیں اور میری بلا سے صبر نہیں کرتا وہ میرے سوا کسی اور رب کو پیدا کر لے اور میرے آسمان کے نیچے سے نکل جائے۔

ہماری زندگی ایک روحانی کائنات میں بسر ہو رہی ہے، روحانی قوانین کے یہ زیر تصرف و حکمرانی ہے، روحانی قوتیں اس کو چلا رہی ہیں! تمام حوادث حق تعالیٰ ہی کے فعل سے ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ ہر تجربہ میں حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ اپنے ارادے کو حق تعالیٰ کے ارادے کے تابع بنا کر منتظر

[1] مکتوبات مجدد الف ثانی ج ۳ مکتوب ۵۹

اُن کے فضل پر چھوڑ کر قلب کو ساکن و مطمئن رکھیں اور لذتِ دید سے محظوظ ہوتے رہیں۔ غم دائم ہوائے نفس سے ہمیں خالی کرنے، ہمارے ارادے کو ارادۂ حق میں تبدیل کرنے آتے ہیں۔ ان تلخیوں کا مقصود ہمارے قلب سے ساری تلخیوں کو دور کرنا ہوتا ہے۔ اس راز کو ایک عاشق شیدا اپنے الفاظ میں حق تعالیٰ کی زبان سے یوں ادا کرتا ہے:

من ترا غمگین دہم گریان کنم — تاکنت از چشم بدت پنہاں کنم

ازاں بجوشانم کہ مکروہ نہی — بلکہ تا گیری تو ذوقِ چاشنی

زاں حدیثِ تلخ می گویم ترا — تا ز تلخیہا فروشویم ترا

تو ز تلخی چوں ہمہ مردود شوی — پس ز تلخیہا ہمہ بیروں شوی

اس ساری گفتگو کا کوئی یہ مطلب نہ سمجھ لے کہ ہمیں اپنے فرائضِ زندگی کی ادائی میں جد و جہد نہیں کرنی چاہیے، تعطل کی زندگی بسر کرنی چاہیے۔ نہیں یہاں تعطل حرام ہے۔ "التعطل حرام" ہمیں مردانہ وار قدم اٹھانا چاہیے، زندگی کے تمام فرائض کو جرأت و استقلال سے ادا کرنا چاہیے۔

شیر شو شیرانہ در صحرائے شیراں پا بنہ
مرد شو مردانہ پند ناصحاں را گوش گیر

ہمیں مجاہدانہ زندگی بسر کرنی چاہیے لیکن اسی دوران میں ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمیں صحیح وقت پر صحیح مقام تک پہنچایا جا رہا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کچھ ایسے مل جل کر کام کر رہے ہیں کہ انجام تعجب خیز طریقہ پر اچھا ہو رہا ہے۔ صاف طور پر نظر آنے لگتا ہے کہ حق تعالیٰ کا دستِ کرم ہماری رہبری کر رہا ہے۔ وہ حالات میں ترتیب و تطابق پیدا کر رہے ہیں۔ خود خدا ہی کی تدبیر ہوا کیا کرتا ہے۔ اس حالت میں ہم عقلِ معاش کے پرستاروں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

دلی اندر زلفِ لیلیٰ بند و کار از عقلِ مجنوں کن
کہ عاشق را زیاں دارد مقالاتِ خردمندی

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (ملک۔)

قرآن اور علاجِ حزن

بے خلشہا زیستن نازیستن
باید آتش در تہِ پا زیستن

زیستن ایں گونہ تقدیرِ خودی است
از ہمیں تقدیر تعمیرِ خودی است (اقبال)

ابتلاء یا آزمائش انسان کی تقدیر ہے، اور ابتلاء ہوتی ہے زندگی کی محبوب و مرغوب چیزوں کے روک لیے جانے یا فنا کر دیے جانے سے، ان پر آفات کے نزول سے، ان کے حصول میں مشکلات کے پیدا ہونے سے، خلش سے، درد و غم سے، رنج و الم سے، قلب کے تار ٹوٹنے سے یا زیادہ جامع الفاظ میں یوں کہو خوف سے، بھوک سے، جان و مال و ثمرات کے نقص و کمی سے، اور ابتلاء کا مقصد سیرت کی تعمیر ہوتی ہے، خودی کی پختگی ہوتی ہے، حیات کی زیادتی ہوتی ہے، قوت کی توفیر ہوتی ہے، خاص دوام رحمتوں اور راحتوں کا نزول ہوتا ہے اور جو شخص ابتلا سے بھاگنا چاہتا ہے، وہ ایک کلی و وجوبی قانون کی ہمہ گیر قوت سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے، اور نادانستہ طریقہ پر اپنا ہی نقصان چاہتا ہے، اپنی خودی کی تکمیل و تعمیر نہیں چاہتا، حیات و قوت کی توفیر نہیں چاہتا، وہ بھول جاتا ہے کہ

دوام ما ز سوزِ ناتمام است
چو ماہی جز تپش بر ما حرام است

مجو ساحل کہ در آغوشِ ساحل
تپیدِ یک دم و مرگِ دوام است (اقبال)

اپنے اس دعوے کی تائید میں ہم آپ کو کچھ دیر کے لیے فکر و نظر کی دعوت دیتے ہیں، اور کائنات و فطرتِ انسانی کے چند کلی و جزوی قوانین کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرتے ہیں۔

یک تنقیۂ دماغ می باید کرد!

انسان، احتیاج کا دوسرا نام ہے، انسان کی عضویت کی تحدید و تقیید ہی سے احتیاج

پیدا ہوتی ہے یعنی اس کی فطرت ہی میں احتیاج ہے، وہ حاجتمند ہے، فقیر ہے، اور درد نتیجہ ہے اسی فقر و احتیاج کا، اور فطری طور پر وہ اس درد کی دوا چاہتا ہے۔

عالم ہمہ در دست دوا میخواہد — از خوانِ کرم برگ و نوا میخواہد
کس بے حاجت نمی تواند دیدن — درویش غذا شہ اشتہا میخواہد
(سحابی استرآبادی)

اب اس عالمِ اسباب و علل میں جس کی تشبیہ انگارہ سے دی جاسکتی ہے، مجاہدہ اور عمل ہی سے احتیاج و فقر اور درد و غم بڑی حد تک دور کیے جاسکتے ہیں، جو اپنی بنیاد و اساس کے طور پر علم صحیح کو فرض کرتا ہے، مجاہدہ بغیر علم صحیح کے ممکن نہیں، اور علم صحیح عمل سے علیحدہ ہو کر نافع نہیں ہو سکتا، اس لیے ہم انہیں دو پہلوؤں کو یہاں اختصار کے ساتھ پیش کر کے اپنے دعوے کی تائید کرینگے۔

یاد رکھو کہ انسان کی زندگی اس معنی میں ہمیشہ خطرناک زندگی ہے کہ درد و غم، سوز و الم اس کی ماہیت میں داخل ہیں، کائنات کے اندرونی اسرار سے جو لوگ واقفیت رکھتے ہیں، ان کا یقین ہے کہ کائنات کا صمد حق تعالیٰ ہیں جو حکمت و خیر کے اعتبار سے مطلق و لا محدود ہیں، وہی اس کائنات پر حکمراں ہیں، حکم ان ہی کا چلتا ہے، مشیئت انہی کی نافذ ہو رہی ہے، لہذا یہ کائنات مظہر ہے خیر و حکمت کا، پھر درد و غم جو انسان کی زندگی کا ساتھ نہیں چھوڑتے، اور ہر رنگ میں انسان جو مبتلا رہتا ہے، اس میں کونسی حکمت ہے، اور خیر کا کونسا نمایاں پہلو ہے؟ الٰہی واقفانِ راز کا بیان ہے، کہ اہل ذکر یا مشاہدہ پر اس کی حکمت مبرہن ہے۔ اس کی توضیح تین قوانین کی شکل میں پیش کی جاسکتی ہے۔

(۱) درد و غم، سوز و الم نتیجہ ہے، جرم و معصیت کا، گناہ و بدکرداری کا، ذمائمِ اخلاق اور ان سے پیدا ہونے والے افعال و اعمال کا، اس راز کو قرآن حکیم نے اس آیت میں پیش کیا ہے:-

مَا اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا — تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں
کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ — [illegible] ہوئے کاموں سے ہے اور بہت سے تو

کثیر۔ (پ ۲۵ع ۵) درگزری کر دیتا ہے۔

اسی راز کو کسی اور جگہ زیادہ واضح الفاظ میں یوں ظاہر فرمایا گیا ہے:۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ	اور جس وقت تم کو ایک تکلیف پہنچی، کہ تم اس سے دو
مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ	چند پہنچا چکے ہو، تو کہتے ہو کہ یہ کہاں سے آئی، آپ فرما دیجیے
عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ	کہ یہ تکلیف تم کو تمہاری طرف سے پہنچی۔

صاحبِ کتاب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس اصول کی تفسیر میں فرمایا کہ اِنَّمَا هِيَ اَعْمَالُكُمْ تُرَدُّ عَلَيْكُمْ [1] یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو تم پر لوٹائے جاتے ہیں، قرآن و خبر سے اس راز کو معلوم کر کے حکماء وصوفیائے اسلام نے یہ اصول قرار دے لیا ہے کہ

اِن جمیع الوجود یقابلکم بحسب ما برز منکم من الاعمال فانظروا کیف تکونون فانّ الظل تابع للشاخص فی العوج والاستقامۃ (شیخ ابوالنجاء)

یعنی جو اعمال تم سے سرزد ہوتے ہیں ویسا ہی بدلہ بھی دیا جاتا ہے، اس لیے ذرا اپنے اعمال پر نظر رکھنا، کیونکہ ظل یا سایہ شخص کے تابع ہوتا ہے، اگر کوئی شے ٹیڑھی ہے، تو اس کا سایہ بھی ٹیڑھا ہوگا، اور اگر سیدھی ہے تو سایہ بھی سیدھا ہوگا جس نے توقع کی ٹیڑھی شے کا سایہ سیدھا ہو تو اس نے محال کی تمنا کی۔ مَن طلب استقامۃ الظل مع عوج الشاخص فقد رام المحال۔ اس لیے یاد رکھو اور خوب سمجھ لو کہ یہ جو سوز و غم تمہارے قلب کو کھائے جا رہا ہے یہ نتیجہ ہے تمہارے ہی اعمال بد کا، مثلاً جب تم کسی کو دیکھتے ہو کہ وہ تم کو ناحق آزار پہنچا رہا ہے، بے وجہ تکلیف دے رہا ہے، زبردستی ستا رہا ہے، تو ذرا سوچ کر دیکھو کہ کیا تم نے بھی اسی قسم کی حرکت کسی معصوم و مظلوم کے ساتھ نہیں کی تھی، جس نے تم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی تھی؟ ممکن ہے کہ فوراً یاد نہ آئے لیکن تحت الشعور نفس کی گہرائیوں میں یہ واقعہ ضرور مندرج ہے، وہ ایک روز تمہارے غور و فکر کرنے پر ظاہر و باہر ہو جائیگا، ہر حادثہ اور مصیبت کے وقت اسی قسم کی سوچ بچار

[1] انما ھی اعمالکم احصیھا علیکم فمن وجد خیرا فلیحمد اللہ ومن وجد غیرھا فلا یلومن الا نفسہ

سے کام لیا جائے اور دیانتِ فکری کو ہاتھ سے نہ دیا جائے تو آدمی بالآخر اس امر کا قائل ہو جاتا ہے کہ اللوم علی لا علیھم ملامت مجھ پر ہے، میرے دشمنوں پر نہیں، کیونکہ حقیقی معنی میں میرا دشمن کوئی نہیں، میں ہی اپنی ذات کا بڑا دشمن ہوں، دوسرے دشمن میری ہی طبیعت کے پیدا کردہ ہیں ؏

زادۂ طبع من اند آنانکہ خصمانِ من اند (خاقانی)

اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی جان و دل سے تصدیق کرنے لگیگا کہ اعدی عدوك نفسك التی بین جنبیك تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا وہ نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں میں ہے! درد والم تیرے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے، یداك کسبتا وفوك نفخ[1]

جو مصیبت و آفت، درد و غم، گناہوں کی عقوبت کے طور پر وارد ہوتے ہیں، ان کی پہچان بس یہی ہے کہ انسان نزولِ بلا پر صبر نہیں کرتا، اپنی جیسی بے بس و بیکس ہستیوں کی طرف اپیل کرتا ہے، جزع و فزع کرتا ہے، شکایتوں کا دفتر کھول دیتا ہے، 'مقامِ شکوی' میں داخل ہو جاتا ہے، اور 'مقامِ صبر' سے خارج ہو جاتا ہے، مصیبت کے دفع کرنے کا واحد علاج یہی ہے کہ اپنے اعمال کی اصلاح کی جانب توجہ کرے، اپنے نفس کا تزکیہ کرے، قلب کا تصفیہ کرے، اپنے سر کا اوہامِ باطلہ سے تخلیہ کر کے، خیر کی جانب لوٹے، نور کی طرف پلٹے ظلمتوں سے نکل جائے، غم والم کی تاریکیاں خود بخود دور ہو جائینگی، اور راحت و مسرت کا نور اس کی رگ وپے میں سرایت کرنے لگیگا۔

درد و غم وہ اشارات ہیں جو انسان کو اس کے اعمال کی جانب متوجہ کرتے ہیں، یہ خیر کی طرف ہدایت کرتے ہیں، ان کا وجود اس پر اسرار کائنات میں بے معنی نہیں، شرِ محض نہیں، یہ خیر کے تحقق کا زبردست آلہ ہیں، خیر کی منزل تک لیجانے کا نہایت قوی ذریعہ ہیں، یہ جرائم و معاصی کی ظلمتوں کو رفع کرنے میں نور کا کام دیتے ہیں، ایک لفظ میں یوں

---

[1] قول شیخ اکبرؒ۔ تیرے ہاتھوں نے کمایا، اور تیرے منہ نے پھونکا،

رکھو کہ یہ خام کو پختہ بنانے کے لیے ضروری ہیں، اقبال نے اسی مفہوم کو یوں ادا کیا ہے

جہانِ ما کہ جز انگارہ نیست | اسیرِ انقلابِ صبح و شام است
ز سوہانِ قضا ہموار گردد | ہنوز ایں پیکرِ گِل ناتمام است

سوہانِ قضا پیکرِ خاکی کے نقص و تحدید کو، کجی و خامی کو غم والم کے انگارہ سے دور کرتا جاتا ہے، اور اس کو کمال کی طرف کھینچ لاتا ہے!

(۲) بعض دفعہ درد والم، سوز و غم، معاصی و جرائم کی عقوبت کے طور پر نہیں عائد کیے جاتے، مقصود محض سزا دینا نہیں ہوتا، بلکہ تطہیر ہوتی ہے، تکفیر و تحمیص ہوتی ہے، شہوتوں اور لذتوں کے اتباع سے نفس میں تاریکی پیدا ہوتی ہے، اوامر الٰہی کی مخالفتوں سے قلب مردہ ہو جاتا ہے، درد و غم، سوز و الم نفس سے ظلمتوں کو رفع کرتے ہیں، مردہ قلب کو جِلاتے جگاتے ہیں، حق تعالیٰ کی طرف اس کا رُخ پھیرتے ہیں، جو نورِ مطلق ہیں، وہ ان کی طرف رُخ کرکے نورانی ہو جاتا ہے، اور گناہوں کی ساری تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں، بلاؤں اور مصیبتوں سے نفس دب جاتا ہے، ذلیل و خوار ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، شہوتوں اور لذتوں سے ٹوٹ کر ان سے جڑ جاتا ہے، ربط قائم کر لیتا ہے، غم سے زیادہ موثر تطہیر کے لیے کوئی اور شے نہیں، اور بلا آتی ہے اسی تطہیر کی خاطر ؎

ایں بلائے دوست تطہیرِ شما است (رومی)

اسی مقصود کو پیشِ نظر رکھ کر عارفِ روم درد و غم (قبض) سے رنجیدہ نہ ہونے کی تاکید فرماتے ہیں، اور اس کو سالک کے لیے مفید قرار دیتے ہیں۔

چونکہ قبض آید تو در وے بسط بیں | تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں
چونکہ قبضے آیدت اے راہ رو | آں صلاحِ تست آیس دل مشو

اس خیال سے صوفیائے کرام نے بلا و مصیبت کو حق کے انعامات سے زیادہ بہتر قرار دیا ہے، آلامِ محبوب بہ از انعامِ محبوب، بلا ہی عطا ہے، اور عطا پر غم کیسے، بلا از دوست عطا است و

از عطا نالیدن خطا است،

زخم چوں از تو رسد باہمہ آزار خوشیم　　　　که زآزار تو بیزار شود جان حسین

بلا وغم جب تکفیر و تمحیص کے لیے آتے ہیں تو اس کی صاف علامت یہی ہے کہ مبتلی جزع و فزع نہیں کرتا، صبر جمیل سے کام لیتا ہے، دوستوں اور ہمسایوں کے سامنے اپنی مصیبت پیش کر کے شکوی و شکایت نہیں کرتا، صبر کر کے بے حساب اجر کا اُمیدوار رہتا ہے۔

(۳) اور بعض دفعہ بلا و مصیبت محض تطہیر و تکفیر کے لیے بھی نہیں آتی بلکہ ارتفاعِ درجات اور بلوغِ منازلِ عالیات اس کا مقصد ہوتا ہے، یہ قانون اہل اللہ کے متعلق ہے، جنہوں نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا ہے، جن کے قلوب پاک و مصفی ہیں، جن میں ربط بحق قائم ہے، دیکھا جاتا ہے کہ کثرت سے بلائیں ان ہی پر نازل ہوتی ہیں، چنانچہ "البلاء للولا" لا دوستوں کے لیے ہوتی ہے، مشہور خاص و عام بھی ہے، اس قانون کو رازدانِ حقیقت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے۔ اذا احب اللہ عبداً ابتلاہ فان صبر اجتباہ و ان رضی اصطفاہ یعنی جب حق تعالیٰ بندے سے محبت کرتے ہیں تو اس کو مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں، اگر وہ صبر کرے تو اپنا پسندیدہ بنا لیتے ہیں، اور اگر راضی رہے تو برگزیدہ قرار دے لیتے ہیں، اسی لیے حضرت معروف رح فرمایا کرتے تھے:۔

لیس بصادق فی دعواہ من لم　　جو اپنے مولا کی مارسے لذت نہیں لیتا وہ سچا غلام
یتلذذ بضرب مولاہ۔　　ہی نہیں!

اس مفہوم کو کسی عاشق نے ان سریلے نغموں میں ادا کیا ہے:۔

گفت اگر تو عاشقی صبر کن و رضا طلب　　جاں بلب آمدز درد کردم از و دوا طلب
سر بفدائے یار کن ہیچ نہ خوں بہا طلب　　یار دمے کہ بر سرت تیغ زند تو دم مزن
محوِ مرادِ یار شو تا شود او بہ کام تو!
قابلِ التفات نیست عاشقِ مدعا طلب

انسان کی فطرت کے اقتضاآت وقابلیات کا جن کو حکیمانہ علم حاصل ہے، وہ اس راز کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ منازلِ عالیہ تک رسائی کے لیے درد وغم لابدی ولازمی ہے تقیید جو انسان کی فطرت ہے، اطلاق کے کسی درجہ کی متحمل نہیں ہوسکتی، درد والم ہی سے رفتہ رفتہ اضافی اطلاقیت پیدا ہوتی جاتی ہے، یہ اطلاقیت کیا ہے، نفس کی تحدیدات سے رہائی ہے ذمائم اخلاقیہ تحدید ہی کا نتیجہ ہیں، صفاتِ حسنہ کا پیدا کرنا مشقتوں کا برداشت کرنا ہے، تحمل مشاق موجب الم ہوتا ہے، لیکن ایک دفعہ جب صفاتِ حسنہ پیدا ہو جاتے ہیں تو انسان ترفع محسوس کرنے لگتا اور ہزاروں غموں سے نجات پاتا ہے، گو درد وغم کو وہ فطرۃً مکروہ سمجھتا ہے، لیکن نتائج سے واقف ہونے کے بعد وہ حق تعالیٰ کے اس قول کی تصدیق کرنے لگتا ہے کہ

عَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّیَجْعَلَ اللّٰہُ فِیْہِ خَیْرًا کَثِیْرًا

یعنی شاید تم کسی چیز کو برا جانو اور اللہ تعالیٰ نے اس میں خیر کثیر رکھی ہو،

اولیاء پر جو بلائیں نازل ہوتی ہیں، وہ ان کے درجات کے ارتفاع کے لیے ہوتی ہیں، حق تعالےٰ انہیں اپنا قرب عطا کرتے ہیں، فقر ونیستی میں انہیں مبتلا کرتے ہیں، درد وحزن ان پر طاری کرتے ہیں، ان سے ارشاد ہوتا ہے کہ البلاء کنز من کنوز الجنۃ لا یعطی الا باولیائہ۔

عشاق بلا کی اہمیت وقیمت سے واقف ہوتے ہیں مستانہ وار وہ اس کے طالب ہوتے ہیں کہ:

دردِہ قدح درد کہ آں می باید — درد دگہ زقسمت بیشتر می باید
تلخ ست عجب لیک بسے خوشگوار است — ہرچند بھی خورم دگر می باید

کبھی وہ اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر تسکین دیتے ہیں کہ

بفقر ونیستی یک دو روزہ خوش می باش
کہ یار خود ز کرم عذر خواہِ ما میگردد

ان کے نزدیک جان کے مقابلہ میں تن کی زیادہ قدر نہیں اور جان کی قدر بر توئے جاناں"

کی وجہ سے ہی، تن اگر تکلیف میں ہو، لیکن جان جاناں کے مراد کے مطابق ہو اور اس کے جمال سے کیف اندوز، تو پھر تن کی تکلیف کی کیا شکایت! اسی لیے بلا میں یہ عوام کالانعام کے خلاف:

(۱) کسی غیر کے آگے شاکی نہیں ہوتے، اور اپنی تنگ دلی کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اِنَّهُمْ لَنْ يُغْنُوا عَنكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا۔

ستم کشانِ محبت دم از فغاں بستند　　گرہ زجبہ کشادند و بر زباں بستند

(۲) اپنے باطن میں اتہام اپنے رب پر نہیں رکھتے، اس کی حکمتِ بالغہ میں انہیں کوئی شک نہیں ہوتا، وہ حق تعالیٰ سے یہ خطاب سنتے ہیں۔

با درد بساز چوں دوائے تو منم　　در کس منگر کہ آشنائے تو منم
گر بر سر کوئے عشقِ ما کشتہ شوی　　شکرانہ بدہ کہ خوں بہائے تو منم

(۳) انہیں یقین کامل ہوتا ہے، کہ حق تعالیٰ نے جو بات ان کے لیے اختیار کی وہی ان کے لیے دین و دنیا میں اچھی ہے۔

صلاحِ ما ہمہ آنست کاں تراست صلاح

"حدیث الولی" میں اس آخری نکتہ کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے بندوں میں کوئی ایسا بھی ہے کہ تونگری یا غنا کے سوا کوئی چیز اس کو صالح نہیں کر سکتی، اگر میں اس کو فقیر کردوں تو یہ فقر اس کے ایمان کو بگاڑ دے، اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کو فقیری و درویشی کے سوا کوئی چیز نیک نہیں بنا سکتی، اگر میں اس کو غنی کردوں تو غنا اس کے ایمان کو فاسد کردے اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کو صحت و تندرستی کے سوا کوئی چیز درست نہیں رکھ سکتی اگر میں اس کو بیمار کردوں تو وہ بیماری اس کے ایمان کو بگاڑ دے، اور کوئی ایسا بھی ہے کہ بیماری کے سوا کوئی چیز اس کے ایمان کو درست نہیں رکھ سکتی، اگر میں اس کو تندرست رکھوں تو یہ تندرستی اس کے ایمان کو فاسد کردے، مجھے اپنے بندوں کے احوال سے

پوری آگاہی ہے، اور میں ان کے مطابق اپنا کام کرتا ہوں۔

حق تعالیٰ کی ان ہی حکمتوں سے واقف ہو کر عشاق ان کی حسنِ تدبیر، قضا و اختیار سے راضی اور مطمئن رہتے ہیں، اور ہر حال میں رضا بالعطار اور "حفظِ حال" ضروری سمجھتے ہیں، اور قلب کی گہرائیوں سے ع

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست

کے قائل ہوتے ہیں، اِسی لیے گو وہ "طبعی" غم واندوہ میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن "عقلی سرور" سے ان کے قلب خالی نہیں ہوتے! یہ ہے "جمع بین الاضداد" اور "ضدوں کی جمع کا ہنر" ان ہی کو آتا ہے! رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ!

غرض طبعی حزن و غم کے لحاظ سے کلیہ یہ ہے کہ ع عالم ہمہ درد است و دوامی خواہد یہ درد یا تو گناہوں اور بدکرداریوں کا نتیجہ ہے، یا تطہیر و تکفیر کے لیے وارد ہوتا ہے، یا رفع درجات کے واسطے عائد کیا جاتا ہے، بہر حال

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ (پ ۳۰۲) ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا۔

کے کلی قانون کا کوئی استثنا نہیں دکھائی دیتا، انسان کی ساری عمر محنت اور دکھ، غم واندوہ میں گذرتی ہے، سوز والم میں بسر ہوتی ہے، وہ ایک موجِ بیقرار کے مانند ہے، جس کی ماہیت ہی میں پیچ و تاب ہے۔ چنانچہ اقبالؔ نے اس حقیقت کو خوب بیان کیا ہے۔

چہ پرسی از کجایم چیستم من؟ بخود پیچیدہ ام تا زیستم من

دریں دریا چو موجِ بیقرارم اگر بر خود نہ پیچم نیستم من

لیکن جیسا کہ اوپر واضح ہوا وہ درد و غم، سوز والم بے معنی نہیں، بغیر مقصد و غایت کے نہیں، اس کا مقصد خودی کی تعمیر ہے، قوتِ حیات کی توفیر ہے، اسی مقصود کو پیش نظر رکھنے سے انسان کو طبعی درد کی حالت میں بھی عقلی سرور حاصل ہو سکتا ہے، یعنی اس کو اپنی جہت سے غم ہی غم ہے لیکن حق تعالیٰ کی جہت سے سرور ہی سرور، اسی نکتہ کو سمجھ کر

عارف رومی نے فرمایا تھا۔

چوں بدانستی کہ ظلِ کیستی
فارغی گر مردی و گر زیستی
قطرۂ نوری سراپا نور باش
بگذر از غم دائما مسرور باش

فافھموا وتدبّروا!

زندگی میں غم کیوں ہے؟

یہ مقالہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے بارہویں اجلاس [illegible]
میں پڑھا گیا تھا۔

اگر غم را چو آتش دود بودے ۔۔۔ جہاں تاریک بودے جاودانہ
دریں گیتی سراسر گر بگردی ۔۔۔ خردمندے نیابی شادمانہ (شہید بلخی)

غم نتیجہ ہے احتیاج کا اور انسان سرتاپا احتیاج ہے، لہٰذا انسان غم کا پتلا ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ۔ رفع احتیاج ہی کے لیے وہ شب و روز حیران و سرگرداں رہتا ہے، تمام اسباب و علل کو کام میں لاتا ہے، درد کی دوا چاہتا ہے، احتیاج کا سلسلہ لا متناہی ہوتا ہے۔ ایک احتیاج کی تشفی ہوتی ہے، تو دس دوسری پیدا ہو جاتی ہیں، اور غم والم برابر جاری رہتا ہے، لہٰذا کلیہ یہ قرار پاتا ہے :۔

عالم ہمہ دردست و دوا میخواہد ۔۔۔ از خوانِ کرم برگ و نوا میخواہد
کس بے حاجت نمی تواند دیدن ۔۔۔ درویش غذا شہ اشتہا میخواہد (سحابی استرآبادی)

اس کلیہ کا استثناء اَلشَّاذُّ کَالْمَعْدُوْمِ کا حکم رکھتا ہے۔ جس کسی سے پوچھیے "میانِ دل چیست" جواب ملیگا، "درونِ سینہ سوزے و تفے"! اگر پوچھا جائے "تن چیست" کہیگا، "غم و رنج و بلا را ہدفے" کسی اور سوال کا انتظار کیے بغیر خود کہہ اٹھیگا، القصہ بہ قصدِ جاں ما بستہ صفے مرگ از طرفے و زندگی از طرفے۔

دل چیست؟ درونِ سینہ سوزے و تفے ۔۔۔ تن چیست؟ غم و رنج و بلا را ہدفے

له معارف میں جنوری [illegible] میں شائع ہوا۔

القصہ بہ قصد جانِ ما بستہ صفے — مرگ از طرفے و زندگی از طرفے (مومن یزدی)

مرضِ غم ہمہ گیر ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن یہ کلیہ بھی مسلّمہ ہے، کہ ہر مرض کا علاج مذہب اور فلسفہ اور نفسیات نے ہمیشہ پیش کیا ہے، کچھ دیر کے لیے آپ میرے ساتھ چند نسخوں پر غور کیجیے، ایک زمانہ سے میں نے ان کا اپنی ذات کے لیے اور دوسروں کے لیے بھی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے، میں پدرانہ نصیحت کے لیے نہیں کھڑا ہوں چند اساسی عقلی اصول کی طرف آپ کی عقلِ روشن کو متوجہ کرونگا، اگر یہ اصول آپ کی سمجھ میں آجائیں اور آپ ان کے استعمال پر راضی ہو جائیں تو شفایابی یقینی ورنہ تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں۔ غم کا حتمی و یقینی علاج مذہب پیش کرتا ہے، اس کی تائید فلسفہ اور نفسیات سے ہوتی ہے۔ اس علاج کے مختلف اجزا ہیں، پہلا جزو:

(۱) زندگی کے خیر ہونے کا یقین: اگر آپ خدا کے وجود کے قائل ہیں (اور اسی صورت میں میرا آپ سے روئے خطاب ہے) تو آپ بھی یہ مانتے ہیں کہ خدا ہمہ خیر ہے، خیرِ مطلق ہے، خیرِ محض ہے، نیز وہ ہمہ تواں یا قادرِ مطلق بھی ہے، آپ کا یہ بھی یقین ہے کہ ہر شئے کا صدور خدا سے ہوتا ہے، زندگی کا مبدء خدا ہے، اس لیے زندگی کا خیر ہونا بدیہی طور پر لازم آتا ہے، اگر معاذ اللہ خدا خیرِ محض نہ ہوتا تو اس سے شر کا صدور ممکن تھا، یا اگر خیرِ مطلق ہونے کے باوجود قادرِ مطلق نہ ہوتا تو سمجھا جا سکتا کہ وہ خیر کے پیدا کرنے میں مجبور ہے، لیکن خدا کو خیرِ مطلق و قادرِ مطلق مان کر زندگی کے شر ہونے کا یقین کرنا نہ عقل ہی کے مطابق ہے، نہ نقل کے، بتائیے مقدمات کے صحیح ماننے کے بعد منطقی نتیجہ سے گریز کیسے ممکن ہے؟ اور مقدمات کی توثیق مذہب اور وجدان سے ہوتی ہے، لہذا

ہر چہ ہست محض خیر و حکمت است — گر ترا زور حمت و گر زحمت است

زانکہ ناید فعلِ باطل از حکیم — فعلِ حق باطل نباشد اے سلیم

یہ دلیل تو میں نے اہلِ عقل کے لیے دی ہے، اہلِ عشق جن کی صفت "یومنون بالغیب" ہے

مبدأ کائنات کو خیر محض مانتے ہیں، اس کے گرویدہ ہوتے ہیں (أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ) اور زندگی کے خیر ہونے کا انہیں راسخ یقین ہوتا ہے۔ علاجِ غم کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ اس یقین کو پختہ کریں کہ دنیا اچھی، زندگی اچھی، زندگی کے تجربات اچھے، زندگی کے ساتھ تعاون کرنا اچھا، اس تعاون کے نتائج اچھے، انجام اچھا! اسی یقین، اسی "اللہ مستی" و "خود گزینی" کی وجہ سے آپ بیک وقت جست قنوطیت، یاس، غم واندوہ کی غلامی سے آزاد ہو جائینگے! اس معاملہ میں "بے یقینی" آپ کو ہمیشہ کے لیے رنج والم میں گرفتار رکھیگی، اقبال کی تہدید بھول نہ جائیے!

سُن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار غلامی سے بتر ہے بے یقینی

جب ہم یہ یقین کرلیں کہ زندگی اور اس کے تجربات اچھے ہیں، اور ہمیں ان سے خوشی کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے، اور پھر خوشی کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں تو ہم میں اور زندگی کے واقعات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے، اور حالات خود بخود سدھرنے لگتے ہیں، شادمانی وکامیابی نصیب ہوتی ہے، یہ ایک راز ہے، مذہبی زندگی کے تجربات کا، جو میں آپ پر فاش کر رہا ہوں!

یہ محض ایک اعتقادی بات نہیں ہے، بلکہ مسلمہ نفسیاتی اصول پر اس کی بنیاد قائم ہے، خیالات کا اثر افعال پر ہوتا ہے، اور افعال ہی آثار میں تغیر پیدا کرتے ہیں، قنوط و یاس خوف و حزن پیدا کرتے ہیں، اور یہ وہ سلبی جذبات ہیں جو قوائے عملی کو مفلوج بناتے ہیں، خیالات اور جذبات اگر سلبی ہوں تو سیرت اور قسمت کے سیہ رو ہونے میں باقی کیا رہتا ہے، کیونکہ نفس کا یہ ایک ہمہ گیر قانون ہے کہ خیالات ہی سے مقاصد کی تشکیل ہوتی ہے، مقاصد عمل میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، اعمال عادات کا تعین کرتے ہیں، عادات کی ترتیب و تنظیم سے سیرت بنتی ہے اور سیرت ہی تو قسمت ہے، انسان کی زندگی میں وہ دن نہایت ہی مبارک ہوتا ہے، جب اس کو اس امر کی یافت

ہوتی ہے کہ وہ خود ہی اپنی قسمت کا بنانے اور بگاڑنے والا ہے اس کی ذات ہی میں اس کے آلام کے اسباب پنہاں ہیں اور وہیں راحت وشادمانی کے علل کا نشان ملتا ہے! آفات کے نزول پر خدا کو ظالم اور اپنی ذات کو مظلوم ٹھہرانا نہ صرف الحاد ہے، بلکہ کج فہمی اور بے ذوقی بھی، جب تم خدا کو ہمہ خیر مان کر تمام اچھی صفات سے متصف کرتے ہو تو پھر اس کی طرف ظلم کی نسبت کیسے ہو سکتی ہے اور خدا ظالم بن کر لائقِ عبادت کیسے ہو سکتا ہے؟ اور جو لائق عبادت واستعانت نہ ہو وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے؟ اب اگر خدا پر یقین باقی رہ سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں کہ خدا کو ظالم نہیں عادل مانا جائے، اب ظلم کی نسبت ہمیں اپنی ذات کی طرف کرنی پڑیگی، اور اسی کو تمام مصائب وآلام کا مبدء قرار دینا پڑیگا۔ مَا اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ وَمَا اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَۃٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ۔

ان حقائق کے سمجھ لینے کے بعد تم جرأت کے ساتھ یقین کرلو کہ دنیا اچھی، زندگی اچھی اور اس کے واقعات وتجربات اچھے، نقص کجی، یا شر کہیں ہے، تو تمہاری ہی ذات میں ہے، مصائب کے نزول کے وقت قضاء وقدر پر اعتراض نہ کرو، بلکہ توافق بالقضاء سے کام لو، اس احساس کو قلب میں نہ آنے دو کہ تم پر ظلم ہو رہا ہے، اور تم قابلِ رحم ہو، کیونکہ اس احساس کے ساتھ ہی تم خدا کو ظلم سے متصف کرنے لگو گے، اور اپنے کو بے خطا وبے قصور قرار دوگے، اور تم نے دیکھا ہے کہ واقعہ ہمیشہ اس کے خلاف ہوتا ہے! اپنی ذات کو بے خطا وبے قصور سمجھنا جب کہ وہی تمام سوء کا مبدء ہو، کس قدر عظیم الشان مغالطہ ہے، ایسی صورت میں کیا اصلاحِ نفس کی گنجائش بھی باقی رہتی ہے؟ کیا ترقی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند نہیں ہو جاتا؟ جو شخص اپنی ہی جان پر ترس کھا رہا ہو، اپنی ہی قسمت پر آنسو بہا رہا ہو، اپنی ہی تقدیر کی شکایت میں ہمیشہ مصروف رہتا ہو، اور ساری دنیا کو اپنا مخالف سمجھتا ہو، میرے نزدیک اس قابل ہے کہ کوہِ ہمالیہ کی چوٹی سے نیچے گرا دیا جائے تاکہ اس کو بھی نجات ملے اور دنیا بھی خس وخاشاک سے پاک ہو جائے۔ اقبال ایسے ہی بدبخت سے مخاطب

ہو کر کہتا ہے:

اے ز جورِ چرخِ ناہنجار تنگ — جامِ تو فریادیٔ بیدادِ سنگ
نالہ و فریاد و ماتم تا کجا — سینہ کوبیہائے پیہم تا کجا
در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات — لذتِ تخلیق قانونِ حیات
خیز و خلاقِ جہانِ تازہ شو — شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو
با جہانِ نامساعد ساختن — ہست در میداں سپر انداختن
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں
برکند بنیادِ موجودات را — میدہد ترکیبِ نو ذرات را
میکند از قوتِ خود آشکار — روزگارِ نو کہ باشد سازگار
در جہاں نتواں گر مردانہ زیست — ہمچو مرداں جاں سپردن زندگی ست

یقین کی اساس قائم ہونے کے بعد عمل کی مشید عمارت اُٹھائی جانی چاہیے، اب تک ہم نے اس امر پر زور دیا کہ یقین درست کرنا چاہیے، یقین کہ زندگی اچھی چیز ہے، اور زندگی کے واقعات و تجربات اچھے ہیں، ان کے ساتھ تعاون ضروری ہے، یہ علاج غم کے نسخہ کا پہلا جزو تھا، اس کا دوسرا جزو عمل ہے، جس کو زندگی کے ساتھ تعاون کہا جا سکتا ہے۔

(۲) **عمل**، مبدء غم احتیاج، احتیاج کا دفعیہ عمل ہی سے ممکن ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ عمل ہمیشہ کامیاب ہی ہو، اور ساری احتیاجات کو رفع کر سکے، عمل کو کامیاب بنانے اور ناکامی کی صورت میں غم و اندوہ سے متاثر نہ ہونے کا بھی کوئی طریقہ ہو سکتا ہے؟ بات بڑی آسان ہوتی اگر انسان کی ساری احتیاجات عمل سے رفع ہو جاتیں، اور وہ محض چین و راحت کی زندگی بسر کر سکتا، عمل کے دو ہی نتائج ہو سکتے ہیں کامیابی یا ناکامیابی، عام طور پر فطرت کا یہی اصول ہے کہ مجاہد کے آگے دنیا اپنا سر جھکاتی ہے، مجاہد خطرہ ہی کی زندگی کو حقیقی معنی میں زندگی سمجھتا ہے ؎ اگر خواہی حیات اندر خطر زی۔ ناکامی سے یہ مایوس ہو کر

نالہ و فریاد، سینہ کوبی اور ماتم نہیں کرتا، کیوں؟ اس کے چند تیقنات و عقائد ہیں ان ہی کی تحلیل سے علاجِ غم کے دوسرے جزو کی تشریح ہو جائیگی۔

مجاہد زندگی کو جہادِ اکبر سمجھتا ہے، دشمنوں سے جنگ اور میدانِ کارزار کا جدال و قتال اس کے نزدیک "جہادِ اصغر ہے" اس کا بنیادی یقین یہ ہوتا ہے کہ حق بالاخر کامیاب ہوگا اور باطل کو شکست ہوگی، چونکہ وہ ہمیشہ حق کے غلبہ واستیلاء کے لیے جہاد کرتا ہے اس لیے اس کو یقین ہے کہ خدا سے نصرت و تائید کا پانا اس کا حق ہے۔ کَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ اس وعدہ اور یقین کی وجہ سے "احساسِ کمتری" یک لخت اس سے مفقود ہو جاتا ہے، اب وہ کامیابی کے یقین کی ناقابلِ مدافعت قوت کے ساتھ عمل کرتا ہے، اس کا ایمان ہوتا ہے کہ تمام حول و قوت من اللہ ہے، لاحول ولا قوۃ الا باللہ! وہ صرف اللہ ہی کو فاعل اور موثرِ حقیقی سمجھتا ہے، اور خود کو امین و خلیفہ، قوت و اثر و حرکت میں وہ اللہ ہی سے استعانت کرتا ہے، اور اسی کے سامنے سرِ عبودیت خم کرتا ہے، ذُلّ و افتقار کی اسی سے نسبت رکھتا ہے، عبادت و استعانت میں وہ اپنی نسبت صرف اللہ ہی سے رکھتا ہے، اور فانی عن الخلق ہوتا ہے، یعنی نہ مخلوق سے استعانت طلب کرتا ہے، اور نہ ان کے سامنے سرِ نیاز جھکاتا ہے کَفٰی بِاللّٰهِ وَكِيْلًا اس کا ماٹو ہے، فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا اس کا اصولِ عمل قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ اس کا طریقۂ کار حَسْبِيَ اللّٰهُ اس کا راحتِ جان کلمہ، ایک لفظ میں وہ موحد ہوتا ہے، اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا قائل و مصدق و عامل۔

اس یقین و عقیدہ کی تحریک سے اس کا ہر عمل پیدا ہوتا ہے، اب جیسا کہ ہم نے اوپر کہا عمل کے دو ہی نتائج ہوتے ہیں، کامیابی یا ناکامیابی، کامیابی میں وہ شکر کرتا ہے، کیونکہ وہ اس راز سے واقف ہے (جو ایک مسلم نفسیاتی اصول پر مبنی ہے) کہ شکر سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے، قوتِ عمل میں جوش پیدا ہوتا ہے اور تسخیرِ کائنات آسان ہو جاتی ہے۔ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ کا قطعی وعدہ اس کو مسرور کرتا ہے، وہ اس کامیابی اور نعمت کو خدا کی جانب سے سمجھتا ہے

اور خلق کی طرف اس کی نسبت نہیں کرتا، گو خلق ہی کے ہاتھ سے نعمت ملتی ہے، لیکن محض بمنزلۂ اسباب و آلات و ادواتِ نعمت ہوتے ہیں، قاسم و مجری و موجد و فاعل و مسبّبِ صرف اللہ ہی ہوتا ہے، اس لیے وہی شکر کا مستحق ہے، مثلاً جب تمہیں تمہارا کوئی دوست ہدیہ بھیجتا ہے تو تمہاری نظر اس خادم کی طرف نہیں جاتی جو یہ ہدیہ تمہارے یہاں لے کر آیا ہو، بلکہ اپنے دوست کے تم شکر گزار ہوتے ہو، جس نے تمہیں یہ بھیجا ہے۔ منعم حقیقی اللہ ہے "العاطی اللہ۔ وما بکم من نعمۃ فمن اللہ" اس ادراک سے نعمتِ زوال کے خطرہ سے آزاد ہو جاتی ہے، یہ ایک عظیم الشان حکمت ہے، جس کو بصیرتِ محمدیہ نے بنی نوع انسان کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس راز کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:

النعمۃ وحشیٌ فقیدّوھا بالشکر نعمت ایک وحشی جانور ہے شکر کی زنجیروں سے اس کو باندھو۔
یہ تفسیر ہے باری تعالیٰ کے اس قول کی کہ لَئِن شَکَرتُم لَاَزِیدَنَّکُم۔

موحد جب اپنی جد وجہد میں ناکام ہوتا ہے تو یاس و حُزن، خوف و الم کا شکار نہیں ہو جاتا، کیوں؟ اس لیے کہ وہ کائنات کے ایک قدیم راز سے واقف ہوتا ہے جو دفعِ غم کے لیے اکسیر ہے، اور جس کو بصیرتِ محمدیہ نے دریافت کیا ہے، وہ کیا ہے؟ یہی کہ بلاؤں پر صبر کرنے سے بلائیں نعمتوں میں مبدل ہو جاتی ہیں، ذرا نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس قانون پر غور کرو، مصائب کے نزول کے وقت صبر سے بہتر کوئی اور پہلو ذہن اختیار بھی کر سکتا ہے؟ حزن و یاس سے قوائے عمل مفلوج ہو جاتے ہیں، مصیبت کے مقابلے اور برداشت کی قوت فنا ہو جاتی ہے، تردد و فکر بھی عمل کے قاتل ہیں، تشتت اور پریشانی کو بڑھاتے ہیں، گلہ و شکوہ تو نامردی کی صریح علامت ہے، "کلبیت" استہزاء و استخفافِ غم کی دارو نہیں، بلاؤں کے نزول کے وقت جب انسان حق تعالیٰ کی گزشتہ عطاؤں کو یاد کر کے صبر کر لیتا ہے، تو حق تعالیٰ اس کے قلب کی حفاظت کر لیتے ہیں، مستغنی کر دیتے ہیں، اب بارِ غم سبک ہو جاتا ہے، برداشت کی قوت بڑھ جاتی ہے اور وہ انہی بلاؤں میں عطاؤں کو پاتا ہے۔

خود بلا و ابتلا رکی ماہیت کے متعلق مجاہد صحیح علم رکھتا ہے، ہر بلا ایک اخلاقی سبق دینے آتی ہے، یہ ہمارے کسی نہ کسی نقص کو رفع کرتی ہے، اور اخلاقی اعصاب کو قوی کرتی ہے، سیرت میں پختگی پیدا کرتی ہے۔ اس طرح ہمارے مراتب بلند کرتی ہے اور درجات میں ترقی دیتی ہے، یہ بظاہر شر ہے لیکن دراصل خیر کے تحقق کا ایک ناگزیر ذریعہ ہے، زندگی ایک مدرسہ ہے، واقعاتِ زندگی کے ذریعہ علمِ حقیقی ہمیں ہر روز سبق دے رہا ہے، اگر ہم میں عقل ہے تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ہر ناکامی میں ایک حکمت ہے اور ایک خاص عظمت۔ سوائے اس ناکامی کے تجربہ کے دنیا کی کوئی اور شے نہیں نہ یہ درسِ حکمت دے سکتی ہے اور نہ عظمت کے اس درجہ پر فائز کر سکتی ہے، ہر غلطی جو تم سے سرزد ہوتی ہے ایک اہم سبق سکھاتی ہے، اگر تم اس کی تحقیق کرو اور جو شخص کہ اس شے میں جو بظاہر شر معلوم ہوتی ہے، خیر کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہو وہ واقعات کا محکوم نہیں حاکم ہے، ناکامی اس کے لیے ایک صبا رفتار مرکب ہے جو اس کو بہترین کامیابی تک پہنچاتا ہے۔

بلا کی شدت اگر تمہیں بالکل ہی مغلوب کرلے، اور اس کے خیر اور فائدہ کے جز سے مستفید ہونے کے قابل نہ رکھے تو پھر تمہیں صبر ہی کے دامن میں سکون ملیگا، اور صرف مذہب ہی تمہاری دلجوئی کریگا، ان وعدوں اور بشارتوں پر غور کرو جو مومن صابر کے حق میں وارد ہوئی ہیں، اگر تم میں ایمان ہے اور ایمان کا ذوق بھی موجود ہے، تو یقیناً تمہارا غم ہلکا ہو جائیگا، صابر خدا کا محبوب ہوتا ہے اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ۔ دردمند صابر خدا کی معیت کا ادراک کرتا ہے، کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ، اس امر کا یقین کہ خدا میرے درد و غم سے واقف ہے، کیونکہ وہ میرے ساتھ ہی ہے، غم کی چبھن کو کم کر دیتا ہے، اور وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّكَ بِاَعْیُنِنَا کا حکم اور بشارت تو اس کو رقص میں لے آنے کے لیے کافی ہے! مشہور ہے کہ کسی عاشق پر سر بازار ننانوے تازیانے لگائے گئے اور اس نے آہ تک نہ کی، جب سواں تازیانہ لگا، تو اس نے آہ کرنی شروع کی، پوچھا گیا کہ اس آخری تازیانے پر آہ و بکا کیسی؟ کہا جس کے

سبب مار کھائی ہے، وہ ننانوے تازیانوں تک یہاں تماشائیوں میں موجود تھا، اور میری حالت دیکھ رہا تھا، اس لیے مجھے کچھ بھی درد محسوس نہ ہوا، آخری تازیانے کے وقت وہ چلا گیا، اور اس وقت میں نے درد محسوس کیا! ؎

با درد بساز چوں دوائے تو منم — در کس منگر آشنائے تو منم
گر بر سر کوئے عشقِ ما کشتہ شوی — شکرانہ بدہ کہ خوں بہائے تو منم (جامی)

صبر پر استقامت پیدا ہو جائے تو تسلیم و رضا کا آخری مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے، اب مجاہد صاف طور پر یہ محسوس کرنے لگتا ہے، کہ بلا از دوست عطاست و از عطا ئیدن خطا ست، البلاءُ کنزٌ مِن کنوز الجنۃ لا یُعطی اِلّا باولیائہ کی وہ تصدیق کرنے لگتا ہے، اب نہ شکوہ شکایت ہی کا امکان باقی رہتا ہے اور نہ جزع و فزع کا،

ستم کشانِ محبت دم از فغاں بستند — گرہ رجبہ کشادند بر زباں بستند

سچ ہے درد و غم کا قطعی علاج تسلیم و تفویض ہے اس کے سوا کچھ نہیں ؎

تسلیم نمی شوی ازاں غم گینی — تسلیم شو ہر انچہ آید پیشت

رضا بالعطا اور حفظِ حال سے نہ صرف غم ہی دور ہو جاتا ہے اور فرح و سرور کے دروازے کھل جاتے ہیں، بلکہ حق تعالیٰ بھی قطعی راضی ہو جاتے ہیں، اور جانتے ہو کہ ان کی رضامندی کا کیا نتیجہ ہوتا ہے؟

آنانکہ رضائے حق بجاں میجویند — درراہ رضائے دلبر می پویند
ہر یک ہمہ آں کند کہ حق فرماید — حق نیز ہماں کند کہ ایشاں گویند

قال علیہ السلام اِنَّ اللہ جازُ یرضی برضاھم ویغضب بغضبھم کما انھم یرضوا برضائہ ویغضبوا بغضبہ

چہ خواہی آن کند گر ہرچہ خواہد آں کنی
بجہ گوئی بشنود گر ہرچہ گفت او بشنوی

اے درد! تو بھی کیا نعمت ہے، تیری برداشت نے مجھے کیا سے کیا کر دیا!

دردہ قدحِ درد کہ آں می باید
دردیکہ ز تست بیشتر می باید
تلخ ست عجب لیک بسے خوش خوار است
ہر چند ہمی خورم دگر می باید

قرآن اور علاجِ غضب[1]

یہ مقالہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے چودھویں سالانہ اجلاس نومبر ۱۹۲۲ء میں پڑھا گیا۔

تا توانی خستہ مگرداں کس را ۔۔۔ بر آتشِ خشم خویش مستاں کس را
گر راحتِ جاوداں طمع میداری ۔۔۔ می رنج ہمیشہ و مرنجاں کس را (عطار)

انسان کی مادی و روحانی ترقی میں جو شئے سب سے زیادہ مانع و مزاحم نظر آتی ہے وہ جذبۂ غضب ہے! اس آتش فشاں جذبہ کے اشتعال کے وقت انسان انسان نظر نہیں آتا، بلکہ وہ ایک مہیب غار کا منظر پیش کرتا ہے جو دخانی آگ سے پُر ہے، جس میں سوائے خوفناک آوازوں اور جاں سوز چنگاریوں کے کچھ نہیں نکلتا، اسی لیے اہل غضب اپنا نسب شیطان سے ملاتے ہیں کیونکہ اسی نے تو کہا تھا کہ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ۔

ترا با چنیں تندی و سرکشی ۔۔۔ نہ پندارم از خاک از آتشی!

ایک غضبناک شخص کو اعصابی تناؤ کی حالت میں دیکھ کر حضرت حسنؓ نے خوب فرمایا تھا کہ اے شخص تو غصہ میں اتنا اُچھلتا ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ اب کی اچھال میں تو دوزخ میں جا پڑیگا۔ اس قابلِ نفرت جذبہ کے تسلط کے وقت انسان کی صورت پاگل یا درندے کی سی ہو جاتی ہے، دماغ اور اعصاب سیاہ دخانات سے بھر جاتے ہیں، نورِ عقل تاریک ہو جاتا ہے، خون میں زہر پیدا ہو جاتا ہے، دنیا تاریک نظر آنے لگتی ہے، اس تاریکی میں اس کو نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی دوستی اور محبت کے پاک رشتے، قرابت اور رحم کے مقدس تار، عزت و حرمت کے قیمتی روابط ایک ہی ضرب میں پاش پاش کر دیے جاتے ہیں،

[1] معارف فروری ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔

تندخو کا دنیا میں کوئی دوست نہیں، پاگل اور مجنوں کا کوئی دوست کیسے ہو سکتا ہے، اس کی قسمت میں سوزش و تپش لکھی ہوتی ہے، اسی سوز و غم کی وجہ سے وہ اطمینانِ قلب اور طمانیتِ خاطر سے محروم ہوتا ہے، اور جب قلب مطمئن نہ ہو تو بدن کیسے تندرست رہ سکتا ہے، اس جہانِ فانی میں شادماں زندگی کے نسخے کے یہی دو اجزا تو ہیں، صحیح و تندرست بدن اور مطمئن و آزاد ذہن تندخواں دونوں سے محروم! اس کی سیاہ بختی و سیاہ روئی میں کسی کو شک کیسے ہو سکتا ہے، اب سوز و تپش، غم و ہم، رنج و حزن کے سوا اس کے ہاں ذخیرہ کس چیز کا ہوتا ہے؟

سوز و تپش بقسمت ہر تند خو بود　　　برقِ از زبانِ حال مراجتہ جستہ گفت

غرض غضب کا جذبہ ہر برائی کی کنجی ہے، (حضرت جعفر صادق ؓ) بیوقوفی کی جڑ ہے، مسرت و شادمانی کا قاتل ہے، ایمان سوز ہے، اور طمانیت کش، اسی لیے جب بنی نوع انسان کے محسن اعظم آنحضرت صلعم (فداہ ابی و امی) سے کسی نے درخواست کی کہ مجھے اپنی زندگی کو سنوارنے کے لیے ذرا سا عمل بتلا دیجیے، تو آپ نے فرمایا لا تغضب یعنی تو غصہ نہ کر، جب اس نے دوبارہ یہی سوال کیا تو یہی جواب دیا گیا، اور تیسرے مرتبہ کے سوال کا بھی یہی جواب[1] ملا کسی دوسرے موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ حق تعالیٰ کے نزدیک کسی گھونٹ کا پینا اس قدر محبوب نہیں جس قدر کہ پی جانا غصہ کا[2]۔

قرآن کریم نے الْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ کی تعریف کی ہے، اور ان کے اتباع کی تحریص دتا کید۔

کیا اس خونخوار جانستاں جذبہ سے نجات ممکن ہے؟ علمائے نفسیات کا کیا خیال ہے؟ قرآنِ کریم نے کیا طریقے تعلیم کیے ہیں؟ کیا علم کی تصحیح عمل میں انقلاب پیدا کر سکتی ہے؟ کیا ریاضت و مجاہدہ غصہ کو محو کر سکتا ہے! انہی چند اعتبارات پر یہاں بحث کرنی مقصود ہے

ہشدار کہ رہ خود بخود گم نہ کنی؟

[1] رواہ البخاری　[2] رواہ احمد

سقراط نے ایک ازلی صداقت کو اپنے الفاظ میں پیش کر دیا تھا کہ "نیکی علم ہے" یعنی علم صحیح ہی سے نیک عمل پیدا ہوتا ہے، بشرطیکہ علم زبان ہی کی حد تک محدود نہ رہا ہو، بلکہ قلب میں بھی اترا ہو، تیقن کے درجہ تک پہنچا ہو، جو شخص علم کو زبان ہی کی حد تک محدود رکھتا ہے۔ اس کو زبانِ سنت میں "علیم باللسان" اور "جاہل بالقلب" کہا گیا ہے، اس کا شمار ان واعظوں میں ہوتا ہے جن کی شکایت حافظؒ نے اپنی اس مخلود الذکر شعر میں کی ہے:

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت میروند آں کار دیگر می کنند

علمِ صحیح بہر حال ضروری ہے، اور پھر اس کے مطابق عمل ہو تو فلاح انسان کے ہاتھ چومتی ہے، جذبۂ غضب کی تعدیل کے لیے بھی یہ دونوں ضروری ہیں، اس لیے ہم یہاں ان ہی دو کے متعلق دو باتیں عرض کرتے ہیں:-

(۱) علمِ صحیح:- یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ انسان کسی چیز کو محبوب رکھتا ہے اور کسی چیز کو مبغوض و مکروہ، وہ محبوب چیز کے حصول کے لیے کوشش کرتا ہے، اور اس کے تحفظ کا خواہاں و متمنی ہوتا ہے، اور مکروہ شئے سے بھاگتا ہے، اور اس کو دفع کرنا چاہتا ہے، یہ اس کی فطرت ہے، وہ اسی پر مجبول ہوا ہے، جب اس کی مخالفت کی جاتی ہے تو اس کو غصہ آتا ہے، بذاتِ خود غصہ بُری چیز نہیں، یہ مدافعت کا آلہ ہے، تحفظِ حیات کے لیے ضروری ہے، استمرارِ نسل کے لیے ناگزیر ہے، تنازع للبقا میں اس کا خاص مقام ہے، اس کے بغیر ارتقا میں نسلِ انسانی کا بقا ممکن نہ تھا، جس طرح کائنات خارجی میں عنصر ناری ضروری ہے اس کے عدم سے اختلال رونما ہوتا ہے، اسی طرح فطرت انسانی میں جذبۂ غضب بھی ضروری ہے، اس کے فقدان سے تباہی پیدا ہوتی ہے، موت لازم آتی ہے، اب غضب کے تین درجے ہوتے ہیں:-

(۱) تفریط: یعنی کمی، یہ بالاتفاق مذموم ہے، ایسے ہی آدمی کو بے غیرت کہا جاتا ہے۔

امام شافعی نے کہا تھا کہ جس شخص کو غصہ دلانے سے بھی غصہ نہ آئے وہ "گدھا ہے" حمیت و غصہ کا بالکل نہ ہونا بھی سخت برا ہے، اگر کسی شخص کی بیوی اس کے ساتھ خیانت کرے فحش کا ارتکاب کرے، اور وہ حلم سے کام لے تو بتاؤ کیا یہ عقلاً، شرعاً و عرفاً سخت مذموم نہیں؛ غصہ کا صحیح موقع پر استعمال ضروری ہے، حق تعالیٰ نے صحابہ کرام کی صفت "اشداءُ عَلَی الکفار" قرار دی، اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنَافِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ، ظاہر ہے کہ شدت و غلظت غضب کے بعد رونما ہوتی ہے، لہذا

قہر و لطف اندر محل خود نکوست   جائے گل گل باش جائے خار خار

(۲) افراط: یعنی زیادتی، یہ بھی بالاتفاق مذموم ہے، اسی سے نجات کے طریقوں پر یہاں غور کیا جا رہا ہے، جب غضب عقل و دین کی سیاست و قہرمانی سے نکل جاتا ہے تو انسان درندہ بن جاتا ہے، تمام دنیوی و روحانی اقدار سے محروم ہو جاتا ہے، جنون کا تسلط اس کے دماغ پر ہو جاتا ہے، اہلِ غضب کی فہرست میں اس کا شمار ہونے لگتا ہے، جن کے متعلق یہ کہنا سچ ہوتا ہے کہ ؎

سایۂ جن میں یہ انسان رہا کرتے ہیں

(۳) اعتدال: یہ درجہ محمود ہے، یہاں انسان کا غصہ عقل کی قہرمانی میں ہوتا ہے، دین کا مطیع ہوتا ہے، اس کے اشارہ کا منتظر ہوتا ہے، جہاں حمیت شرعاً واجب ہوتی ہے وہاں وہ شدت سے کام لیتا ہے، اور جہاں اس کا پی جانا ضروری ہوتا ہے وہاں وہ حد اعتدال سے نہیں بڑھتا، اپنے نفس کا مالک ہوتا ہے، جانتا ہے کہ ایسے موقع پر ؎

ہر کرا حلم نیست او چو ددست

ظاہر ہے کہ ہم یہاں غضب کے "استیصال" کی تعلیم نہیں دے رہے ہیں، بلکہ اس کے "اعتدال" کی، ہم غضب میں افراط و تفریط کو رفع کر کے وسط کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں، کہ خیر الامور اوساطہا۔

دیکھو غصہ کا کوئی معروض ضرور ہوتا ہے، یعنی اس کا تعلق کسی شئے سے ہوتا ہے، اب اس معروض کی تین شکلیں ہوتی ہیں۔

(۱) ایک وہ جو سب کے لیے ضروری اور لازمی ہے، جیسے غذا، لباس، مکان، صحت، جب ان پر حملہ کیا جاتا ہے تو شعلۂ غضب ان کے تحفظ کے لیے بھڑک اٹھتا ہے، حفاظت ذات و بقائے نسل کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر جاندار اپنے دشمن کا مقابلہ کرے اور ضروریات زندگی کے تحفظ میں شدت و قوت کا استعمال کرے، ورنہ وہ صفحہ ہستی ہی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائیگا، اور یہ فطرت کا مقصود نہیں، مجاہدہ اور ریاضت سے اس قسم کے غصہ کو محو کرنا ممکن نہیں، اور نہ ہی اس کی کوشش ہی کرنی چاہیے، کیونکہ یہ خلافِ فطرت ہے، اور غیر اختیاری، غیر اختیاری شئے پر حکم اخلاقی لگایا نہیں جاسکتا، ہاں یہاں بھی حدِ اعتدال سے تجاوز، ظلم و ستم ناروا ہے اور بتکلف حلم و برداشت کرتے کرتے تحمل کی عادت پیدا کی جاسکتی ہے۔

(۲) غصہ کے معروض کی دوسری قسم میں وہ اشیاء داخل ہیں، جو بعض کے لیے تو ضروری ہیں، اور بعض کے لیے غیر ضروری جیسے صنّاع کے لیے آلات و اوزار اور عالم کے لیے کتابیں، اگر ان محبوب اشیاء کو نقصان پہنچتا ہے، تو رنج ہوتا ہے، اور نقصان پہنچانے والے پر غصہ آتا ہے اس قسم کے غصہ کا بھی بیخ و بن سے استیصال نہیں کیا جاسکتا لیکن مجاہدہ سے غصہ کی شدت باطن میں باقی نہیں رہتی اور صبر کی خو پیدا ہو سکتی ہے، اور سختی صبر کا احساس کم ہو سکتا ہے۔

(۳) غصہ کے معروضات کی تیسری قسم میں وہ اشیاء شامل ہیں، جو کسی کے لیے بھی ضروری نہیں، جیسے مال و جاہ، خدم و حشم یہ عادۃً محبوب ہیں، لیکن قطعاً داخلِ ضرورت نہیں، یعنی ضروریاتِ زندگی میں ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا، یہ "تعیشاتِ محض" میں شامل

لہ مقالہ سر احیاءالعلوم باب غضب۔

ہوتے ہیں، جو غیظ و غضب ان کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے وہ ریاضت و مجاہدہ سے قطعاً قابلِ استیصال ہے، ہم یہاں جو کچھ عرض کر رہے ہیں، اس کا زیادہ تر تعلق اسی قسم سے پیدا ہوتا ہے۔

جب ہم غصہ کی نفسیات پر غور کر کے یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ اس کا انبعاث محبوب اشیاء کے فقدان یا ضیاع سے ہوتا ہے، تو ہمیں ایک صداقتِ کلیہ کا صحیح وجدانی علم حاصل ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ غیظ و غضب کا اصل مبدأ "حُبِّ اشیاء" ہے، جس طرح تمام حزن و ملال کا مبدأ بھی یہی حُبِّ اشیاء ہے، نیز تمام حمق و جہالت کا بھی مبدا یہی ہے، رفعِ غضب کے لیے سچ پوچھو تو تبدیلِ مزاج کی ضرورت ہے، جیسا کہ عارفِ روم نے فرمایا تھا کہ انما العلم بتبدیل المزاج اس تبدیلی کے لیے تنقیۂ دماغ ضروری ہے، جس کا انحصار تزکیۂ قلب پر ہے۔

اس کے لیے چند قرآنی اور نفسیاتی حقائق پر تجرید ذہنی کے ساتھ غور کرو، تم مال و دولت کو جو تمہارے قبضہ میں ہے، اپنی ملک سمجھتے ہو، کیونکہ تم اس پر متصرف ہو، اپنی مرضی سے خرچ کرتے ہو، اپنی مرضی سے ذخیرہ کرتے ہو، اپنے مالک ہونے میں تمہیں کوئی شبہ نہیں ہوتا، ناگہاں تم بیمار ہو جاتے ہو، دولت تمہیں حالتِ صحت میں جان سے زیادہ عزیز تھی، لیکن جب درد کی شدت تمہیں بیقرار کرتی ہے، تو مال تمہیں 'مار' نظر آنے لگتا ہے، تم اضطرار کے ساتھ طبیب کو طلب کرتے ہو، علاج معالجہ پر بے دریغ خرچ کرتے ہو، اسی چیز سے مفارقت گوارا کرتے ہو جو تم کو بہت زیادہ پیاری تھی، اب تمہیں معلوم ہوتا ہے کہ مال سے زیادہ محبوب شئے صحت ہے، یعنی درد و الم سے رہائی، اور سکون و آرام کا حصول، لیکن باوجود تمہاری تمام سعی و کوشش کے تمہیں صحتِ بدنی اور راحتِ قلبی حاصل نہیں ہوتی، تمہارے طبیب کا نسخہ اثر نہیں دکھلاتا، طبیب کے ابلہ ہونے کا تم کو یقین ہو جاتا ہے، اور تمہیں خوف ہوتا ہے کہ یہ کہیں اجل کی پیش قدمی کی علامت نہ ہو، اس سے زیادہ قابل طبیب تمہارے علاج میں مصروف ہوتے ہیں، تیر بہدف نسخوں کا استعمال ہوتا ہے لیکن تمہارا درد بڑھتا

جاتا ہے، اضطرار و اضطراب میں ترقی ہوتی ہے، تمہارا مال تمہاری جاہ و حشمت تمہارے خادم و نوکر اپنے تمام ذرائع کا تم استعمال کر رہے ہو لیکن ان سے تمہیں کوئی فائدہ کوئی نفع حاصل نہیں ہو رہا ہے، تم اپنی تکلیف، اپنے درد میں کسی قسم کی کمی نہیں پاتے، اب تمہیں یاد پڑتا ہے کہ تم نے کہیں پڑھا تھا، یا کسی سے سنا تھا کہ قُلْ لَآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا، الفاظ تمہارے ذہن میں ہیں معنی کا تمہیں کھلا فہم حاصل نہ تھا، وجدان میں ان کا تحقق نہ ہوا تھا، ان کے مصداق سے بے خبر تھے، اب شاید تمہیں پہلی دفعہ روشنی نظر آ رہی ہے، جہل کی ظلمت دور ہو رہی ہے، اپنی ہی ذات میں معنی کا تحقق ہو رہا ہے اور خود کو نہ نفع پر قادر پا رہے ہو، اور نہ ضرر کے دفع کی قوت ہی کا تمہیں احساس ہو رہا ہے، پھر تم مالک کس شئے کے ہو؟ تمہاری مالکیت سے تمہیں کیا فائدہ؟ اپنی محبوب ترین جان سے تکلیف کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے، درد کی شدت میں رتی بھر کمی نہیں کر سکتے، مال تمہیں اس لیے محبوب تھا کہ اس سے درد کا ازالہ ہوتا ہے، راحت حاصل ہوتی ہے، پھر یہ کیا ماجرا ہے، اس کا اثر کہاں گیا؟ جب مال کے اثرات تمہارے اختیار میں نہیں تو ایسے بے اثر مال کو لے کر کیا کرو گے؟ یہ تو محض ایک بار گراں ہے، اس سے تو کمر ٹوٹتی ہے، یہ پھر اتنا عزیز اتنا محبوب کیوں ہو؟ سچ پوچھو تو یہ تمہاری ملک بھی نہیں، یہ حق تعالیٰ کی ملک ہے لِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (پ ۲۸ ع ۱۳) اور وہی اس کے حقیقی مالک ہیں۔ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا (پ ۶) یہ تمہارا مغالطہ تھا کہ تم اس کو اپنی ملک سمجھ رہے تھے، اور اپنے کو اس کا مالک جان رہے تھے! سچ پوچھو تو تمہاری کوئی چیز ہی نہیں، تم اپنی ذات کے لحاظ سے فقیر محض ہو، اور حق تعالیٰ ہی غنی و حمید ہیں۔ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (پ ۲۲ ع ۱۶) حق تعالیٰ نے اپنی عنایت اور رحمت سے تمہیں دولت دی، عزت دی، مال و دولت تمہارے پاس امانت ہیں، تم امین ہو اس سے زیادہ نہیں، مالک و حاکم حق تعالیٰ ہیں، تمہیں حق امانت کا احساس

ہونا چاہیے، استردادِ امانت کا جب وقت آئے تو تمہیں خوشی کے ساتھ اس کو مالک حقیقی کے سپرد کردینا چاہیے، جانتے ہو استردادِ امانت کے مواقع کونسے ہیں؟ ان کی تفصیل کا یہ وقت نہیں، لیکن اتنا یاد رکھو کہ جب تمہاری دولت پر آفت آتی ہے، وہ تمہارے ہاتھوں سے چھین لیجاتی ہے، اور تم اس کو بچا نہیں سکتے، اور تمہارے قلب کے تار ٹوٹے جاتے ہیں تمہیں احساس ہوتا ہے کہ تم اپنی ملک سے محروم ہو رہے ہو، تو تمہاری نارِ غضب بھڑک اٹھتی ہے، یہی وقت اس علم صحیح کے تحضر کا ہے، کہ تم محض امین ہو، مالک نہیں، مالکِ حقیقی استردادِ امانت چاہ رہا ہے، متاعِ غیر پر تمہارا اختیار نہیں، تمہارا فریضہ ہے کہ تشکر و امتنان کے جذبات کے ساتھ امانت کو حوالہ کردو، غیظ و غضب کا کوئی موقع نہیں، بلکہ خوشی کا مقام ہے، دیانت دار امانت کے استرداد کے وقت ضیق محسوس نہیں کرتا، بلکہ اس کے قلب کو سرور و مسرت ہوتی ہے کہ اس نے اتنا عرصہ امانت کی حفاظت کی، شرائط مقررہ کے تحت اس پر متصرف رہا، اور بالآخر وقت مقررہ پر مالک حقیقی کے ہاتھ امانت سپرد کر رہا ہے۔

ہاں کیا تم جانتے ہو کہ تم پر ان بلیات کا نزول کیوں ہے؟ تمہارا مال تمہاری دولت آفتوں کا نشانہ کیوں بن رہی ہے اور تم غیظ و غضب کی آگ میں کیوں جھلس رہے ہو؟ کیا اس کا بڑا سبب یہی "خیانت فی الامانت" تو نہیں، جہاں تم نے اپنے علم کی تصحیح کی، اپنے کو امین جانا، اور امانت کے تصرف میں خیانت کو ترک کیا، اور شرائطِ معینہ کا خیال رکھا کہ فوراً تمہارے قلب کی حفاظت کردی جاتی ہے، اب وہ غصہ کی آگ سے محفوظ ہوجاتا ہے، اپنے فقر و امانت کا علم ہوجانے کے بعد وہ اپنی حاکمیت کے وہم سے بھی نکل آتا ہے، حاکم حقیقی وہ حق تعالیٰ ہی کو جاننے لگتا ہے، اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ کا اس کو یقین پیدا ہوجاتا ہے، اپنے حکم کی خلاف ورزی پر اس کو آگ نہیں لگتی، اس کا شعلۂ غضب نہیں بھڑک اٹھتا، حُبِّ جاہ کا خاتمہ ہوجاتا ہے، اور نتیجہ کے طور پر جذبۂ غضب کا بھی استیصال ہوجاتا ہے، اگر

مجھ پر وجدان میں یہ بات کھل جائے کہ میری ذات فقیرِ محض ہے، مالک نہیں مملوک ہے، حاکم نہیں محکوم ہے، رب نہیں مربوب ہے، مولیٰ نہیں عبد ہے، ہاں اگر اس حقیقت کا محض تعقلی علم نہیں، وجدانی تحقق ہو جائے تو اب میری نظر میں غضب کے سارے معروضات فنا ہو جاتے ہیں، مال و جاہ خدم و حشم کا تعلق میری ذات سے باقی نہیں رہتا، فقیر کو ان سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ یہ تو اس ذات کے لوازمات ہیں، جو غنی و حمید ہے جو مولیٰ و رب ہے، جو مالک و حاکم ہے۔

حق تعالیٰ ہی الٰہ ہیں، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ، وہی معبود ہیں اور مستعان اور ہم سب عبد، عبد اپنی ماہیت ہی کے لحاظ سے ذلیل ہے اور فقیر، اس کی یہ نسبت ذل و افتقار حق تعالیٰ ہی سے ہے، کسی غیر سے نہیں، وہ غیر اللہ کی نسبت سے غنی ہے، اور حق تعالیٰ کی نسبت سے فقیر، غنی کا فقیر سارے عالم سے مستغنی ہوتا ہے، جب قلب مومن پر اس توحید کا غلبہ ہو جاتا ہے، تو وہ ساری دنیا سے اور دنیا کی تمام محبوب و مرغوب چیزوں کی محبت سے آزاد ہو جاتا ہے

رفت آنکہ بقبلۂ بتاں رو آرم — حرفِ غم شاں بہ لوحِ دل بنگارم
آہنگِ جمالِ جاودانی دارم — حسنے کہ نہ جاوداں ازو بیزارم (جامی)

اور تم اوپر یہ دیکھ چکے ہو، کہ غیظ و غضب کی اصل و منشا حُبِ اشیاء فانیہ ہے، لا الٰہ الا اللہ سے قلب کا تزکیہ اور روح کا تجلیہ ہوا کہ حب اشیاء فنا ہوئی اور اس حب کے فنا ہوتے ہی غضب کی بھی بیخ کنی ہو گئی!

(۲) مجاھدہ:- اس علم صحیح کے حصول کے بعد اب تمہیں مجاہدہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے، مجاہدہ علم کے قلب میں نفوذ و سریان کے لیے ضروری ہے، مجاہدہ سے علم کا استقرار ہوتا ہے، تلوین جاتی ہے، تمکین پیدا ہوتی ہے، مجاہدہ ہدایت کے راستوں کو کھولتا ہے، حصول مقصود کا یہی واحد ذریعہ ہے، تمہارے سامنے جو علم صحیح اوپر پیش کیا گیا ہے، اس پر تدبر ضروری ہے، تفکر لازمی ہے، فجر کا وقت اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے،

اس وقت اعصاب رات کی استراحت کی وجہ سے تازہ دم ہوتے ہیں، قلب کو سکون ہوتا ہے، دماغ افکارِ دنیوی سے نسبتہً خالی ہوتا ہے، ایسے وقت تمہیں زندگی کے کاروبار شروع کرنے سے پہلے اس ازلی وابدی صداقت پر غور کرنا چاہیے، اس کو قلب کی گہرائیوں میں اُتارنے کی کوشش کرنی چاہیے، کہ مالک حاکم حق تعالیٰ ہیں الحکم ان ہی کا چلتاہے، ہر چیز ان ہی کی ملک ہے، وہی رب ہیں اور وہی مولیٰ، ہم ان ہی کے فقیر ہیں، انہی کے در کے سائل ہیں' وہی ہمارے معبود ہیں، وہی مطلوب، وہی محبوب، وہی مقصود ان کو رکھ کر میں کسی چیز کا محتاج نہیں، میں غنی عن الشئ ہوں، ہر شے سے برتر، مجھ ہی سے ارشاد ہوا ہے،

لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ — تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے تم اُس پر رنج نہ کرو، اور جو

وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ — چیز تم کو عطا فرمائی ہے اس پر اتراؤ نہیں۔

(پ ۲۷ ع ۱۹)

کیونکہ ؎

عالم بطفیلِ ماست موجود — مائیم زکائنات مقصود!

جوں جوں تمہارا مراقبہ، تمہارا تفکر وتدبر عمیق ہوتا جائیگا، تمہارا نقطہ نظر بدلتا جائیگا، اور یاد رکھو کہ نقطہ نظر ہی کے بدلنے سے خودی میں انقلاب پیدا ہوتا ہے اور خودی کے انقلاب سے کائنات کے چارسو بدل جاتے ہیں ؎

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چارسو بدل جائے (اقبال)

اسی انقلابِ مزاج سے تمہارے قلب سے اشیاءِ فانیہ کی محبت محو ہوتی ہے، اور غصہ کا مبنیٰ ہی مسمار ہو جاتا ہے، جب تک تم نے اپنے کو مالک وحاکم جانا، امانت میں تم نے خیانت کی، امین نہیں غاصب ٹھہرے، غاصب کو جہاں کہاں امن وچین لینے دیتاہے، تم میں اور کائنات میں توافق نہیں تخالف وتنازع قائم ہوگیا، اب ہر واقعہ تمہارے غضب کو بھڑکائیگا، جب تم نے اپنا نقطہ نظر بدلا حق تعالیٰ کو مالک وحاکم جانا اور خود کو اُن کا

مملوک و محکوم، آدابِ امانت سے واقف ہو گئے، تو آب کائنات میں اور تم میں توافق پیدا ہو جائیگا اس توافق کے بعد انبعاثِ غضب کا کوئی موقع نہیں پیدا ہو سکتا۔

تسلیم نمی شوی ازاں غم گینی ۔۔۔ تسلیم شو ہر آنچہ آید پیشت!

اسلئے تمھیں دورانِ تفکر میں رضا بالقضائ کے اعتبارات پر خاص طور پر توجہ کرنی چاہیئے۔ دیکھو مدبّرِ امر" درحقیقت کون ہیں؟ حق تعالیٰ ہیں یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ، جب وہ مدبّر ہیں، جب امر و حکم ان ہی کا چل رہا ہے، تو ان کی تدبیر کے ساتھ حسنِ رضا درکار ہے، نہ کہ غصّہ و غضب! دیکھو، حق تعالیٰ کی ذات کامل، ان کے صفات کامل، ان کے افعال کامل، اور خود ہی خالق (خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ) تو اب بات تمھارے ذہن میں جم جانی چاہیئے کہ ع ہر چہ از دوست می رسد نیکو است

دیکھو حق تعالیٰ مومن پر رحیم ہیں کَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا، اب اگر تم میں ایمان ہے، اسکی حفاظت تم نے کرلی ہے تو اب ہر واقعہ تمھارے لیئے بشانِ رحمت ہی پیش آئیگا گو بصورتِ قہر کیوں نہ نظر آئے کیونکہ حق تعالیٰ تم پر رحیم ہو کر تمھارا نقصان روا نہیں رکھتے، جب اس صداقت پر تم غور کروگے اور تمھارے قلب پر وہ مسلّط ہو جائیگی، تو بے اختیار تمھاری زبان سے یہ پُر ترنّم الفاظ نکلنے لگیں گے۔

خواہی ز وصال شادماں دار مرا ۔۔۔ خواہی ز فراق بہ فغاں دار مرا

من با تو نہ گویم کہ چساں دار مرا ۔۔۔ زانساں کہ دلت خواست چناں دار مرا (خیّام)

یہ مجاہدہ کا انجام ہوگا لیکن اس غایت کا حصول یکدم نہیں ہوتا، تمھیں اپنے کام میں لگے رہنا چاہیئے اور ہمت و استقلال سے قدم بڑھائے جانا چاہیئے۔ کامیابی بالآخر مجاہد کے ہاتھ چومتی ہے، اور کَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ کا وعدہ اس کے لیئے پورا ہو کر رہتا ہے۔

اندریں رہ می تراش و می خراش ۔۔۔ تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

دوست دارد دوست ایں آشفتگی ۔۔۔ کوششِ بیہودہ بہ از خفتگی

کارکے کن تو و کاہل مباش ۔۔۔ اندک اندک خاک چہ را می تراش

چوں ز چاہے می کنی ہر روز خاک ۔۔۔ عاقبت اندر رسی در آبِ پاک

چوں نشینی بر سرِ کوئے کسے ۔۔۔ عاقبت بینی تو ہم روئے سے

دُعا کا فلسفہ

ہم دُعا از تو اجابت ہم ز تو ایمنی از تو مہابت ہم ز تو

دعا حق تعالیٰ سے مانگ ہے اور مانگا یہ جاتا ہے کہ وہ اپنی قدرتِ مطلقہ کا ہماری زندگی میں ظہور فرمائیں! ہمارے ضعف میں اُن کی قوت کا ظہور ہو، ہمارے فقر میں اُن کی غناء کا ظہور ہو، ہماری ذلت میں اُن کی عزت کا ظہور ہو، ہمارے عجز میں اُن کی قدرت کا ظہور ہو، اِسی صورت میں یعنی حق تعالیٰ کی قدرتِ مطلقہ کے ظہور ہی کی وجہ سے ہماری دعا قضا یعنی تقدیر کو بھی پھیر سکتی ہے لَا یَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ (رواہ الترمذی) اسی وجہ سے دعا سے بڑھ کر حق تعالیٰ کے یہاں کوئی چیز بزرگ تر نہیں لَیْسَ شَیْئٌ اَکْرَمَ عَلَی اللّٰہِ مِنَ الدُّعَاءِ (رواہ الترمذی وحسنہ) اسی بنا پر دعا ہر بلا سے بچاتی ہے، خواہ وہ نازل ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو اِنَّ الدُّعَاءَ یَنْفَعُ مِمَّا نَزَلَ وَمِمَّا لَمْ یَنْزِلْ اور اسی کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فَعَلَیْکُمْ عِبَادَ اللّٰہِ بِالدُّعَاءِ "اس لئے اے خدا کے بندو دعا کرو" (رواہ احمد والترمذی) ہمیں اپنے ضعف، فقر، عجز و ذلت کا بدیہی احساس ہے! اس احساس و وجدان کے باوجود اگر ہم دعا کے ہاتھ قادرِ مطلق ہستی کی طرف نہ اُٹھائیں یعنی اس کی قدرت کا اقرار اور اپنے عجز کا اعتراف نہ کریں تو یقیناً یہ چیز حق تعالیٰ کے رضا کا باعث نہ ہوگی۔ (رواہ الترمذی)

دُنیوی زندگی میں جب ہم کسی دوست سے کوئی کام کرنے کو کہتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہم اس سے مل کر اپنا کام بتلاتے ہیں اور اس صورت میں وہ ہمارا کام کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح جب ہم حق تعالیٰ سے کچھ عرض کریں تو ہمیں ایک بنیادی صداقت کو مان کر عرض کرنا پڑتا ہے اور وہ بنیادی صداقت یہ ہے، حق تعالیٰ قریب ہیں، مجیب ہیں، اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ

(سورہ ہود) وہ ہمارے قریب ہیں اور سن رہے ہیں۔ اِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ (سورہ سبا) ان کی رحمت ہم پر محیط ہے، قریب ہے اِنَّ رَحْمَةَ اللهِ قَرِيبٌ (اعراف)

ایمان کی زندگی کا آغاز اسی وجدان سے ہوتا ہے: اِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُّجِيبٌ! وہ ہماری رگ جاں سے زیادہ قریب ہیں۔ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (۵۰، ق ۱۶) دعا کے وقت ہم کسی بہری اور غائب ہستی کو نہیں پکار رہے ہیں، ہم اس ہستی کو پکار رہے ہیں جو سمیع و بصیر ہے اور ہم سے بہت زیادہ قریب ہے۔ اِنَّكُمْ لَا تَدْعُونَ اَصَمَّ وَّلَا غَائِبًا اِنَّكُمْ تَدْعُونَ سَمِيعًا بَصِيرًا۔ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَهُ اَقْرَبُ اِلٰى اَحَدِكُمْ مِنْ عُنُقِ رَاحِلَتِهٖ (متفق علیہ)

ہماری زندگی کا پہلا قدم حق تعالیٰ کے حضور و شہود کا کامل یقین و اذعان ہے! بجائے اس وہم و امید کے کہ ہم زندگی کے کسی آخری مرحلہ پر حق تعالیٰ کے قرب و حضور کا تحقق کر سکیں گے ہمیں آج ہی کامل ایمان و اذعان کے ساتھ کہنا چاہیئے:

حق تعالیٰ آج میرے قریب ہیں، اقرب ہیں، محیط ہیں، ساتھ ہیں، اُن کے وعدے سچے ہیں اُن کے ہاتھ فضل و کرم سے پُر ہیں، اُن کی نعمتیں کامل و دراز ہیں، ان کی رحمتیں وسیع و کشادہ ہیں۔ وہ مجھے ہر تجربہ سے سلامتی و امن کے ساتھ نکال کر خیر کثیر کی طرف رہنمائی فرما رہے ہیں۔

یا عالماً بی ویا قریباً منّی ویا شاھداً علیّ
مَوَاعِيدُكَ صَادِقَةٌ اَيَادِيكَ فَاضِلَةٌ نِعْمَتُكَ سَابِغَةٌ رَحْمَتُكَ وَاسِعَةٌ
اُنْظُرْ اِلَيَّ مِنْكَ بِنَظْرَةِ رَحْمَةٍ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ

ہم اب حق تعالیٰ سے اسی طرح باتیں کر سکتے ہیں جس طرح بچہ اپنے باپ سے باتیں کر سکتا ہے! محبت سے، ادب سے، عجز و انکسار سے، پورے اعتماد و وثوق سے عرضِ مدّعا کر سکتے ہیں! وہ ہمارے ساتھ بالذات حاضر و موجود ہیں۔ اِنَّ اللهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ! وہ ہر چیز کے ساتھ حاضر ہیں، اُن سے کوئی چیز جو معلوم کی جا سکتی ہو یا دیکھی یا سنی جا سکتی ہو غائب نہیں ہو سکتی۔ اُن کا ارشاد ہے:

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (پ ۱۱ ع ۱۲)

"تم جس حال میں ہوتے ہو، یا قرآن سے کچھ پڑھتے ہو یا تم لوگ کوئی (اور) کام کرتے ہو، جب اس میں مصروف ہوتے ہو، ہم تمہارے سامنے ہوتے ہیں اور تمہارے پروردگار سے ذرّہ برابر بھی کوئی چیز پوشیدہ نہیں، نہ زمین میں نہ آسمان میں اور نہ کوئی چیز اس سے چھوٹی ہے یا بڑی، مگر کتاب روشن میں لکھی ہوئی ہے۔"

اس ارشاد سے ہمیں صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ وہ ہم سب کے ساتھ بالذات حاضر ہیں، اس لئے وہ ہمارے ہر حال، ہر فعل اور ہر مصروفیت کو بالمشاہدت جانتے ہیں! ہمیں اپنا حال روشن کرنے کے لئے کسی مشقت اور کسی جدوجہد کی ضرورت نہیں، وہ ان حالات کے شاہد ذاتی ہیں۔ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا "تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے" وہ کہہ رہے ہیں! جب ہمیں کوئی حاجت ہو تو ہمیں اس حاجت کو ان کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ اور پھر اس کی طرف سے اپنی توجہ کو ہٹا لینا چاہیئے اور ان ہی کی ذاتِ مبارک پر اپنی پوری توجہ مسلسل مرکوز کر دینا چاہیئے اور اس امر کا یقین کر لینا چاہیئے، کہ ان کے کمالِ قدرت کا ظہور ہو رہا ہے اور ان کا ارادہ ہمارے خیر بہتر کے ظہور میں کارفرما ہے،

ارباب حاجتیم و زبانِ سوال نیست

در حضرتِ کریم تقاضا چہ حاجت است

یہی دعا اجابتِ حق کا تحقق ہے: حق تعالیٰ قریب و مجیب ہیں اور فرماتے ہیں اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (بقرہ آیت ۱۸۶) "جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔" فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ط اسی لئے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "دعا عبادت ہے، تمہارے رب نے کہا ہے، کہ تم مجھ سے دعا کرو، میں قبول کروں گا (رواہ احمد و اہل السنن) اسی وجہ سے دعا کے وقت اجابت کا قوی یقین رکھنا چاہیئے، اُدْعُوا اللّٰهَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَةِ۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے

فرمایا تھا کہ جس چیز کی بھی تمھیں خواہش ہو، اس کے لئے حق تعالیٰ سے دعا کرو، اور جب دعا کرو تو اس کے قبول ہونے کا یقین رکھو اور وہ چیز تمھیں حاصل ہو گی۔"

دعا کے وقت سب سے زیادہ اہم یہی چیز ہے کہ ہم اجابتِ حق پر یقین رکھیں اور اچھی طرح مان لیں کہ حق تعالیٰ کے نزدیک کوئی مسئلہ نہ چھوٹا ہے نہ بڑا۔ ان کے لئے ہر چیز آسان ہے، وہ ہر شے پر قادر ہیں اِنَّ تَیْسِیْرَ کُلِّ عَسِیْرٍ عَلَیْکَ یَسِیْرٌ، اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ وَ بِالْاِجَابَةِ جَدِیْرٌ، نِعْمَ الْمَوْلٰی وَ نِعْمَ النَّصِیْرُ! اس لئے کامل یقین و وثوق کے ساتھ ہمیں اپنے قلب کے رُخ کو حق تعالیٰ کی طرف پھیر دینا چاہیئے، یہ جانتے ہوئے کہ وہ ہماری حاجت سے واقف ہیں، اور اس کی تکمیل فرما رہے ہیں، جب حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں تو پھر ہمارے تمام خوف بے بنیاد ہیں فضول ہیں، ذرا اُس شخص کا تصور تو کرو جو ایک سرسبز و شاداب وادی سے گذر رہا ہے، لیکن یہ غم اس کو کھائے جا رہا ہے کہ اس کے سامنے تو ایک دریا ہے اور وہ اس کو عبور نہیں کر سکتا حالانکہ دریا پر پُل بھی ہے اور وہ نہیں جانتا! یا اس شخص کا تصور کرو جس کے ساتھ سفر میں ایک دانا و بینا، قوی و عزیز دوست ہے جو رہ و رسمِ منزل سے بخوبی واقف ہے، جو اس سفر کا کامل نقشہ بنا چکا ہے اور یہ یقین دلا چکا ہے کہ اس سفر میں کوئی اتفاقی حادثہ تک پیش نہیں آئے گا، اس پر کامل اعتماد کیا جا سکتا ہے، اس پر بھی یہ مسافر پریشان ہے!

مومن کا قلب احمقانہ خوف سے خالی ہوتا ہے وہ "حبل اللہ" کو مضبوط پکڑ کر ہمت و مردانگی سے زندگی کے میدان میں قدم اُٹھاتا جاتا ہے اور کل کے مسائل اس کو پریشان نہیں کرتے، وہ حق تعالیٰ پر کامل توکل و اعتماد رکھتا ہے:

قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَاۤ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰىنَا وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ط (۹، توبہ ۵۱)

"کہہ دو کہ ہم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی بجز اس کے کہ خدا نے ہمارے لئے لکھ دی ہو، وہی ہمارا کارساز ہے اور مومنوں کو خدا ہی پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔"

اجابتِ دعا کے یقین کے ساتھ اپنی حاجت کارسازِ حقیقی کے سامنے پیش کرنے کے بعد دعا

کی قبولیت پر ہمیں حق تعالیٰ کا شکرادا کرنا چاہیئے، یہ جان کر کہ کوئی جدید ایجاد، نہ برق نہ مقناطیس، نہ زر، ہمارے اندر اس قوت کا کروڑواں حصہ بھی پیدا کرسکتی ہے جو ہم میں حق تعالیٰ کی لامتناہی قدرت پر بھروسہ کرنے سے پیدا ہوسکتی ہے، ہم حق تعالیٰ کا شکرادا کرتے ہیں، اس شکر کے ادا کرنے سے ہمارے شعور کے مُقفّل دروازے کُھل جاتے ہیں اور ہم اس قابل ہوجاتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے لامحدود انعامات کو قبول کرسکیں اور ان کی نعمۃِ سابغہ و رحمتِ واسعہ کا مظہر بن سکیں! حق تعالیٰ کا شکر نہ صرف اُن نعمتوں پر جن کا ہم نے اپنی گذشتہ زندگی میں تجربہ کیا ہے، بلکہ اُن بے شمار نعمتوں پر جو ہماری آئندہ زندگی میں ظاہر ہونے والی ہیں، ایک کامل آزاد شاد و بامراد زندگی میں داخل ہونے کا سب سے زیادہ یقینی اور سب سے زیادہ آسان طریقہ ہے، ہمیں نہ کسی چیز کی فکر کرنی چاہیئے نہ کسی چیز کا غم! حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ پر یقین اُن کی گذشتہ و آئندہ نعمتوں پر شکر، مشکلات کے پہاڑوں کو اُڑا کر بکھیر دے گا اور زمین کو ہموار میدان کر چھوڑے گا:"

يَنسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا! (۲۰، طٰہٰ ۱۰۵)

ختم دعا پر ہمیں کہنا چاہیئے،

اَنْتَ غِيَاثِيْ فِيْ كُلِّ كُرْبَةٍ فَلَكَ الْحَمْدُ!	ہر بڑے غم میں تو ہی میرا فریادرس ہے، خدایا تیرا شکر!
وَاَنْتَ رَجَائِيْ فِيْ كُلِّ شِدَّةٍ فَلَكَ الْحَمْدُ!	ہر سختی میں تو ہی میری اُمید ہے، خدایا تیرا شکر!
اَرْجُو الْخَيْرَ فَتُيَسِّرُهُ وَاَخَافُ الشَّرَّ	میں تجھ سے خیر کی اُمید رکھتا ہوں اور تو اُسے آسان کردیتا ہے اور ہر شر سے ڈرتا ہوں۔
فَتَصْرِفُهُ فَلَكَ الْحَمْدُ!	اور تو اس کو دفع کردیتا ہے، خدایا تیرا شکر!
وَاَرَيْتَنِيَ الثَّنِيَّاتِ فَلَكَ الْحَمْدُ!	خوشی کے مارے میرے اگلے دانت دکھلا دیتا ہے خدایا تیرا شکر!
بِيَدِكَ مَوْتِيْ وَحَيَاتِيْ فَلَكَ الْحَمْدُ!	میری زندگی و موت تیرے ہاتھ ہے، خدایا تیرا شکر!

حق تعالیٰ کی ذاتِ قادر پر بھروسہ، اس سے پیدا ہونے والی مسرت و شادمانی، تمام مصائب و آفاتِ زندگی کا کامل علاج ہے، اسی لئے کہا گیا ہے:

شادیٔ جاوید کُن از دوست تُو!
تا نہ گنجی ہمچو گُل در پوست تُو!

"شادیٔ جاوید" یا دائمی خوشی اس وجہ سے کہ حق تعالیٰ ہمارے مولیٰ ہیں، "نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ" اچھے مولیٰ اور اچھے مددگار ہیں، لامتناہی قدرت و قوت کے مالک ہیں، ہم اپنے اسی یقین وجدان کا اظہار کرتے ہیں، اس کی تکرار کرتے ہیں اور اس قوت سے تکرار کرتے ہیں کہ تمام شر کی قوتیں جو ہمارے خلاف صف آرا ہیں، راہِ فرار اختیار کرتی ہیں اور بالآخر فنا ہو جاتی ہیں، یہی ہمارا نعرۂ جنگ ہے:

وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ
اِنَّ الْقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا!
اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُوالْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ!
اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ!
کَانَ اللّٰہُ عَلٰی ذٰلِکَ قَدِیْرًا!

کسی حاجت کے وقت اگر ہمارے قلب کی نظر حق تعالیٰ کی قوت و قدرت پر جم جائے تو اس قوت کا اظہار ہم میں ہونے لگتا ہے! دیکھو، جس چیز کا بھی ظہور ہماری زندگی میں ہوا ہے، اسی وقت ہوا ہے جب ہم اس سے واقف ہوئے ہیں اور اس کو قبول کیا ہے۔ یہ ایک کلی نفسیاتی قانون ہے! یہ کلی بھی ہے اور ضروری بھی، اس کا اطلاق ہر تصور پر، ہر مادی شے پر ہوتا ہے، جو ہمارے علم میں آتی ہے، یا ہماری ملک بنی ہے، اسی لئے یہ چیز اہلِ عقل و اہلِ نقل دونوں کے نزدیک مسلّم ہے کہ جب ہم حق تعالیٰ سے کوئی چیز مانگتے ہیں تو ہمیں اجابت کا یقین کرنا چاہیئے، یعنی یہ یقین کرنا چاہیئے کہ ہمیں وہ چیز مل چکی اور صرف اسی صورت میں وہ چیز ہماری ملک بن جاتی ہے یہی تفسیر ہے اُدْعُوا اللّٰہَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَۃِ کی۔

حق تعالیٰ قادر و قوی ہونے کے علاوہ رحیم و ودود بھی ہیں، رؤف و رحیم بھی ہیں غفور و

رحیم بھی ہیں، رحمٰن و رحیم بھی ہیں، البر الرحیم بھی ہیں، إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا اُن کا محبت بھرا ارشاد ہے، یہ جان کر کہ ہم اپنے قادر توانا، رؤف و رحیم مالک کی بیشمار نعمتوں و رحمتوں کو شکر و امتنان کے جذبات کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں تاکہ اُن کا کامل ظہور ہماری زندگی کی ہر جہت ہر پہلو میں ہو! محبّت و شکر سے سرشار رُوح بے اختیار چیخ اُٹھتی ہے۔

اے جانِ من، جانانِ من، صد جانِ من قربانِ تو!

بے لطف تو من قرار نتوانم کرد — احسان ترا شمار نتوانم کرد

گر بر تنِ من زباں شود ہر موئے — یک شکر تو از ہزار نتوانم کرد (ابوسعید ؒ)

اسی نکتہ کو شیخ جیلی ؒ نے اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا تھا:

"اہلِ ولایت می دانند کہ حضرتِ حق تعالیٰ جمیع ما یحتاج الیہ ایشاں را مہیا ساختہ و مقرر نمودہ است، پس بسببِ علم خویش از رنج تقاضا فارغ اند! پس بہتر است کہ رجا در حق ایشاں حسن ظن باید گفت نہ تقاضا، حسن ظن بحضرت حق تعالیٰ معرفت جمیع صفات باری است و امید رافت و رحمت اوست، از جہت او سبحانہٗ تعالیٰ نہ از جہت بندہ، زیرا کہ صفاتش محسن و کریم و رحیم و لطیف و رؤف و ودود است و حسن ظن بحضرت حق تعالیٰ حوالہ کردنِ مقاصد خویش بر سابقہ امر عنایت جناب الٰہی است و نظرِ قلب بسوئے حق تعالیٰ بے تطمیع فواد و بے تمیزِ ارواح و نفوس"

(منقول در جواہر غیبی صفحہ ۳۴۰)

یعنی اولیا، جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے ان کی تمام احتیاج کی چیزیں مہیا کر دی ہیں اور مقرر فرما دی ہیں، اپنے اس علم کی وجہ سے وہ تقاضا کے رنج سے فارغ ہو چکے ہیں۔ لہٰذا بہتر ہے کہ ان کے حق میں رجا یا امید کو حسن ظن سے تعبیر کریں نہ کہ تقاضے سے! حق تعالیٰ سے حسن ظن ان کے تمام صفات کی معرفت ہے، ان کی نرمی، مہربانی و رحمت سے امید ہے، یہ حق تعالیٰ کی جہت سے، نہ کہ بندہ کی جہت سے، کیونکہ حق تعالیٰ کی صفات محسن و کریم و رحیم و لطیف و رؤف و ودود ہیں،

اور حق تعالیٰ سے حسن ظن کے معنی یہ ہیں کہ اپنے تمام مقاصد کو حق تعالیٰ کی عنایت سابقہ کے حوالہ کر دیا جائے، اور قلب کی نگاہ اُن پر جم جائے، ایسی حالت میں قلب سے طمع اور رُوح و نفس سے تمام تمنائیں نکل جاتی ہیں، اور ہم چیخ اُٹھتے ہیں:

تو در دلی بغم این دآں کہ پردازد | بجائے جاں کہ تو باشی بجاں کہ پردازد
زناز نیست ترا فرصت و مرا ز نیاز | کنوں بحالِ دلِ ناتواں کہ پردازد

اوپر کے ارشادات سے معلوم ہوا:

(۱) دعا پر ہم مامور ہیں، اُدعونی نیز فعلیکم عباد اللہ بالدعا! اور دعا فطری ہے، ہماری فطرت کا تقاضا ہے۔

(۲) دعا کے بعد ہمیں اس کی اجابت پر اس کے قبول ہونے پر یقین رکھنا چاہیئے اُدعوا للہ وانتم موقنون بالاجابۃ!

حق تعالیٰ چونکہ محسن وکریم ورحیم، لطیف ورؤف وودود ہیں، اُن کی نعمتیں ورحمتیں ہم پر محیط ہیں، ہماری زندگی میں اُن کا ظہور اُن کے قبول کرنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ یہ ایک کلی وضروری ونفسیاتی قانون ہے۔ اس کی ہمیشہ پابندی کرنی چاہیئے۔ دعاء کرنے کے بعد قلب کی نگاہ حق تعالیٰ کی اُن ہی صفات پر جم جانی چاہیئے اور شعور کے دروازے ان صفات کے ظہور کے لئے کھول دیئے جانے چاہئیں۔ دن کے مختلف اوقات میں قلب کی کشش ونگرانی حق سبحانہٗ تعالےٰ کی اُن ہی صفات کی طرف ہونی چاہیئے۔

سزد کہ از ہمہ کس چشم وگوش بر بندیم | تمام چشم و ہمہ گوش کردہ مارا (درد)

(۳) دعا کے بعد اس کی قبولیت پر صمیم قلب سے شکر ادا کرنا چاہیئے، انسانی تخیل کی بلند ترین پرواز بھی حق تعالیٰ کی ان نعمتوں ورحمتوں کا اندازہ نہیں کر سکتی جو اس نے بندۂ مومن کے لئے فراہم کر رکھی ہیں۔ فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین

ہمارے ان اشارات پر عمل کرتے ہوئے اب تم اپنی کسی ضروری حاجت کا تصور کرو۔

(۱) اس کو حق تعالیٰ کے حضور میں پیش کرو، دعا کرو اور کہو یا رب اِنَّکَ مَلِیْکٌ مُّقْتَدِرٌ مَا تَشَاءُ مِنْ اَمْرٍ یَکُوْنُ۔ حق تعالیٰ آپ مقتدر بادشاہ ہیں جو چیز آپ چاہتے ہیں وہ ہو جاتی ہے

(۲) دعا کی اجابت پر کامل یقین رکھتے ہوئے اس حاجت کی تکمیل پر منعم حقیقی کا شکر ادا کرتے رہو

(۳) اب اپنی حاجت اس کی مشکل، درد، حزن کا خیال مت کرو، بلکہ حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر نظر رکھو کہ وہ اس حاجت کی تکمیل کر رہی ہے نفس و قلب و روح کی تمام قوتوں کے ساتھ حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کو اس حاجت کی تکمیل کی صورت میں نمایاں ہوتے ہوئے دیکھتے رہو! تمہاری دعا، مرتبۂ غیب میں اب بھی مستجاب ہو چکی ہے۔ اگر تمہاری نظر اس اجابتِ حق پر جمی رہے اور زبان سے اس کی تکمیل کا تم شکر ادا کرتے رہو تو اس کا ظہور مرتبۂ غیب سے مرتبۂ ظہور میں بھی نمایاں ہو جائیگا۔ ابو سعیدؒ کی بات سنو وہ حق تعالیٰ کے ارشاد کی نقل فرما رہے ہیں۔

در حضرتِ ما دوستی یکدلہ کن — ہر چیز کہ غیرِ ماست اتر ایلہ کن
یک صبح با خلاص بیا بر درِ من — گر کارِ تو بر نیاید انگہ گلہ کن

اس طریقے سے دعا کرتے رہو تمہیں گلہ کا موقع نہ رہے گا۔ یا تو تمہارا مقصود حاصل ہو جائے گا یا مقصود ہی بدل جائے گا اور تم مستانہ وار چیخ اٹھو گے

نمی خواہیم بجز زلفِ تو زنجیر — زہے دیوانۂ عاقل کہ مائیم

لہ حضرت سعید بن المسیب تابعی رح کا قول ہے کہ جو شخص ان کلمات کو پڑھ کر اس کے معنیٰ کا تحضر کر کے دعا کرے تو وہ دعا قبول ہوگی۔ انکی جاننے والے سے وہ دعا سیکھ لو جن کے توسّل سے دعا قبول ہوتی ہے ۱۲

دعاء اور دفع بلا

اگر آپ کا کوئی عزیز، آپ کا محبوب آپ سے ہزاروں کوس دور غم والم میں مبتلا، بلاؤ مصیبت میں گرفتار ہو اور آپ سے دعاء کا طالب ہو تو آپ جانتے ہیں کہ دعاء کے ذریعہ اس کی تائید کا بہترین طریقہ کیا ہے؟ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ جو طریقہ خود ہمیں اپنی بلاو مصیبت، خوف و حزن کو دفع کرنے میں کام آتا ہے بالکل وہی اس محبوب کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے! اس کی تفصیلات اجمالی طور پر یہاں پیش کی جاتی ہیں، ممکن ہے کہ یہ آپ کی سمجھ میں آجائیں اور آپ کو اپنی ان باطنی ربانی قوتوں کا علم ہو جائے جن سے آپ اب تک بے خبر تھے، ان کے استعمال سے آپ خود کیف و سرور حاصل کریں اور دوسروں کی بھی راحت و آسائش کا باعث بن جائیں۔

زیں شہد یک انگشت بکام دلبت   از لذت اگر محو نہ گردی قسمت کن

ایک نامعلوم خطۂ زمین میں ایک مکتشف مصروفِ تحقیق ہے اور یکایک راستہ بھٹک جاتا ہے، اب وہ پختہ کار خوب جانتا ہے کہ اس حالت میں اس کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ وہ حواس باختہ نہ ہو جائے، اس کے اوسان جاتے نہ رہیں، ہستی گم نہ ہو جائے! اس کو خوب معلوم ہے کہ اگر خوف کے مارے اب اس کی عقل جاتی رہے تو پھر اس کو کبھی راستہ نہیں ملتا اور وہ ہمیشہ کے لیے ہلاک ہو جاتا ہے، اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر اس نے اس وقت اپنے قلب کو سنبھال لیا، اس کو خوف و ہراس سے آزاد رکھا، پُرسکون، دل جمع اور مطمئن رہا تو ممکن ہے کہ اس کو راستہ مل جائے اور وہ ہلاکت سے بچ جائے۔

بالکل یہی حال تمام مصائب اور مشکلات کا ہے، سب سے پہلے ہمیں اپنے قلب کو خوف

پریشانی سے بچانا چاہیے، جب ہم پر بلاؤں کا نزول ہوتا ہے، درد اور غم کے بادل اُمنڈ آتے ہیں تو سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی معیت کا احساس کر کے اپنے دل کو خوف سے محفوظ کرلیں، خوف دور ہوا اور ہم نے ذاتی نفع و ضرر کے خیال سے بلند ہو کر اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا کہ "حق تعالیٰ کے ہوتے ہوئے مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں" اور تاباں کے الفاظ میں دنیا کے اچھے اور بُرے کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کر دیا کہ:-

دنیا کے نیک و بد سے کچھ تاباں نہیں ہے مجھ کو غم
گر یوں ہوا تو کیا ہوا اور ووں ہوا تو کیا ہوا

تو اب حالات میں تغیر ہو جاتا ہے، اور حیرتناک طریقے سے ہمیں تمام بلاؤں سے نجات مل جاتی ہے اور وَمَن یَتَّقِ اللہَ یَجْعَل لَّہٗ مِنْ اَمْرِہٖ یُسْرًا کا وعدہ پورا ہو جاتا ہے، اسی طرح ہم اپنے محبوب کی خواہ وہ ہم سے قریب ہو یا دور ہو، اس کے بارے میں پریشان اور خوف زدہ ہو کر مدد نہیں کر سکتے، خوف و پریشانی سے بجائے اس کی مصیبت کم ہونے کے اور زیادہ ہو جاتی ہے، کیونکہ ہم اپنی مسموم ذہنی فضا سے اس کو بھی متاثر کرتے اور اس کے خوف و پریشانی میں اضافہ کر دیتے ہیں، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہمیں اس کی طرف سے بے پرواہ ہو جانا چاہیے اور اس کا خدا مالک ہے کہہ کر بے فکر بن جائیں، وہ درد و تکلیف میں مبتلا ہے اور ہمیں اس کی مدد کرنی ضروری ہے، وہ ہم سے کوسوں دور ہے اور جسمانی خدمت کا ہمیں کوئی موقع حاصل نہیں، اس کی خدمت کا روحانی طریقہ ہی اختیار کیا جا سکتا ہے اور وہ دعا اور تفویض ہے، ہم اس کے لیے اس طرح دعا کر سکتے ہیں کہ گویا وہ خود اپنے لیے دعا کر رہا ہے اور معیت و نصرتِ حق کا اس طرح ادراک کر سکتے ہیں کہ گویا وہ خود اس کا ادراک کر رہا ہے۔

اس طریقہ کے استعمال میں سب سے زیادہ اسی شخص کو کامیابی حاصل ہوتی ہے جو متقی اور پرہیزگار ہے، توحید کے میدان کا مرد ہے، امتثالِ امورِ الٰہیہ میں اپنی زندگی بسر کر رہا ہے، نواہی سے مجتنب ہے اور فسق و فجور سے تائب، اس کی دعا میں بلا کا اثر ہوتا ہے اور حق تعالیٰ

نے اسی کے متعلق تو فرمایا ہے کہ میں "اس کا ہاتھ، آنکھ، کان، پاؤں ہو جاتا ہوں کُنتُ سَمعَهُ الَّذِی یَسمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِی یُبصِرُ بِهٖ وَیَدَهُ الَّتِی یَبطِشُ بِهَا وَرِجلَهُ الَّتِی یَمشِی بِهَا (الحدیث رواہ البخاری)

بہر حال پہلی چیز یہ ہے کہ ہم خود اپنے خوفزدہ اور پریشان قلب کو سکون و جمعیت عطا کریں اور اس کے انتشار و پریشانی کو رفع کریں۔ جب ہمیں اپنے محبوب کے متعلق بُری خبر پہنچے تو ہمیں چاہیے کہ فوراً بغوائے فَفِرُّوا اِلَی اللّٰہِ حق تعالیٰ کی طرف گریز کریں کیونکہ تمام چیزوں کا اختیار ان ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہی پناہ دیتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا۔ "قُل مَن بِیَدِهٖ مَلَکُوتُ کُلِّ شَیءٍ وَّهُوَ یُجِیرُ وَلَا یُجَارُ عَلَیهِ اِن کُنتُم تَعلَمُونَ (پ ۵۶) تمام اہل اللہ کو اس امر کا تجربہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی مصیبت کو ابتداً حق تعالیٰ کے سامنے پیش کرتا ہے اور خلق کو اس کی اطلاع نہیں دیتا تو بہت جلد نصرتِ الٰہی اس کو دور کر دیتی ہے اور اس کے قلب کو سکون اور طمانیت عطا کرتی ہے۔

یہ شاید ابتداء میں ہمارے لیے آسان نہیں۔ جب ہم پر کوئی مصیبت وارد ہوتی ہے تو ہمارے قلب کے تار ٹوٹنے لگتے ہیں، ہماری نبضیں چھوٹنے لگتی ہیں، ہمارے خیالات میں بلا کا انتشار اور تشتت پیدا ہو جاتا ہے، خوف سے ہماری زبان سوکھنے لگتی ہے، ہماری آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے!

یاد رکھو یہی وقت ہے رجوع الی اللہ کا، یہی وقت ہے قلب کو ظلمت سے نکال کر نور کی طرف رجوع کرنے کا، سلبی و تخریبی خیالات سے اس کو چھڑا کر ایجابی تصور کی طرف مائل کرنے کا، اور حق تعالیٰ سے زیادہ کس کا خیال نورانی اور ایجابی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے وقت ان پاکیزہ الفاظ کو دہرانے کی تاکید فرمائی ہے:۔

لا الٰہ الا اللہ العلی العظیم لا الٰہ الا اللہ رب العرش العظیم۔ لا الٰہ الا اللہ رب السموات و رب العرش الکریم۔[1]

[1] نوٹ صفحہ ۳۲۳ پر دیکھئے۔

تم چاہو تو ان الفاظ کی تکرار کر سکتے ہو جو تمہارے کرب کو رفع کرنے میں اکسیر کا حکم رکھتے ہیں: اللہ اللہ ربی لا اشرک بہ شیئاً[1] یا پھر یہ الفاظ دہرائے جا سکتے ہیں: یاحی یاقیوم برحمتک استغیث۔[2]

یہاں یہ نفسیاتی اصول یاد رکھنا چاہیے کہ خوف و غم کا مقابلہ ان کی سطح پر رہ کر نہیں کیا جا سکتا، اس سطح میں ان کی قوت ناقابل مدافعت ہوتی ہے، ہمیں ان سے نجات پانے کے لیے اس سطح سے بلند ہو جانے کی ضرورت ہے۔ جب ہم حق تعالیٰ کی ذات کی طرف توجہ کرتے ہیں، ان کے اسماء و صفات کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارا قلب خوف کی سطح سے بلند ہو کر اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں شر کا گزر نہیں، جہاں سوائے ذات کے سرور و سکون کے کوئی اور چیز نہیں اور ہمیں ذات کے اس سرور میں کافی حصہ مل جاتا ہے ؎

قطرۂ نوری سراپا نور باش بگزر از غم دائماً مسرور باش (رومی)

ادعیۂ ماثورہ کی تکرار کے ساتھ تمہیں حق تعالیٰ کی معیت و احاطت کا ادراک بھی واضح طور پر کرنا چاہیے۔ حق تعالیٰ نے تمہیں اپنی معیت کا یقین دلایا ہے۔ ھو معکم اینما کنتم۔ جہاں کہیں تم ہو حق تعالیٰ تمہارے ساتھ ہیں، وہ تم پر محیط ہیں، ہر شے پر محیط ہیں، کوئی شے ان کے احاطہ سے خارج نہیں، وکان اللہ بکل شئ محیطا (پ ۵ ع ۱۱) الا انہ بکل شئ محیط (پ ۲۵ ع ۱۶) حق تعالیٰ ہر جا حاضر و موجود ہیں، تم اپنا منہ جدھر پھیرو وہیں ذات حق موجود ہے۔ فاینما تولوا فثم وجہ اللہ۔

آنکھیں جو ہوں تو عین ہے مقصود ہر جگہ بالذات ہے جہاں میں وہ موجود ہر جگہ

(نوٹ صفحہ ۳۲۳) [1] رواہ بخاری و مسلم و ابو عوانہ و نسائی و الترمذی و ابن ماجہ وغیرہم ابن عوانہ نے ثنا اور زیادہ کیا کہ پھر اس کے بعد دعا کرے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] رواہ ابو داؤد و النسائی و ابن حبان طبرانی نے تین بار ان کا کہنا زیادہ کیا ہے واخرجہ ابن ماجہ ایضاً حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اپنے اہل بیت کو جمع کر کے فرمایا کہ تم میں جب کسی کو غم یا کرب پہنچے تو کہے۔ اللہ اللہ الخ [2] ابن مسعود فرماتے ہیں کہ حضرت صلعم کو جب کوئی غم ہوتا تو یہ الفاظ دہراتے۔

حق تعالیٰ خود ہم سے بہت قریب ہیں، اقرب ہیں، ہرگز بعید نہیں، دور نہیں! وہ اس کا ہمیں پورا یقین دلا رہے ہیں نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ یعنی ہم رگِ جان سے زیادہ قریب ہیں ہمیں اپنے سے دور کیوں سمجھ رکھا ہے! اپنے جہل کو دور کر اور ہم سے قریب ہو جا!

خوابِ جہل از حرمِ قرب مرا دور فگند ورنہ نزدیک تر از دوست کسے ہیچ ندید

حق تعالیٰ کے ان ارشادات پر یقین و ایمان رکھ کر خوف و غم، کرب و رنج کے وقت ہمیں اپنے نفس کو یقین دلانا چاہیے کہ۔

حق تعالیٰ اس جگہ حاضر و موجود ہیں الا انہ بکل شیٔ محیط

حق تعالیٰ قطعاً میرے ساتھ ہیں ھو معکم اینما کنتم

حق تعالیٰ قطعاً میرے قریب ہیں۔ ان ربی قریب مجیب

حق تعالیٰ قطعاً ہر جہت میں موجود ہیں فاینما تولوا فثم وجہ اللہ

تواب

حضورِ حق رحمت ہے، حضورِ حق مسرت ہے حضورِ حق امن و طمانیت ہے۔

اس مراقبہ و تدبر سے حق کا ادراک انفس و آفاق میں قائم ہونے لگتا ہے اور ادراکِ حق کے قیام کے ساتھ خوف و حزن، ہم و غم، کرب و الم سب غائب ہو جاتے ہیں کیونکہ قلب ان کی سطح سے بہت بلند ہو جاتا ہے اور سکون و مسرت و امن و طمانیت کی لہریں اندر سے اُٹھنے لگتی ہیں حق کو اپنے ساتھ پا کر وہ ان میں مشغول ہو جاتا ہے اور ان سے راضی اور جب وہ حق سے راضی ہو جاتا ہے تو حق تعالیٰ بھی اس سے راضی ہو جاتے ہیں۔ رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ۔

اس طرح جب ہم نے اپنے خوف و حزن کو دور کر لیا اور حق تعالیٰ کی یافت و شہود کی بدولت قطرۂ نور بن گئے، ذاتِ الٰہی کے سرور سے لطف اندوز ہونے لگے تو ہم اب اپنے دور افتادہ مہجور محبوب کی دعا کے ذریعہ مدد کر سکتے ہیں، ذرا احتیاط کے ساتھ اس طریقہ پر غور کرو۔

ہمیں اس کی جانب سے یافت قائم کرنا ہے، اگر اس کی جان خطرہ میں ہے، اگر وہ بلاؤں میں گرفتار ہے تو جب ہم اس کا خیال کریں گے تو ہمارے قلب میں وہی تاریکی پیدا ہو گی جس میں وہ گھرا ہوا ہے۔ جب ہم نے اپنی تاریکی یافت حق کی وجہ سے دور کر لی تو اب ہمیں اس کی تاریکی اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے اور جس طرح اپنی تاریکی رفع کی تھی بالکل اسی طرح اس کے خیال سے پیدا ہونے والی تاریکی کو بھی دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، یہ تو صاف ظاہر ہے کہ دوست کے غم سے ہمیں غم ہوتا ہے اس کی بے چینی ہمیں بے چین کرتی ہے۔ جب اس کے خطرے یا ضرر کا خیال قلب میں پیدا ہوا کہ قلب کی کیفیت بدلنے لگی اور اسی کیفیت کو حزن وخوف وکرب سے تعبیر کیا جاتا ہے، قلب کی کیفیت کو جب تم نے حق تعالیٰ کے اسماء وصفات کے تذکرے سے حق تعالیٰ کی ذات کی یافت سے ان کے حضور ومعیت واحاطت وقرب اقربیت کے ادراک فی الانفس والآفاق سے دور کر لیا کہ تمہارے محبوب کا خوف وحزن خود اس کے قلب سے ہٹ گیا اور چین وسکون کی کیفیت کا ظہور ہونے لگا۔

اپنے دور افتادہ محبوب کی مدد کرنے کا روحانی طریقہ بس یہی ہے کہ پہلے اس کے غم ومصیبت کے بوجھ کو اپنے کاندھوں پر اُٹھانا چاہیے اور اس کا درد اپنے قلب میں پیدا کرنا چاہیے اور پھر حق تعالیٰ کے ذکر اور ان کی یافت کے ذریعہ امن وطمانیت اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے اور اس طرح یہ بوجھ خود بخود اُٹھ جاتا ہے اور اس کو بلا ومصیبت سے نجات مل جاتی ہے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز!

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے محبوب کو حق تعالیٰ کو تفویض کر دینا چاہیے۔ ہمیں اس کی صورت کو ذہن میں مستحضر کر کے حق تعالیٰ سے یوں معروضہ کرنا چاہیے، حق تعالیٰ میں نے ان کو آپ کے سپرد کیا، تفویض کیا انہیں نور اور نورانی کر دیجیے عافیت وامن عطا فرمائیے ان کی ضروریات کی تکمیل کیجیے، ربنا علیک توکلنا، حسبنا اللہ ونعم الوکیل، نعم المولیٰ

ونعم النصیر۔

ہمیں اس امر کا بھی شدت کے ساتھ استحضار کرنا چاہیے کہ حق تعالیٰ ہماری اور ان کی زندگی کے ہر واقعہ کا بذات خود تعین فرما رہے ہیں اور بشانِ رحمت تعین فرما رہے ہیں۔

اس استحضار ہی سے امر واقعہ کا تحقق ہوتا ہے ہمارے لیے اور ان کے لیے بھی انا عند ظن عبدی بی سے اس کی تائید ہوتی ہے، حالات میں آسانی اور سہولت پیدا ہونے لگتی ہے حق تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن تقویٰ ہے اور متقی کی مراد حق تعالیٰ قطعاً پوری کرتے ہیں ؎

می دہد یزداں مرادِ متقین! (رومی)

ومن یتق اللہ یجعل لہ من امرہ یسرا سے اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے اور من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا اس پر مزید روشنی ڈالتا ہے۔

امداد کے اس روحانی طریقے کے متعلق یہ بات واضح طور پر یاد رکھنی چاہیے کہ کشفِ ضر حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا، مخلوق میں نہ اس کی قوت ہے اور نہ طاقت لاقوۃ الا باللہ حق تعالیٰ ہی فاعل ہیں اور مخلوق محض آلات، موثر حقیقی صرف حق تعالیٰ ہی ہیں، باقی اوہام و خیالات! وان یمسسک اللہ بضر فلا کاشف لہ الا ھو وان یردک بخیر فلا راد لفضلہ یصیب بہ من یشاء من عبادہ وھو الغفور الرحیم (پ ۱۲۶)

یعنی اگر تم کو حق تعالیٰ کوئی تکلیف پہنچائیں تو بجز ان کے اور کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں ہے اور اگر وہ تم کو کوئی راحت پہنچانا چاہیں تو ان کے فضل کا کوئی ہٹانے والا نہیں، وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہیں مبذول فرمائیں اور وہ بڑی مغفرت اور بڑی رحمت والے ہیں" جامی نے اسی عقیدہ کے تحت فرمایا ہے:۔

حق فاعل و ہر چہ جز حق آلات بود — تاثیر ز آلت از محالات بود

ہستی کہ موثرِ حقیقی ست یکیست — باقی ہمہ اوہام و خیالات بود

جب ہم اپنے قلب میں اپنے محبوب کا درد لے کر مواجہ حق میں آجاتے ہیں تو حق ہی کے

نور سے ہمارا اور ہمارے محبوب کا درد رفع ہو جاتا ہے، فاعل و موثر قطعاً حق تعالیٰ ہی ہوتے ہیں اور ہم محض وہ آلات جن کے ذریعہ ان کا فیضِ کرم جاری ہوتا ہے۔

اے سرِ تو در سینۂ ہر صاحب راز   پیوستہ درِ رحمتِ تو بر ہمہ باز
ہر کس کہ بدرگاہ تو آید بنیاز   محروم ز درگاہ تو کے گردد باز

اسرارِ حج

حج زیارت کردن خانہ بود حج رب البیت مردانہ بود (رومی)

صوفیائے کرام نے ہمیشہ مذہب کے ظاہری رسوم سے زیادہ زور اس کی باطنی روح پر دیا ہے۔ دینِ محمدی کی بھی دو حیثیتیں ہیں: ظاہری و باطنی!

"نیکی و طاعت کے ظاہری اعمال سے قلب پر جو اچھے اثرات مترتب ہوتے ہیں ان کے احوال و کوائف کی تحصیل دین کی باطنی حیثیت یا تصوف کا مقصود اور نصب العین ہے۔"[1]

قرآنی تعلیمات سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اصل چیز ظاہری رسوم نہیں بلکہ باطنی روح ہے۔ دیکھو قربانی کے سلسلہ میں حق تعالیٰ نے وضاحت فرمادی ہے کہ:

"نہ قربانی کا گوشت حق تعالیٰ کے پاس پہنچتا ہے اور نہ خون، بلکہ تقویٰ یا پارسائی"[2]

یعنی حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی محض قربانی کر دینے یا خون بہا دینے سے نہیں حاصل ہوتی جب تک کہ اس قربانی کا مدار حق تعالیٰ کی محبت، ان کی رضا جوئی، اور ان کی قرب طلبی نہ ہو۔ اسی طرح دوسری جگہ واضح فرمایا گیا ہے کہ:-

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ	نیکی اس کا نام نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو کر لو یا
الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ	مغرب کو، بلکہ نیکی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان
اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرۃ ع ۶)	و یقین سے حاصل ہوتی ہے۔

یعنی محض کسی سمت کو قبلہ بنا کر اس کی طرف منہ پھیر لینے سے انسان کے اندر نیکی نہیں پیدا ہو سکتی

---

[1] شاہ ولی اللہ "ہمعات" [2] لن ینال اللہ لحومها ولا دماؤها ولکن ینالہ التقوی منکم۔

جب تک کہ اس کی بنیاد اللہ اور آخرت کے یقین و ایمان پر نہ ہو!

لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ بھول نہ جانا چاہیے کہ قرآنی تعلیمات اور اسلامی تصوف کی رو سے دنیا میں جس طرح انسانی روح بغیر انسانی جسم کے نہیں پائی جاتی اور اس کے روحانی افعال کا اعتبار بغیر جسمانی افعال کے نہیں ہوتا، اسی طرح دنیا میں خاص خاص افعال یا جسمانی حرکات اور احوال کے بغیر روح کا ارتقا اور اس کی تکمیل نہیں ہو سکتی، اسی لیے صوفیائے کرام نے باطن کے ساتھ ظاہر کی حفاظت پر پورا زور دیا ہے اور متقدمین صوفیاء نے تصوف کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ "وہ نام ہے تعمیر ظاہر و باطن کا" بالفاظِ دیگر دونوں کی اصلاح و درستی ضروری ہے، نہ ظاہر بغیر باطن کے اور نہ باطن بغیر ظاہر کے درست ہو سکتا ہے۔ ظاہر عنوان ہے باطن کا، جب کسی کے ظاہری افعال شرع محمدی کے خلاف ہوں تو اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا کہ اس کا باطن موافق و مطیع ہوگا، ظاہر تو تابع ہوتا ہے باطن کا، کیسے ہو سکتا ہے کہ باطن درست ہو اور اس کا اثر ظاہر پر نہ پڑے، یہ ناممکن ہے۔ اسی طرح ظاہری افعال کا اثر باطن پر پڑتا ہے بلکہ ہر ظاہری عمل باطن کو متاثر کرتا ہے۔ ولیم جیمس جیسے ماہرِ نفسیات نے تو اس حد تک زور دیا ہے کہ "اگر تم باطن میں کوئی کیفیت یا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہو تو اس کی ظاہری صورت پیدا کرلو تمہارا باطن متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا"۔ جیمس لینگ نظریہ کی تفصیلات سے آج کل جامعات کے طالب علم بخوبی واقف ہیں۔

حج کے تمام اعمال پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مومن جس کا طرۂ امتیاز حق تعالیٰ کی شدید محبت ہے (الذین اٰمنوا اشد حبًا للہ) اپنے عشق و محبت کے جذبہ کو جو اس کے قلب کی گہرائیوں میں نہاں ہے ظاہری اعمال و اشکال میں ہویدا کرتا ہے تاکہ

"اس کے اس حال کا چرچا دنیا میں پھیلے، وہ بلند آواز سے لبیک کہتے ہوئے نعرے لگاتا ہے اور ان نعروں سے محبت کی چھپی دبی آگ کو بھڑکاتا ہے!"

چنانچہ شاہ عبدالعزیزؒ اپنی تفسیر میں ابراہیم خلیل علیہ السلام کے حج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"باز ایشاں را حکم شد کہ در ہر سال یک بار خود را والہ و شیدا ساختہ دیوانہ وار و عاشق کردار برائے گرد گشتن خانۂ محبوب خود برہنہ سر و برہنہ تن و برہنہ پا، ژولیدہ مو، پریشان حال و گرد آلودہ از شام بر زمین حجاز رسیدہ گاہے بر کوہ و گاہے بر زمین رو بہ سوئے خانہ کردہ استادہ شوند... گرد خانہ تجلی آشیانہ او طواف کنند و بار بار کنجہائے آں را بہ بوسند و بلیسند"ے

(پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ سال میں ایک دفعہ اپنے کو سرگشتہ و شیدا بنا کر دیوانوں کی طرح اور عشق بازوں کا وطیرہ اختیار کر کے محبوب کے گھر کے گرد ننگے سر ننگے پاؤں، الجھے ہوئے بال، پریشان حالی کے ساتھ گرد میں اٹے ہوئے سرزمین حجاز میں پہنچیں، اور وہاں پہنچ کر کبھی پہاڑ پر کبھی زمین پر محبوب کے اسی گھر کی طرف رُخ کر کے کھڑے ہوں ...... اسی تجلی خانہ کے ارد گرد گھومیں اور اس کے گوشوں کو چومیں، چاٹیں)

حج کے مناسک سے عشق و محبت کا یہی جذبہ ظاہر ہوتا ہے اور اسی بنیاد پر طوافِ کعبہ، صفا و مروہ کے درمیان سعی، مزدلفہ کی آمد و رفت، عرفات میں قیام، منیٰ میں ذبح و قربانی، و تلبیہ و احرام وغیرہ کا حکم دیا گیا ہے۔

اعمالِ حج کے ان ہی باطنی اسرار کو ہم یہاں امام الصوفیہ حجۃ الاسلام حضرت غزالیؒ کے اشارات کی روشنی میں پیش کر رہے ہیں: ؎

زیں شہد یک انگشت بسانم بلبت — از لذت اگر محو نگردی تف کن!

حق تعالیٰ کے گھر کی زیارت کا شوقِ عاشق کے قلب میں بھڑک اُٹھتا ہے! جس قلب میں اس "شاہ خوباں" کا عشق نہیں وہ مردہ ہے، یا یوں کہیے: ؎

دل کہ فارغ شد ز عشقِ آں نگار
سنگِ استنجائے شیطانش شمار!

ے حج نمبر الفرقان بابت ماہ رمضان و شوال ۱۳۶۵ھ مقالہ مولانا گیلانی صفحہ ۱۰۔

عاشق کی نگاہ میں اب دنیا کی ساری لذتیں ہیچ نظر آنے لگتی ہیں۔ مال و دولت، جاہ و عزت دوست و احباب اپنی دلفریبیاں کھو دیتے ہیں! "زندے" کا عشق اس کو مردوں کی محبت سے بیزار کر دیتا ہے اور وہ چیخ اٹھتا ہے:-

عشق با مردہ نباشد پائیدار — عشق را با حیٔ جاں افزائے دار!
عشقِ زندہ در روان و در بصر — ہر دمے باشد ز غنچہ تازہ تر!
عشق آں زندہ گزیں کو باقیست — وز شراب جاں فزایت ساقیست
عشق آں بگزیں کہ جملہ انبیاء — یافتند از عشقِ او کار و کیا!
غرقِ عشق شو کہ غرق است اندریں — عشقہائے اولین و آخریں! (رومی)

اہل و عیال، دوست و احباب سے رخصت ہو کر جب وہ سوار ہوتا ہے تو اس کی نظر میں دارِ آخرت کی سواری آجاتی ہے، وہ اپنے جنازے کو آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے جس پر سوار ہو کر اس کو ایک روز آخرت کی طرف کوچ کرنا ہوگا اور وہ جانتا ہے کہ یہ دن کچھ زیادہ دور تو نہیں ہو سکتا۔ ع کیں عمر بیک چشم زدن نقش بر آب است!

جب وہ احرام کے لیے چادر خریدتا ہے تو اس کو وہ دن یاد آتا ہے جب اس کا تنِ بے جان کفن میں لپیٹا جائیگا اور وہ بے حس و حرکت پڑا ہوگا؛ اب اس کا ساتھ دینے والے نہ دوست احباب ہونگے اور نہ اہل و عیال صرف ایمان و عمل صالح ہی اس کے ساتھ جائینگے! وہ اپنے نفس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:-

يَا مَنْ بِدُنْيَاهُ اشْتَغَلَ — قَدْ غَرَّكَ طُوْلُ الْأَمَلِ
اَلْمَوْتُ يَأْتِيْ بَغْتَةً — وَالْقَبْرُ صُنْدُوْقُ الْعَمَلِ (حضرت علی)

سوچتا ہے کہ احرام کی چادر تو خانہ کعبہ کے قریب پہنچ کر باندھنی پڑیگی، ممکن ہے کہ یہ سفر پورا نہ ہو سکے اور راہ ہی میں موت آجائے لیکن حق تعالیٰ سے ملاقات تو کفن میں لپٹے ہوئے ہی ہوگی! کفن کی اس چادر پر نظر کر کے شکستہ دل کے ساتھ حق تعالیٰ سے عرض کرتا ہے:-

اَللّٰھُمَّ اغْسِلْ خَطَایَایَ بِمَآءِ الثَّلْجِ وَ	اے اللہ میرے گناہوں کو برف اور اولے کے پانی
الْبَرَدِ وَنَقِّ قَلْبِیْ مِنَ الْخَطَایَا کَمَا یُنَقَّی	سے دھوئے اور میرے دل کو گناہوں سے ایسا
الثَّوْبُ الْاَبْیَضُ مِنَ الدَّنَسِ وَبَاعِدْ	پاک کر دے جیسا کہ سفید کپڑا میل سے پاک کیا جاتا
بَیْنِیْ وَبَیْنَ خَطَایَایَ کَمَا بَاعَدْتَ بَیْنَ	ہے اور مجھ میں اور میرے گناہوں کے درمیان ایسا
الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (بخاری عن عائشہ)	فاصلہ کر دے جیسا کہ مشرق و مغرب میں تو نے

جب اپنے شہر سے باہر نکل آتا ہے تو سوچتا ہے کہ اس نے اپنے اہل و عیال اور وطن سے جُدا ہو کر ایسا سفر اختیار کیا ہے جو کسی طرح دنیا کے اور سفروں کے بالکل مشابہ نہیں! اس سفر سے اس کا مقصود حق تعالیٰ ہیں، ان کے گھر کی زیارت ہے، ان کی رضا و خوشنودی ہے، حق تعالیٰ ہی کی پکار پر، ان ہی کی توفیق سے، ان ہی کے شوق دلانے سے، ان ہی کے حکم پر وہ قطع علائق و ترک خلائق کر کے ان کے دربار کی طرف دیوانہ وار چل پڑا ہے، اس کی زبان پر ہے:-

بسم اللہ، ماشاء اللہ، حسبی اللہ، لا قوۃ الا باللہ، اللھم الیک خرجت و انت اخرجتنی!

من کہ باشم کہ بر آں خاطرِ عاطر گذرم　　لطفہا می کنی اے خاکِ درت تاجِ سرم (حافظ)

اس کو حق تعالیٰ سے پوری اُمید ہوتی ہے کہ وہ اس سفرِ شوق میں اس کے ساتھ ہونگے اس کے نگہبان اور مددگار ہونگے، وہ حق تعالیٰ ہی کی دستگیری و رہبری سے اپنی منتہائے آرزو کو پائیگا، اپنے مولیٰ کے دیدار سے اپنی مراد کو پائیگا! ؎

من ایں دستے کہ افشاندم ز کونین　　بداماںِ تمنائے تو باشد! (حزین)

سوچتا ہے کہ اگر وہ منزلِ مقصود کو پہنچنے بھی نہ پایا اور راستہ ہی میں طعمۂ اجل مسمّٰی ہو گیا، پھر بھی وہ "نثارِ رہِ یار" ہوگا! کیا حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے:

وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَی	جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہوا کہ
اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ یُدْرِكْهُ الْمَوْتُ	اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کرونگا، پھر اس کو موت

فَقَد وَقَعَ اَجرُہٗ عَلَی اللہِ" آپڑے تب بھی اس کا ثواب ثابت ہو گیا اللہ تعالیٰ کے ذمہ!

ہاں، اس راہ میں موت بھی اچھی! کہہ سکیگا! ؎

حاصلِ عمر نثارِ رہ یارے کردم! شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

اسی فکر و ذکر، اسی ولولہ و جنون میں وہ میقات پر پہنچ جاتا ہے، کپڑے اُتارتا ہے اور احرام کی چادریں باندھتا اور اوڑھتا ہے، ماسوا سے آزاد ہو کر چیخ اٹھتا ہے:

لبیک اللّٰھم لبیک لاشریک لک لبیک!

آنکھوں سے اس کے آنسو جاری ہو جاتے ہیں، دل سے سرد آہیں نکلتی ہیں، اور زبان سے یہ چیخ:-

ماراز خاک کویت پیراہن است بر تن! آنہم ز آب دیدہ صد چاک تا بدامن (جمالی)

جانتا ہے کہ لبیک کی یہ پکار حق تعالیٰ کی اس پکار کے جواب میں ہے کہ:-

وَاَذِّن فِی النَّاسِ بِالحَجِّ (پ ۱۷ع ۳۶) اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو

اور اس کا خیال عرصۂ قیامت کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے کہ جب صور پھونکا جائیگا اور لوگ اسی طرح پکارے جائینگے اور وہ اپنی قبروں سے نکل کر میدانِ قیامت میں جمع ہونگے اور حق تعالیٰ کی پکار کا جواب دینگے پھر ان میں سے بعض مقبول ہونگے اور بعض مردود! ابتدا میں تردد ہر ایک کو ہوگا، خوف و رجا ہر ایک کے سینہ میں ہوگی! دل ہی دل میں حق تعالیٰ سے کہتا ہے کہ

کارے بجز گناہ نداریم یا حفیظ! عذرے بغیر آہ نداریم یا حفیظ!

ہر چند روسیاہ و گنہگار و مجرمیم جز رحمت پناہ نداریم یا حفیظ! (مجذوب)

توبہ و استغفار، تسبیح و تہلیل، ندامت و شوق، رجا و خوف میں اس کی ہر ساعت بسر ہوتی ہے، دل میں حسرتوں کا ہجوم ہوتا ہے اور وہ راہ کی صعوبتیں برداشت کیے بڑھتا جاتا ہے! کبھی کہتا ہے۔

اللہ! کس قدر رہِ مقصود دُور ہے پیکِ خیال راہ میں تھک تھک کے رہ گیا

جدہ کا قیام، ساتھیوں کی پریشانی اس کو متاثر نہیں کرتی، وہ تو "محوِ خیال یار" ہے:-

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل پڑے یہ مری جبینِ نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

انتظار کی ساعتیں گزرتی جاتی ہیں اور وہ بیتابی میں گنگناتا جاتا ہے :-

نظر ہے وقفِ غمِ انتظار کیا کہنا   کھنچی ہے سامنے تصویرِ یار کیا کہنا (جگر مراد آبادی)

اب قافلہ مکہ معظمہ میں داخل ہو رہا ہے! "حرم مامون" میں پہنچ رہا ہے، "مَن دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا" کی نوید اس کے کانوں میں گونجتی ہے۔ بلد امین میں داخل ہو کر وہ چیخ اٹھتا ہے :-

ذرۂ خاکم و در کوئے تو ام وقت خوش است   ترسم اے دوست کہ بادے زبرد ناگاہم! (حافظ)

آگے بڑھ کر جب اس کی نظر بیت اللہ پر پڑتی ہے تو رب البیت کی تجلی سے اس کے ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں ؎

آمد خبرے ز آمد او   من بعد خبر نماند مارا!

وہ "بیت" کو نہیں، گویا "رب البیت" کو دیکھ رہا ہے!

آنکھوں میں رُخِ یار ہے، آنکھیں ہیں رُخِ یار پر
ذرّے ہیں آفتاب میں، ذرّے میں آفتاب ہے!

اسی ذوق و شوق کو لیے ہوئے وہ طواف کے لیے بڑھتا ہے، اس کے قلب میں تعظیم، خوف و رجا، عشق و محبت کے جذبات موجزن ہوتے ہیں، اس کا جسم خانۂ کعبہ کے طواف میں مصروف ہوتا ہے لیکن اس کی روح رب البیت کے گرد گھومتی ہے، اس کا دل حضرتِ ربوبیت کا طواف کرتا ہے، ان پر فدا ہوتا ہے، نثار ہوتا ہے، چپکتا ہے، ؎

یک جان چہ متاعیست کہ سازیم فدایت
اما چہ تواں کرد کہ موجود ہمیں است!

جب حجر اسود کو بوسہ دیتا ہے تو جانتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے ہاتھ پر بیعت کر رہا ہے۔ اطاعت و فرمانبرداری، عہدیت و عبودیت کا اقرار کر رہا ہے، حجر اسود "یمین اللہ عز وجل فی الارض" ہے، حق تعالیٰ کا داہنا ہاتھ ہے زمین پر، "یصافح بہا خلقہ کما یصافح الرجل اخاہ"[1] جس سے وہ

[1] مسلم بروایت عبداللہ بن عمرؓ۔

اپنے بندوں کے ساتھ مصافحہ کرتے ہیں! وہ حق تعالیٰ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر عرض کرتا ہے:ــ

یارب منم و دست تہی چشم پُر آب — جاں دادہ و دل سوختہ و سینہ کباب

نامہ سیہ و عمر تبہ، کار خراب — از روئے کرم بفضل خویشم دریاب

پھر کعبۃ اللہ کے پردہ کو پکڑتا ہے یہ سمجھ کر کہ حق تعالیٰ کے دامن کو پکڑ رہا ہے اور ملتزم سے چمٹتا ہی یہ سمجھ کر کہ حق تعالیٰ سے قریب ہو رہا ہے، رو رو کر عرض کرتا ہے:ــ

تو کریم مطلق و من گدا چہ کنی جزاینکہ نخوانیم — در دیگرے بنما کہ من بہ کجا روم چو برانیم

ہمہ عمر بر تو رو دیدہ ام بخجالم کنوں کہ خمیدہ ام — من اگر بحلقہ خمیدہ ام تو بحلِ دو دشانیم (بیدل)

آپ کا دامن چھوڑ کر کہاں جاؤں، کس کے آگے ہاتھ پھیلاؤں، کس کے قدم پکڑ لوں؟ میری پناہ گاہ آپ ہیں، میرا ملجا و ماویٰ آپ کے سوا کون ہے؟ آپ کے کرم و عفو کے سوا میرا ٹھکانا نہیں! آپ کا دامن نہ چھوڑونگا جب تک کہ آپ اپنی رحمت سے میری سیہ کاریوں کو معاف نہ فرمائیں، اور آئندہ دامنِ امن میں پرورش نہ فرمائیں؛ حق تعالیٰ آپ کریم ہیں، درِ کریم پر عجز و نیاز کے ساتھ آیا ہوں، دیدۂ اشکبار کے ساتھ آیا ہوں، دردِ دل، نالۂ جاں آزار کے ساتھ آیا ہوں، اگر آپ دامنِ عفو میں پناہ نہ دیں تو کہاں جاؤں، کیا کروں!ــ

یارب دلم از بارِ گنہ محزون است — جاں زار و دل افگار و جگر پُر خون است

ہر چند گناہِ من ز حد بیروں است — عفوت ز گناہِ من بسے افزوں است (درد)

صفا و مروہ کے درمیان جب وہ سعی کرتا ہے تو یہ احساس قلب میں لیے ہوئے کہ ایک فقیر، مسکین، حقیر و ذلیل غلام اپنے آقا، مالک، بادشاہ کے محل کے صحن میں بار بار چکر لگا رہا ہے، نظرِ کرم کا ملتجی ہے، زبان پر سوال ہے کہ:

"رب اغفر وارحم وتجاوز عما تعلم انک انت الاعز الاکرم"

بار بار گھومتا ہے اور آواز لگاتا ہے کہ:

عبیدک بفنائک! مسکینک بفنائک! فقیرک بفنائک! سائلک بفنائک! انت

کریم رحیم ارحمنی واغفرلی یا رحیم یاکریم یا غفور!

جانتا ہے کہ کوئی سائل اس در سے محروم نہیں جاتا، یہ کریم کا دروازہ ہے، اس کو جو کھٹکھٹاتا ہے وہ اپنی مراد کو پاتا ہے :-

گفت پیغمبر کہ چوں کوبی درے — عاقبت زاں در بروں آید سرے

سایۂ حق بر سرِ بندہ بود — عاقبت جویندہ یابندہ بود

چوں نشینی بر سرِ کوئے کسے — عاقبت بینی تو ہم روئے کسے

چوں ز چاہے میکنی ہر روز خاک — عاقبت اندر رسی در آب پاک

عرفات کے میدان میں جب وہ قدم رکھتا ہے اور لوگوں کا ازدحام اور آوازوں کا بلند ہونا اور زبانوں کا اختلاف جب اس کو نظر آتا ہے تو اس کو میدانِ قیامت کا منظر یاد آتا ہے کہ اس روز بھی ہر امت اپنے نبی کے ساتھ اسی طرح جمع ہوگی اور اس کی پیروی کریگی اور اس کی شفاعت کی اُمید کریگی، اب وہ اضطرار کے ساتھ حق تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتا ہے اور چیختا ہے!

یا من لا یشغلہ شانٌ عن شانٍ ولا سمعٌ عن سمعٍ ولا تشتبہ علیہ الاصوات یا من لا تغلطہ المسائل ولا تختلف علیہ اللغات! یا من لا یبرمہ الحاح الملحین و لا تضجرہ مسئلۃ السائلین! اذقنا برد عفوک وحلاوۃ رحمتک!	اے وہ ذاتِ مطلق کہ جس کو ایک حال دوسرے حال سے نہیں روکتا اور نہ ایک عرض کا سُننا دوسرے عرض کے سننے سے باز رکھتا ہے، اور نہ مشتبہ ہوتی ہیں اس پر آوازیں! اے وہ ذاتِ مطلق کہ جس کو بہت سے سوال مغالطہ میں نہیں ڈال سکتے اور نہ مختلف ہیں اس کے نزدیک بہت سی زبانیں! اے وہ ذات پاک جس کو ہٹ کرنے والوں کا اصرار تھکا نہیں دیتا اور مانگنے والوں کا سوال تنگ نہیں کرتا ہم کو اپنے عفو کی ٹھنڈک اور رحمت کی حلاوت سے آشنا کر! (دعائے خضر علیہ السلام)

پھر رو رو کر کہتا ہے :-

الٰہی! انت انت وانا انا، انا العواد الی الذنوب وانت العواد الی المغفرۃ! الٰہی ان کنت لا ترحم الا اہل طاعتک فالٰی من یفزع المذنبون!

حق تعالیٰ آپ آپ ہیں اور میں میں ہوں! میں گناہوں کی طرف بار بار پلٹتا ہوں اور آپ مغفرت کی طرف بار بار رجوع کرتے ہیں! حق تعالیٰ اگر آپ اپنے طاعت والوں ہی پر رحم کریں، تو گنہگار کس طرف ملتجی ہوں؟

الٰہی تجنبت عن طاعتک عمداً وتوجہت الی معصیتک قصداً فسبحانک ما اعظم حجتک علیّ وما اکرم عفوک عنی فبوجوب حجتک علیّ وانقطاع حجتی عنک وفقری الیک وغناک عنی الا غفرت لی! یا خیر من دعاہ داعٍ وافضل من رجاہ راجٍ بحرمۃ الاسلام وبذمۃ محمد علیہ السلام اتوسل الیک فاغفر لی جمیع ذنوبی واصرفنی عن موقفی ھذا مقضی الحوائج وھب لی ما سألت وحقق رجائی فیما تمنیت!

حق تعالیٰ میں آپ کی اطاعت سے قصداً علیحدہ رہا، آپ کی نافرمانی پر دانستہ متوجہ ہوا، آپ پاک ہیں آپ کی حجت مجھ پر کتنی بڑی ہو اور آپ کا مجھے معاف کرنا کتنا بڑا کرم ہے پس جس صورت میں کہ آپ کی حجت مجھ پر ضروری ہوئی، میری حجت آپ کے ہاں جاتی رہی، میں آپ کا محتاج ہوں اور آپ مجھ سے بے پروا و بے نیاز، آپ مجھے معاف ہی فرما دیجیے! اے ان سے بہتر ذات جن کو جن کو کوئی دعا مانگنے والا پکارے، اور افضل ان سے جن سے کوئی توقع رکھنے والا! اسلام کی حرمت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ کا وسیلہ تیرے سامنے پیش کرتا ہوں، میرے سارے گناہ بخش دیجیے اور مجھے اس موقف سے حاجتیں پوری کرکے لوٹائیے اور جو کچھ میں نے مانگا مجھے دلا دیجیے اور جس چیز کی میں نے تمنا کی اس میں میری توقع پوری کیجیے!

پھر چلا اٹھے درد بھرے دل سے!

الٰہی من مدح لک نفسہ فانی لائم نفسی! الٰہی اخرست المعاصی

الٰہی! جو تیرے سامنے اپنی تعریف کیا کرے میں تو اپنے نفس کو ملامت کرتا ہوں! الٰہی گناہوں نے میری زبان

لسانی فمالی وسیلۃ من عملی و	گونگی کردی، پس مجھ کو اپنے عمل کا وسیلہ نہ رہا اور نہ سوا
لا شفیع سوی الامل! الٰھی انی	اُمید کے اور کوئی سفارش کرنے والا! الٰہی مجھے معلوم
اعلم ان ذنوبی لم تبق لی عندک	ہے کہ میرے گناہوں نے تیرے نزدیک میری قدر
جاھا ولا للاعتذار وجھا لکنک	کچھ باقی نہ رکھی اور نہ عذر کرنے کی کوئی صورت
اکرم الاکرمین الٰھی ان لم اکن اھلا	چھوڑی لیکن تو تمام کریموں سے زیادہ کریم ہے! الٰہی
ان ابلغ رحمتک فان رحمتک	اگر میں اس قابل نہیں کہ تیری رحمت تک پہنچوں
اھل ان تبلغنی ورحمتک وسعت	تو تیری رحمت تو شایاں ہے کہ مجھ تک پہنچے! الٰہی
کل شیءٍ وانا شیءٌ! الٰھی ان ذنوبی	تیری رحمت ہر چیز کو شامل ہے اور میں بھی ایک چیز
وان کانت عظاماً ولکنھا صغارٌ	ہوں! الٰہی اگرچہ میرے گناہ بڑے ہیں لیکن تیرے
فی جنب عفوک، فاغفرھالی یاکریمؐ!	عفو کے مقابلہ میں چھوٹے ہیں! میرے گناہوں سے
	درگزر کر اے کریم!

جاننا ہو کہ یہ وہ مبارک مقام ہے جہاں حق تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور ان رحمتوں کو وہ قلوب جذب کرتے ہیں جو اس میدان میں موجود ہوتے ہیں، یہ ابدال و اوتاد کے قلوب ہیں، ان صالحین کے قلوب ہیں جو حق تعالیٰ کے آگے سربسجود ہیں، ان کے حضور میں دست بستہ ذلت و مسکنت کے ساتھ گڑگڑا رہے ہیں! رحمتِ الٰہی کے جذب کا اس سے زیادہ قوی و موثر کوئی طریقہ نہیں کہ:

"ان ابرار کی ہمتیں اکٹھی ہوں اور ایک وقت میں ایک زمین پر قلوب ایک دوسرے کی مدد کریں!"

اس بادراک کے ساتھ ہی اس کی زبان سے یہ چیخ نکلتی ہے:

غمناکم و از درِ تو باغم نروم | جز شاد و اُمید وار و خرم نروم

ؐ یہ سب دعائیں احیاء العلوم باب سوم سے کی گئی ہیں۔ فقیر جا۔

از درگہ ہمچو تو کریمے ہرگز نومید کسے نرفت و من ہم نروم (ابوسعید)

اسی لیے کہا گیا ہے کہ:

عرفات شریف کے میدان میں اگر یہ سمجھا کہ حق تعالیٰ نے میری مغفرت نہیں کی، سب سے بڑا گناہ ہے"

رحمت اینجا کہ کند وسعتِ خود را ظاہر
ہر کہ تقصیر نہ کرد است گنہ گار تر است!

رمیِ جمار[۱] کے موقع پر احرام باندھتے وقت کے اپنے اس قول کو یاد کرتا ہے کہ:

لبیک لحجۃٍ حقاً تعبّداً و رقّاً[۱]

اور محض اپنی غلامی و بندگی کے اظہار کے لیے امر کی اطاعت کا قصد کرتا ہے اور محض تعمیل ارشاد و امتثال امر الٰہی کے لیے رمی کرتا ہے، جانتا ہے کہ اس فعل میں نہ تو نفس کو کوئی حظ ہے اور نہ عقل کو اپنی عقل اور نفس کو حق تعالیٰ کے حکم پر قربان کرتا ہے، اور دیوانہ وار "اقامت ذکر اللہ"[۲] کے لیے شیطان پر کنکر مارتا ہے اور زبان سے کہتا جاتا ہے:

اللہ اکبر علیٰ طاعۃ الرحمٰن و رغم الشیطان تصدیقاً بکتابک واتباعاً لسنۃ نبیک۔

جب قربانی[۲] کرتا ہے تو جانتا ہے کہ حق تعالیٰ کے حکم پر وہ اپنی بھی جان قربانی کے جانور کی طرح فدا کرنے کو تیار ہو گا بلکہ عاشق کی زندگی تو "ہر زمان مردنی" ہے وہ اپنی جان کو ہر دم فدا کرتا رہتا ہے:

اے حیاتِ عاشقاں در مردگی دل نیابی جز کہ در دل بردگی
ما بہا و خوں بہا را یافتیم جانبِ جاں باختن بشتافتیم

[۱] میں حاضر ہوں حج کے واسطے حقیقت میں بندگی اور غلامی کی راہ سے (دار قطنی در علل بروایت حضرت انس رض)

[۲] انما جعل الطواف بالبیت والسعی بین الصفا والمروۃ ورمی جمار لاقامۃ ذکر اللہ لا لغیرہ یعنی طواف کعبہ ... سعی درمیان صفا و مروہ اور کنکریوں کا پھینکنا ذکر اللہ کے قائم رکھنے کے واسطے مقرر کیا گیا ہے (ابو داؤد و ترمذی بروایت ...)

عاشقاں را ہر زمانے مردنیست — مردنِ عشاق خود یک نوع نیست

او دو صد جاں دارد از نورِ ہدیٰ — واں دو صد رامی کند ہر دم فدا

ہر یکے جاں را ستاند دہ بہا — از نبی خواں عشرۃ امثالہا[1] (رومی)

غرض حج کے اعمال میں دل کا وظیفہ یہ ہے جس کا اجمالاً اوپر ذکر ہوا، قلب کی یاد کے ساتھ حج کے اعمال وہی ادا کرتا ہے جس کے دل پر حق تعالیٰ کی محبت و غلامی کا داغ ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جس غلام کو خود بادشاہ خریدتا ہے اس کا مرتبہ سوا ہوتا ہے۔

داغِ غلامیت کرد پایۂ خسرو بلند

صدر ولایت شود بندہ کہ سلطاں خرید

زیارتِ مدینہ

"زیارتِ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اوکد مستحبات و افضل قربات سے ہے اور صاحبِ قدرت کے لیے قریب واجب کے ہے!"[2]

خوش آنکہ بندم در رہت بر ناقہ محمل از وطن!

خیزم چو گرد، افتم چو اشک، آیم بسر، غلطم بہ تن (وحدی)

مدینہ رسول ﷺ کی راہ میں درود کے شغل سے بہتر کوئی شغل نہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ من صلی علی واحدۃً صلی اللہ علیہ عشراً (مسلم)

اس راستہ کو درود و سلام کے ورد ہی میں ختم کرنا چاہیے، حُبِّ نبوی کا تقاضا یہی ہے ؎

من مذہبی حب النبیؐ وصحبہ

وللناس فیما یعشقون مذاہب

[1] دہ مانند آں، اشارہ آیۂ من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالہا (سورۃ الانعام)

[2] مولانا صدیق حسن مرحوم، در الشمامۃ العنبریہ من مولد خیر البریہ ص ۱۲۰

جب مدینہ منورہ کی دیواروں پر نظر پڑتی ہے تو عاشق کے ذہن میں خیال آتا ہے کہ یہ وہ مبارک شہر ہے جس کو حق تعالیٰ نے اپنے محبوبؐ کے لیے پسند فرمایا ہے، اور اس کو ان کا دار الہجرۃ بنایا ہے یہ وہ مقامِ مقدس ہے جہاں آپؐ نے حق تعالیٰ کے فرائض وسنن مشروع فرمائے، اعدائے دین سے جہاد کیا اور حق تعالیٰ کے دین کو ظاہر کیا، اسی پاک زمین میں آپؐ نے اپنی زندگی بسر فرمائی، یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے آپ کو اپنے جوارِ رحمت میں بلا لیا اور آپ کی قبرِ مطہر اس میں مقرر فرمائی، اور آپؐ کے دو وزیر جو آپؐ کے احکام کی بجا آوری میں کامل تھے آپؐ ہی کے پہلو میں آرام فرما رہے ہیں! اس خیال کے آتے ہی وہ فرطِ مسرت سے چیخ اٹھتا ہے:

من و یثرب کہ بہ از نور بود خاک انجا! | باشد از مہر مبین سایۂ افلاک آنجا!
شرفے خاکِ رہش راست کہ تا بودنِ آب | از تیمم شود اعضائے وضو پاک آنجا!
بحرِ رحمت شود آں قطرہ کہ از مے ریزد | چوں کند تابِ سفر جبہۂ عرقناک آنجا!
صاحبش راست جنابے کہ ز بس تعظیمش | بال جبریل بروبد خس و خاشاک آنجا!

(مولوی احسان اللہ ممتاز)

جب عاشقِ رسولؐ مدینہ منورہ کی پاک زمین پر قدم رکھتا ہے تو اس کی زبان سے بے اختیار نکلتا ہے:

اندر دو جہاں کعبۂ ما کوئے محمدؐ
محراب دل و جاں خمِ ابروئے محمدؐ

وہ دیوانہ عالم حق تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے

اللہ! ایسے جذبِ محبت کو کیا کروں!
رگ رگ کو جس نے درد بھرا دل بنا دیا

ہر قدم پر وہ یہ سوچتا ہے کہ اس مقام پر آقائے نامدارؐ کے قدم پڑے ہونگے، قدم اٹھاتا ہے پھر ٹھہر جاتا ہے، بڑھتا ہی، پھر تھم جاتا ہے

ترے کوچے میں ہم کل اس طرح سے جا بجا ٹھہرے
چلے، چل کر تھمے، تھم کر بڑھے، بڑھ کر ذرا ٹھہرے

اس گلی کے ہر ذرّے کو وہ اپنا دل سمجھتا ہے۔ ؎

ہم اس کوچے کے ہر ذرّے کو اپنا دل سمجھتے ہیں!

تجلیات جب اس کو آگے قدم بڑھانے نہیں دیتیں، تو وہ چیختا ہے ؎

پایم بہ پیش از سرِ ایں کو نمی رود
یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہِ کیست (نظیری)

اسی محبت کی تجلی میں وہ دیکھتا ہے کہ: ؎

کوچۂ جاناں کا ہر ذرّہ چراغِ طور ہے!

اپنے محبوبؐ کا وہ خیال کرتا ہے، حق تعالیٰ نے اپنی معرفت کس درجہ آپ کو عطا فرمائی تھی! آپؐ کے ذکر کو کس درجہ بلند فرمایا تھا کہ اپنے ذکر کے ساتھ اس کو ملا دیا تھا، ورفعنا لک ذکرک کی نوید سے آپ کو سرفراز فرمایا تھا! آپؐ کی تعظیم کے ترک کرنے پر کیسی وعید فرمائی تھی، گو آپؐ کی آواز پر اپنی آواز ہی کے بلند کرنے سے وہ ترکِ تعظیم کیوں نہ ہو! حبطِ اعمال اس کی سزا تھی! پھر نظامیؒ کے الفاظ میں وہ اس طرح ثنا خواں ہوتا ہے ؎

شمسہ نہ مسندِ ہفت اختراں | ختم رسل خاتمِ پیغمبراںؐ!
احمدِ مرسل کہ خرد خاکِ اوست | ہر دو جہاں بستۂ فتراکِ اوست
اُمّی گویا بہ زبانِ فصیح | از الفِ آدمؑ و میمِ مسیحؑ
اے تنِ تو پاک تر از جانِ پاک | روحِ تو پروردۂ روحی فداک
اے مدنی برقع و مکّی نقاب | سایہ نشیں چند بود آفتاب
اے گوہرِ تاجِ فرستادگان | تاج دہِ گوہرِ آزادگاں

پھر وہ خیال کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان نیک بختوں پر کتنا بڑا احسان فرمایا، جنہوں نے

آپؐ کی صحبت پائی، اور مشاہدۂ جمال، استماعِ اقوال وملاحظۂ احوال سے سعادت حاصل کی، اور اپنے حال پر آنسو بہاتا ہے کہ یہ دولتِ سرمدی مجھے نصیب نہ ہوئی، اور نہ آپؐ کے اصحابِ کرامؓ کی صحبت ملی! دنیا میں تو آپ کو نہ دیکھا، آخرت میں بھی شاید آپؐ کی زیارت نگاہِ حسرت ہی سے ہو اور اعمالِ بد کے باعث آپؐ ہمیں قبول نہ فرمائیں کیونکہ آپ کا ارشادِ مبارک ہے کہ:

"قیامت کے روز کچھ لوگوں کو فرشتے دوزخ کی طرف لے جائیں گے جن میں اپنی امت کی بعض نشانیاں دیکھ کر میں حق تعالیٰ سے عرض کرونگا، حق تعالیٰ یہ میرے لوگ ہیں! حکم ہوگا کہ نہیں، تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے بعد انہوں نے کیا کام کیے ہیں! تب میں کہونگا کہ مجھ سے دور ہو! مجھ سے دور ہو!" (رواہ الشیخان)

یہ حال اُن لوگوں کا ہوگا جنہوں نے شریعت مطہرہ کی توقیر نہیں کی، سنتِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قدر نہ سمجھی، اور بدعت کو ترجیح دی! اب وہ اپنی حالت پر نظر ڈالتا ہے، اس وعید سے کانپ اٹھتا ہے، اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہے، چیختا ہے ؎

هر چند گناه بے شمار است | صد مرتبہ بے شمار توبہ
در بارگہت کنم خدایا | با دیدۂ اشکبار توبہ
گر رفت بہ ترہات عمرم | کردم نہ بیک دو بار توبہ
شہ ہر سر مو کنوں زبانے | آرم بتو بار بار توبہ (داغ اعلیٰ)

پھر عرقِ خجالت میں غرق ہوکر حق تعالیٰ سے التماس کرتا ہے:-

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر | روز محشر عذر ہائے من پذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر | از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر! (اقبال)

پھر اُمید و رجا کی موج اس کے سینے میں اُٹھتی ہے، وہ اس امر کا احساس کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ایمان کی دولت سے اس کو سرفراز فرمایا، اپنے محبوبؐ کی زیارت کے لیے وطن سے نکال کر اس مقدس مقام پر پہنچایا، حظِّ دنیا یا تجارت اس سفر سے اس کا مقصود

نہ تھا، فقط آپؐ کی بے پایاں محبت اور آپ کے آثار کے دیکھنے کے شوق ہی نے اس کو وطن مالوف سے نکالا، زندگی میں جب آپؐ کا دیدار نصیب نہ ہوا تو اس نے اس پر ہی قناعت کی کہ آپؐ کی مسجد مبارک میں حاضر ہو کر آپؐ کی قبر اطہر کی دیوار پر ہی نظر ڈالے۔

غریبے گر روی بشہر دیار — روی در مسجد مصفا کن

دوست را گر نمی توانی دید — خانۂ دوست را تماشا کن

جب حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ سامان مہیا کر دیے تو اب اس کی رحمت سے یہی توقع ہے کہ وہ اس کی طرف نظرِ رحمت سے دیکھینگے، اور اس کے گناہوں کو معاف فرمائینگے۔ ؎

اندر علم آنچہ ترا شاید نیست

اندر کرمت آنچہ مرا باید ہست

جب مسجد نبوی میں قدم اٹھتا ہے تو یہ سوچتا ہے کہ یہ وہ مقدس جگہ ہے جس کو حق تعالیٰ نے اپنے نبیِ اکرم اور مسلمانوں میں سے اول اور افضل لوگوں کے لیے تجویز فرمایا، جو بقول عارف رومیؒ ؎

برترند از عرش و کرسی و خلا

ساکنانِ مقعدِ صدقِ خدا

اور جو حق تعالیٰ کی نظر میں "محبوب و مطلوب و پسند" رہے ہیں۔

جانتا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں سب سے پہلے حق تعالیٰ کے فرائض ادا ہوئے، اور کامل عبودیت کے ساتھ ادا ہوئے! یہی وہ زمین ہے جس میں تمام مخلوق سے افضل و برتر لوگ حالتِ حیات و حالتِ ممات میں جمع ہیں! اب وہ توقع کرتا ہے کہ حق تعالیٰ اس پر بھی رحم فرمائینگے، اور دل ہی دل میں عرض کرتا ہے:

بضاعت نیاوردم الا امید

خدایا ز عفوم مکن نا امید

پھر مسجد مبارک میں خشوع و تعظیم سے داخل ہوتا ہی، زبان پر یہ دعا ہوتی ہے:۔

اللّٰھم ھٰذا حرم رسولك فاجعلہ لی وقایۃ من النار وامانا من العذاب وسوء الحساب اللّٰھم افتح لی ابواب رحمتك وارزقنی من زیارۃ نبیك مارزقت اولیائك واھل طاعتك واغفرلی وارحمنی یاخیر مسئول۔

پھر نیتِ اعتکاف الی الخروج کرکے روضۂ جنت کی طرف بڑھتا ہے اور محرابِ نبویؐ کے پاس، ممکن ہو تو مصلّیٰ نبویؐ یا اُس سے متصل یا منبر کے پاس، اور نہ ہوسکے تو کسی ایک مقام پر تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں ادا کرتا ہے، پھر اس نعمتِ عظمیٰ کے حصول پر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے، اور رضا، توفیق خیر، قبولِ اعمال و بلوغ مقاصد کی دعا کرتا ہے! دعا کے الفاظ یہ ہوتے ہیں:

اللّٰھم ان ھٰذہ روضۃ من ریاض الجنۃ شرفتھا وکرمتھا ومجدتھا وعظمتھا ونورتھا بنور نبیك وحبیبك محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم اللّٰھم کما بلغتنا فی الدنیا زیارتہ ومآثرہ الشریفۃ فلا تحرمنا یا اللّٰہ فی الاٰخرۃ من فضل شفاعۃ محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم واحشرنا فی زمرتہ وتحت لوائہ وامتنا علی محبتہ وملتہ واسقنا من حوضہ المورود بیدہ الشریفۃ شربۃ ھنیۃ لانظماء بعدھا ابدا انك علی کل شیء قدیرا۔

پھر زیارت کی نیت سے نہایت ادب و خشوع کے ساتھ روضۂ پاک کے سامنے حاضر ہوتا ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ حضور انور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس کے آنے، کھڑے ہونے، اور زیارت کرنے کا علم ہوتا ہے، اور اس کا درود و سلام آپؐ کی خدمتِ مبارک میں پہنچتا ہے۔[1] آپؐ نے فرمایا کہ:

من صلی علیّ واحدۃ صلی اللّٰہ علیہ عشرا (مسلم)

یہ جزا تو صرف زبان سے درود پڑھنے کی ہے، جب وہ خود زیارت کے لیے تمام بدن سے

---

[1] یہ اس حدیث سے ثابت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "جو لوگ میری قبر پر آکر سلام کریں گے میں اس کا سلام خود سنوں گا اور دور سے سلام کرنے والوں کا سلام مجھے پہنچایا جائیگا" (مشکوٰۃ)

حاضر ہوا ہے تو اس کا بدلہ کس قدر عظیم الشان ہوگا!

اب وہ اپنے آقائے نامدار (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے:

الصلوٰۃ والسلام علیك ایها النبی السید الکریم والرسول العظیم والحبیب الرؤف الرحیم ورحمة الله وبرکاته، الصلوٰۃ والسلام علیك یا محمد بن عبد الله بن عبد المطلب ابن هاشم یا طٰهٰ یا یٰسٓ یا بشیر یا سراج یا مبین یا مقدم جیش الانبیاء والمرسلین ؎

یا خیر من دفنت فی التراب اعظمه — فطاب من طیبهن القاع والاکم

نفسی الفداء لقبر انت ساکنه — فیه العفاف وفیه الجود والکرم

انت الحبیب الذی ترجی شفاعته — عند الصراط اذا ما زلت القدم

پھر صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے۔

پھر حضورؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے منبر شریف کے پاس حاضر ہوتا ہے اور تصور کرتا ہے کہ گویا آپؐ منبر پر چڑھے کھڑے ہیں اور مہاجرین و انصار آپؐ کے گرد حلقہ کیے ہوئے ہیں اور آپ ان کو خطبے میں حق تعالیٰ کی اطاعت کی ترغیب و ہمت دلا رہے ہیں اور نافرمانی سے روک رہے ہیں اور ڈرا رہے ہیں ؎

محمدؐ شہنشاہِ خیلِ رسل — کہ خرد ند پیشش چہ جزو چہ کل

درخشاں دُرِ درجِ عبدِ مناف — بانگشتِ اعجاز مہ را شگاف

زابروش محرابِ عین الیقین — زگیسوش اسباب حبل المتین

فلک ہا ز دریاش در شبنمے — فصیحاں زغوغاش در لب کمے

چناں عقدہ از کارِ امت کشاد — کہ دنداں دریں کار برباد داد! (ظہوری)

دل میں توحید پر جینے مرنے کا پختہ عزم کرتا ہے، حضورؐ کی محبت کو قلب میں اور زیادہ راسخ کرتا ہے، اور آپؐ کی سنتِ مطہرہ پر ساری عمر عمل کا پورا ارادہ کرتا ہے، اس عقیدے کو پختہ کرتا ہے کہ

حق تعالیٰ ہر حال میں اس کے نگراں ہیں ـــ "الم یعلم بان اللہ یریٰ" ـــ اس کے دل کے دسوسوں اور خفیہ خطرات وخیالات کو دیکھتے اور جانتے ہیں تاکہ سب کاموں میں ادب کا لحاظ رکھے جیسے کہ کوئی شخص کسی بادشاہ کی نظروں کے سامنے ہے، ہر وقت گردن جھکائے، اور ہر کام میں ادب!

اس یقین کو بھی دل میں مضبوط کرتا ہے کہ:

"فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ"

یعنی طاعات کو ثواب سے ایسی نسبت ہے کہ جیسے غذا کو پیٹ بھرنے سے اور گناہوں کو عذاب سے وہ تعلق ہے جو زہر کو ہلاکت سے!

عزم کرتا ہے کہ اپنے تمام حرکات وسکنات، خطرات ولحظات، لفظات وفلتات، غدرات و فجرات پر ہمیشہ نظر رکھیگا، اور تقویٰ کے اختیار کرنے میں اور ہر برائی سے اجتناب کرنے میں مبالغہ سے کام لیگا۔ بحول اللہ وقوتہٖ

آخر میں اس تسکین بخش عقیدے کو بھی پختہ کرتا ہے کہ رزق کی کفالت خود حق تعالیٰ نے فرمائی ہے، یہ کہہ کر کہ :۔

"ما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا"

یہ رزق مضمون ضرور ملیگا، جتنا مقدر ہے وہ قطعاً پہنچ کر رہیگا، طلب رزق بطور شرعی کرنا چاہیے اور جو چیز فوت ہو جائے اس پر افسوس نہ کرنا چاہیے۔

لکیلا تاسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اٰتاکم!

منبر شریف کے پاس پہنچ کر تصور کرتا ہے کہ یہاں ہی تیقنات پر حضور انور (صلی اللہ علیہ وسلم) زور دے رہے ہیں اور وہ انہیں اپنے قلب میں اتار رہا ہے، اور اپنے تحت شعوری نفس میں انہیں پختہ کر رہا ہے۔

حج وزیارت کے اعمال میں یہ ہے دل کا وظیفہ، جس کے اجمال کا ذکر ہوا۔ اس طرح فارغ ہو کر حاجی فرطِ مسرت سے چیخ اٹھتا ہے ؎

نازم بچشمِ خود کہ جمالِ تو دیدہ است
افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ہر دم ہزار بوسہ زنم دستِ خویش را
کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است